

توہی تو کالم



قرۃ العین خرم ہاشمی

پاکستانی پوائنٹ ڈاٹ کام

مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں۔

www.pakistanipoint.com

تو ہی تو کا عالم

قرۃ العین خرم ہاشمی



مزید کتب پڑھنے کے لئے آج ہی وزٹ کریں۔

www.pakistanipoint.com

تہ پایا تہ کا عالم

کتابی شکل: پاکستانی پوائنٹ کمپوزنگ ٹیم



پاکستانی پوائنٹ کوئی تجارتی ویب سائٹ نہیں ہے یہاں پر موجود ناولز بالکل مفت ہیں۔ اس مشن کا مقصد صرف اردو ادب کی خدمت کرنا ہے تاکہ جو لوگ وطن سے دور ہیں اور اردو کتب حاصل نہیں کر سکتے، وہ یہاں سے ڈاؤنلوڈ کر لیں۔ اگر آپ اردو لکھنا جانتے ہیں تو آپ بھی روز کا ایک صفحہ کمپوز کر کے اس مشن کا حصہ بن سکتے ہیں۔ مزید معلومات کے لئے، سپر موڈز: صبا گل، تلی، ٹیم لیڈر: ایم وائے صائم، میمنجنت: حبیب یاد قار سے رابطہ کریں، شکریہ



پیش لفظ

ایک محبت!...

محبت جس نے اپنے لیے ہمیشہ عام چہروں سے لے کر، بہت خاص چہروں کو چنا ہے۔ ہر بار محبت کا انتخاب لاجواب رہا مگر اس بار محبت نے جس کا انتخاب کیا عام سوچ و نظر میں وہ محبت کے لیے پیدا ہی نہیں ہوا ہے۔

ایک ایسی ہی محبت کی داستان جو کسی مرد یا عورت کے ملن یا جدائی سے تخلیق نہیں ہوئی بلکہ یہ کہانی ہے محبت کے اُس رنگ کی جسے کسی دور میں معاشرے نے کبھی ہی قبول نہیں کیا۔

محبت کا امرت کسی ایک رنگ، کسی ایک نسل یا کسی ایک جنس کے لیے مخصوص نہیں ہے۔

محبت زرخیز زمین سے پیدا ہونے کے لیے نہیں بنی بلکہ محبت کا وصف یہ ہے کہ وہ بنجر زمین کو بھی زرخیز بنا دیتی ہے۔

کبھی کبھی محبت اس جنس کے خمیر سے بھی اٹھتی اور سانس لیتی ہے جسے خواجہ سرا سمجھ کر ہمیشہ کمتر سمجھا اور مانا گیا ہے۔

ایک ایسی ہی کہانی کہ جب کوئی اپنی محرومی کے احساس سے لڑتے لڑتے زندگی گزارتے اچانک جس نقطے پر ٹھہرا، وہ محبت کا تھا۔

ایک عورت کی محبت کو پانے کی تمنا اور خواہش کی راہ میں اس کی محرومی اور کمی اس کی راہ میں رکاوٹ بن کر سامنے آکھڑی ہوئی تھی۔ محبت میں صرف جدائی ملتی تو شاید وہ برادشت کر لیتا مگر اُسے حقارت اور تحقیر ملی تو وہ اپنے حواس کھونے لگا۔ وہ جسم کے خام سے رب کی پہچان کر رہا تھا۔ اسی لیے اس سے بدگمان ہو کر اس سے دور ہوتا گیا مگر وہ یہ نہیں جانتا تھا کہ جسموں کا خام صرف دنیا کے ترازو میں وزنی ہوتا ہے۔

ایک محبت...

جو اٹھتی تو جسموں کے خام سے ہے، مگر جاوداں زندگی اسے عشق کے جام سے ملتی ہے۔

ایک محبت...

جو صرف اپنی ذات سے، اُس کی ذات تک لے جانے کے لیے راستے میں آئی تھی۔

ہر محبت ایک ایسا نقطہ ہے جو دنیا اور خلا میں رابطہ قائم کر دیتا ہے۔ جب انسان اپنی محبت سے گزر کر اس نقطے کو کراس کرتا ہے، تو اُس کے سامنے میلوں دور دور تک خلا پھیلا ہوتا ہے، نظر اور دل کو چیرتا سناٹا ہوتا ہے۔

مگر پھر بھی وہ وجود عشق کا جام پیے، مست قدموں سے چلتا، رقص کرتا، جگہ جگہ اپنے جنوں کی مہر ثبت کرتا، عشق کی منزلیں طے کرنے لگتا ہے۔ عام نظر کے لیے وہ خلا ہے جہاں کچھ بھی نہیں سوائے خاموشی اور سناٹے کے مگر عشق کے دیوانے جانتے ہیں کہ وہاں قدم قدم پر یار کے جلوے بکھرے ہوئے ہیں۔ اسی لیے کبھی جبین خاک پر سجدہ کرتی اور کبھی پتھر کو چومتی ہے۔

اور وہ وحدہ لا شریک ہر ذرے میں جلوہ افروز ہوتا ہے۔

دیکھنے والی نظر اُس کا جلوہ ہر ذرے میں دیکھتی ہے۔

جسے دنیا خلا اور سناٹے کا جہاں یا عالم کہتی ہے۔

وہ اس کے لیے صرف ”تُو ہی تُو کا عالم“ ہوتا ہے۔

یہی وہ منزل ہے جس کی طلب اجسام کو نہیں، روح کو ہوتی ہے۔

اور روح جسم کے لباس سے پاک اور الگ ہوتی ہے۔

پھر چاہے وہ روح کسی مرد کی ہو یا کسی عورت کی یا پھر خواجہ سرا کی...

مرکزی خیال

اس نے کُن کہا، تو مٹی سے جسم کا خمیر اٹھا۔

وہ کُن کہے گا، تو مٹی کو اس کی امانت لوٹا دی جائے گی۔

مٹی، مٹی میں مل جائے گی۔

اس لیے کہ جسم خام ہے۔

جسم کے لبادے میں روح ایک مقرر وقت کے لیے پھونکی گئی ہے۔

حکم آئے گا اور روح اپنے اصل کی طرف لوٹ جائے گی۔

اس لیے کہ روح خالص ہے۔

اور اللہ ہر خالص چیز کو پسند کرتا ہے، محبوب رکھتا ہے۔

”بے شک اللہ جسموں سے نہیں، روح سے محبت کرتا ہے۔“

☆...☆...☆

گہری رات کے آخری پہر اماوس کی تاریکی کو چیرتی، درد کی انتہاؤں سے گزرتی اور اذیت کے آخری لمحوں میں جب اسے لگا کہ وہ ہمت ہار دے گی۔ اسی وقت اس کے کانوں میں بچے کے رونے کی آواز گونجی۔ اس کے وجود نے ایک اور وجود کو

رب کے حکم سے جنم دیا تھا۔ ماں بننے کا احساس اور رتبہ اس کے اندر کھوئی ہوئی توانائی واپس لانے لگا۔ اس نے آنکھیں کھول کر دیکھنا چاہا مگر اس کے آگے گہری دھند چھائی تھی۔ تھوڑی سی کوشش کے بعد وہ بہ مشکل بچے کے ہلتے ہاتھ پاؤں دیکھ سکی اور پھر پرسکون ہو کے گہری نیند سو گئی۔ وہ دل ہی دل میں مطمئن تھی کہ جب سو کر اٹھے گی تو بچہ اس کے پہلو میں ہو گا۔ نہ جانے کتنی دیر بعد اسے ہوش آیا۔ اس کے آس پاس خاموشی تھی۔ اس نے بے چین ہو کر اپنے پہلو پر نظر ڈالی اور اس کا دل دھک سے رہ گیا۔ وہ خالی تھا۔

اس نے کہنی کے بل اٹھنے کی کوشش کی مگر کمزوری کی وجہ سے کراہ کر رہ گئی۔ اسی وقت اماں رحیمہ نے کمرے میں قدم رکھا اور اسے جاگتے دیکھ کر فوراً اس کی طرف بڑھی۔

”بی بی سائیں! آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے؟“ اماں رحیمہ نے فکر مندی سے اس کے زرد چہرے اور کانپتے ہونٹوں کو دیکھا۔

”اماں رحیمہ، میرا بچہ کہاں ہے؟“ اس نے بے تاب سے پوچھا۔ اماں رحیمہ کا چہرہ ایک دم ہی زرد ہو گیا اور اس نے آگے بڑھ کر اس کی نم پیشانی سے پسینا صاف کیا اور دھیرے سے بولی۔

”بی بی سائیں! آپ کے ہاں مردہ بچے نے جنم لیا تھا۔ اب تک تو اس کی تدفین بھی ہو چکی ہوگی۔ آپ آرام سے لیٹ جائیں، اللہ بہت جلد آپ کی دوبارہ گود ہری کرے گا۔ میں آپ کے لیے گرم دودھ لاتی ہوں۔“

”نہیں... یہ نہیں ہو سکتا۔“ اس کے چہرے کا رنگ یک دم ہی مزید زرد پڑ گیا اور اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

”اماں رحیمہ، آپ جھوٹ بول رہی ہیں۔ میرا بچہ مردہ پیدا نہیں ہوا تھا۔ میں نے خود اس کے رونے کی آواز سنی اور غنودگی میں جانے سے پہلے اس کے ہاتھ پاؤں بھی ہلتے دیکھے تھے۔ آپ کیسے کہہ سکتی ہیں کہ وہ مردہ پیدا ہوا تھا؟ یہ جھوٹ کیوں اور کس لیے؟ کہاں ہے میرا بچہ؟ بولیں، نہیں تو میں کسی حد سے بھی گزر جانوں گی۔“ وہ پاگلوں کی طرح چیخ رہی تھی۔ اماں رحیمہ نے ایک نظر اس کے غصے سے لال ہوتے چہرے پر ڈالی۔ کمزوری کی وجہ سے اس کی سانس بھی پھول گئی تھی۔

”بی بی سائیں! میں اس حویلی کی پرانی ملازمہ ہوں۔ میری ہر سانس بھی آپ لوگوں پر قربان ہے۔ مجھے جو حکم ملا میں نے اسے پورا کیا ہے۔ آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ آپ آرام کریں۔“

”کس نے حکم دیا ہے تمہیں؟“ اس نے سخت لہجے میں پوچھا۔ اماں رحیمہ ایک دم ہی چپ کر گئیں اس سے پہلے کہ وہ کچھ بولتیں۔ کمرے میں کوئی داخل ہوا اور ایک ایک قدم مضبوطی سے جماتا، اس کے سر ہانے پہنچ کر بولا۔

”میں نے حکم دیا ہے نور بانو! کیا تمہیں ہمارے عمل پر بھی شک ہے؟“ اس کی سُرخ آنکھوں اور گھنی مونچھوں تلے پھڑپھڑاتے لب، اس کے اندورنی انتشار اور تکلیف کو ظاہر کر رہے تھے۔ اماں رحیمہ خان زادہ شمشیر کو دیکھ کر مؤدب انداز میں سر جھکاتی خاموشی سے کمرے سے باہر نکل گئی۔ جب کہ نور بانو پھٹی پھٹی نگاہوں سے اپنے محبوب شوہر کی طرف دیکھ رہی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ آنے والے اس بچے کا انتظار ان دونوں ہی کو بہت بے صبری سے تھا اور کیوں نہ ہوتا۔ آنے والا بچہ ان کی نسل در نسل چلی آرہی گدی کا وارث بننا تھا۔ پھر اب کیسے...؟

”میری محبت کو آپ پر کبھی شک نہیں ہو سکتا مگر ایک ماں کا بے چین دل یہ جاننے کے لیے تڑپ رہا ہے کہ آخر ایسا کیا ہوا ہے کہ میرے زندہ بچے کو مردہ قرار دے کر زمانے کی نظروں سے چھپایا جا رہا ہے۔ اتنا تو میں بھی جانتی ہوں کہ آپ لوگوں کا خاندان زمانہ جاہلیت کے لوگوں جیسا ہرگز نہیں ہے کہ جو بیٹیوں کی پیدائش پر انہیں، شرمندگی اور نفرت سے زندہ دفنا دیں۔ پھر ایسا کیا ہے جو میری

نظروں سے پوشیدہ ہے؟“ نور بانو نے بے قراری سے پوچھا۔ خان زادہ شمشیر نے اپنی نم آنکھوں کو سختی سے بند کیا اور کچھ لمحوں کے بعد کھولا، تو نور بانو ان کی آنکھوں میں دیکھتی، ایک دم ہی خوف زدہ ہو گئی۔

”نور بانو! آپ کی تسلی کے لیے صرف اتنا بتا دوں کہ میں چاہتے ہوئے بھی زمانہ جاہلیت کی رسم کو نہیں نبھاسکا کہ ایک جیتے جاگتے وجود کو مٹی کا حصہ بنا دوں مگر میرے میں اتنا حوصلہ اور برداشت بھی نہیں ہے کہ میں اپنے ساتھ کیے قدرت کے اس سنگین مذاق کو تمنے کی طرح اپنے سینے پر سجا کر، اپنی خاندانی گدی کا مذاق بنا لوں۔“

”گدی کا وارث نہ سہی مگر بیٹی بھی ہوتی تو وہ میرے دل کے قریب ہوتی مگر نہ جانے قدرت کو ہمارا امتحان لینا مقصود تھا جو ہمیں ”تیسری جنس“ (خواجہ سرا) سے آزمایا گیا ہے۔“ خان زادہ نے کہا، تو نور بانو کی چیخ نکل گئی اور وہ منہ پر ہاتھ رکھ کر نفی میں سر ہلانے لگی۔

”او میرے خدایا۔“ نور بانو دکھ کی شدت سے رونے لگی۔

”نور بانو! اس بات کو یہاں ہی دفن سمجھو اور بھول جاؤ کہ ہماری زندگی میں کبھی ایسا کوئی طوفان آیا تھا۔ یہ ہم خان زادوں کی عزت اور شان کے خلاف ہے۔“

اس نے سختی سے بات ختم کی، روتی بلکتی نور بانو پر ایک نظر ڈالی اور تیزی سے پلٹ کر کمرے سے باہر نکل گیا۔ پیچھے نور بانو ایسے بین کر رہی تھی جیسے سچ میں اس نے مردہ بچے کو جنم دیا ہو۔

شاید مردہ بچہ پیدا ہوتا، تو اُسے اتنی تکلیف نہ ہوتی جتنی اس وقت ہو رہی تھی۔ اسے قدرت کے اس سنگین مذاق اور اپنی خالی گود کا دکھ چیر رہا تھا۔ وہ سمجھ نہیں پا رہی تھی کہ اس کے یہ بہتے آنسو کس کے لیے ہیں۔ رب کی آزمائش میں پورے نہ اترنے کے لیے یا اپنی ممتا کی کمزوری پر جو ایسے بچے کو اپنانے سے ڈر کر کہیں دور جا چھپی تھی۔

☆...☆...☆

اس نے بار میں آکر اپنی مخصوص جگہ پر بیٹھتے ہوئے، وہسکی لانے کا آرڈر دیا۔ اسے دیکھ کر جولین باقی گاہکوں کو چھوڑتی فوراً اس کی طرف بڑھی۔ جولین کے سنہری بالوں کی کئی لٹیں بہت نفاست اور خوبصورتی سے کندھے اور چہرے کے اطراف میں بکھری ہوئیں تھیں۔ اس کا متناسب سراپا اور دلکش ادائیں وہاں موجود بہت سے گاہکوں کو اپنی طرف متوجہ کر لیتی تھیں مگر جولین اپنی خوبصورتی کو بہت سوچ سمجھ کر کیش کرواتی تھی۔

”ہیلو!“ جولین نے ٹرے میز پر رکھتے ہوئے دل کش انداز سے کہا۔ اپنے موبائل پر تیزی سے انگلیاں چلاتے ایڈم نے سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔ جولین کا خوشبو میں بسا سراپا دیکھ کر ایک ہلکی سی مسکراہٹ اس کے چہرے پر آگئی۔ اسے خوب صورت چہرے اور اچھی خوشبو فوراً اپنی طرف کھینچ لیتے تھے۔

”آج رات ایک پارٹی میں چلو گی میرے ساتھ؟“ ایڈم نے گلاس میں جام بھرتے ہوئے مصروف سے انداز میں پوچھا۔ جولین کا دل بلیوں اچھلنے لگا۔ ایڈم کے ساتھ رات گزارنے کا مطلب، ایک لگژری لائف اسٹائل کو بہت قریب سے دیکھنا اور محسوس کرنا تھا اور اس کے علاوہ ایڈم اپنی دولت خرچ کرنے کے معاملے میں بادشاہ تھا۔ دونوں ہاتھوں اور بند آنکھوں سے پیسہ اڑانے والا۔ بدلے میں اسے صرف جولین کا ساتھ اور وقت چاہیے ہوتا جس میں زیادہ تر وہ جولین کی مرضی اور پسند ہی سے اسے شاپنگ کرواتا اور پھر اچھے سے ڈنر کے بعد کبھی لیٹ نائٹ اچھی سی مووی دیکھتے یا پھر اسے ایسی ہی کسی پارٹی میں اپنے ساتھ لے جاتا جو صبح تک چلتی تھی اور صبح ہوتے ہی جولین اس خوب صورت خواب سے جاگ کر واپس اپنی در ماندہ اور پس ماندہ زندگی میں لوٹ آتی۔ ایڈم کے ساتھ ایک دن گزارنا، اس کے مہینے بھر کی کمائی کے برابر ہوتا تھا۔ جولین نے جلدی سے اثبات میں سر

ہلایا۔ ایڈم نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا جو خوشی سے جھومتی، مسکراتی واپس پلٹ گئی تھی۔

”کچھ دیر بعد ایڈم کی نئے ماڈل کی چمکتی گاڑی میں وہ بہت اترا کر بیٹھ رہی تھی کہ آج رات کی ملکہ صرف وہ تھی۔“

☆...☆...☆

”کٹ!“ شہرام نے بے زاری سے کہا تو آڈیشن دیتی لڑکی نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ اسے اپنی خوبصورتی اور ادائوں پر پورا پورا یقین تھا مگر اس وقت شہرام کے چہرے کے بگڑے زاویوں نے اس کے اعتماد کو شدید ٹھیس پہنچائی تھی، جب کہ دوسری طرف شہرام، اپنے اسٹنٹ پر برس رہا تھا۔

”مبشر میں نے کہا تھا کہ مجھے قدرتی حسن اور معصومیت سے بھرا چہرہ چاہیے۔ اس طرح کے بناوٹی حسن اور ادائوں کی ضرورت ہوتی تو اتنے مہینوں سے میں خوار نہ ہو رہا ہوتا۔ پتا نہیں تم لوگوں کو سمجھ کیوں نہیں آتی۔“

شہرام نے بے زار لہجے میں کہا۔ مبشر نے کن انکھیوں سے اپنے ساتھ کھڑے، کولیگ احمد کی طرف دیکھا۔ وہ بھی گہری سانس لیتے ہوئے کندھے اُچکاتا رہ گیا۔ جیسے اس کی سمجھ میں بھی یہ سب نہ آرہا ہو۔

”سر! پچھلے چھ مہینوں سے ہم تقریباً پورے ملک میں خوب صورت اور نئے چہروں کا آڈیشن لے چکے ہیں مگر کوئی لڑکی، آپ کے معیار کے مطابق نہیں مل رہی۔ اس طرح تو یہ پروجیکٹ کبھی مکمل نہیں ہوگا جس کے لیے آپ کب سے تیاریاں کر رہے ہیں۔“

مبشر نے باقی لوگوں کو بیک اپ کا اشارہ کرتے، شہرام کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ جو سر جھکا کر کسی گہری سوچ میں گم تھا۔ وہ اس کی بات پر چونکا اور پھر اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے بولا۔

”اگر مجھے میری پسند کے مطابق چہرہ نہیں ملے گا، تو یہ فلم بھی کبھی مکمل نہیں ہو گی۔ میں اپنے معیار پر کبھی کمپرومائز نہیں کرتا۔“ شہرام نے سنجیدگی سے کہا اور کار کی چابیاں اٹھا کر تیز تیز قدم اٹھاتا، آڈیٹوریم سے باہر نکل گیا۔

”کیا ہو؟ کیا شہرام سر کو میرا کام پسند نہیں آیا؟“

☆...☆...☆

ایڈم پچھلے ایک گھنٹے سے جم میں مختلف قسم کی ورزشیں کرنے میں مصروف تھا۔ جم کا کوچ ایڈم کا پرانا واقف کار اور دوست بھی تھا۔ یہ جم اس کے بار کلب کی پہلی منزل پر تھا۔ اسی بار کلب میں جولین ویٹرس کا کام کرتی تھی۔ ایڈم کی عمر بتیس سال

کے قریب تھی۔ اس کا امپورٹ ایکسپورٹ کا بزنس تھا جو ایشیا کے کئی ممالک میں پھیلا ہوا تھا۔ اس کے علاوہ وہ امریکا میں بہت سے پٹرول پمپ کا مالک بھی تھا۔ دولت اس کے گھر میں دن رات برستی تھی۔ اس کے سرکل میں اس کا نام بہت عزت اور احترام سے لیا جاتا تھا۔ اس کے حلیے سے ہرگز نہیں لگتا تھا کہ وہ اتنا ذہین اور کامیاب انسان ہے۔ اگر پہلی نظر میں اسے دیکھا جاتا، تو وہ جدید دور کے ترقی پسند اور فیشن کے دلدادہ، کھنڈرے سے لڑکے کا تصور ذہن میں ابھرتا تھا۔

اس نے اپنے سلکی برائون بالوں کو کندھوں تک بڑھایا ہوا تھا۔ اس کی پونی اس کی پشت پر اکثر نظر آتی تھی۔ لباس میں وہ جدیدیت کا قائل تھا۔ ہر برانڈ کے نئے سے نئے انداز کے کپڑے زیب تن کرنا اسے بہت پسند تھا۔ اس کا فیشن کبھی بھی تنقید یا تضحیک کا نشانہ نہیں بنا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ اس طرح کا فیشن اپناتا جو اس کی شخصیت سے میل کھائے۔

اس کا قد تقریباً چھ فٹ کے قریب تھا اور مسلسل کئی سال باقاعدگی سے جم جانے سے اس کی باڈی بہت مضبوط شیپ میں آگئی تھی۔ اس کے بازو کے مسلز بہت سے لوگوں کو رشک و حسد میں ڈال دیتے تھے۔ آفس میں وہ اکثر پیشتر ڈریس پیٹ شرت ہی پہنتا اور عام دنوں کی طرح کلائی میں رنگ برنگ بینڈز کے بجائے، مہنگی

گھڑی باندھی ہوتی تھی۔ چہرے پر ہلکی ہلکی ڈاڑھی، جو کبھی تو بڑھی ہوتی اور کبھی مناسب تراش خراش سے سچی ہوتی مگر وہ کبھی بھی کلین شیو نہیں رہا تھا۔ وہ اپنے جدید اپارٹمنٹ میں بہت شان سے، کئی سالوں سے اکیلا ہی رہتا تھا۔ اس کی فیملی میں اور کون کون تھا اس کے بارے میں کوئی نہیں جانتا تھا اور نہ ہی کبھی اس نے اس بارے میں کوئی ذکر کیا تھا۔ اس کے سرکل میں لوگوں کو اس بات سے کوئی سروکار بھی نہیں تھا۔

وہ کون تھا؟ کیا تھا؟ کیسا تھا؟ ایسی باتوں میں پڑے بغیر سب اپنے اپنے مطلب کی ڈور سے بندھے اس کے گرد گھومتے رہتے تھے۔

ایڈم اکثر سوچتا تھا کہ

”بے شک میرے پاس لوگوں کا بے پناہ ہجوم ہوتا ہے مگر ان میں سے ایسا کوئی بھی نہیں جو کسی طلب اور ضرورت کے بغیر صرف میرے لیے ہو۔ وہ سب کی نظروں میں امیر ترین اور خوش نصیب شخص تھا مگر خود وہ اپنی نظروں میں دنیا کے ہر رشتے سے محروم اور بے نیاز تھا۔ شاید اسی لیے وہ شادی جیسے کسی بندھن میں بندھنے کا قائل ہی نہیں تھا۔

وہ خوبصورت چہروں، جسموں اور آنکھوں کو سراہتا تھا، دیکھتا تھا۔

اپنی مرضی اور پسند کا وقت ان کے ساتھ گزارتا۔

ان کے ساتھ گھومتا، پھرتا، ڈانس فلور پر کمر میں ہاتھ ڈالے جھومتا۔

زندگی کا ہر طرح کا لطف اٹھاتا۔ اونچے اونچے قہقہے لگاتا۔

پیسہ شراب کے ساتھ ساتھ بہاتا۔

نشے میں دھت، وہ جب بار سے نکلتا، تو اس کے لڑکھڑاتے قدموں میں مستی نہیں ہوتی تھی بلکہ عجیب سی شکست اور بے بسی کا احساس ہوتا جو اس کے ہر قدم کے ساتھ ساتھ واضح محسوس ہوتا۔ دنیا کا کوئی نشہ بھی اسے ہوش و خرد سے بیگانہ نہیں بناتا تھا۔ کچھ ایسا تھا جو اس کے سب حواس ہمیشہ بحال رکھتا تھا۔ اس کی آنکھوں کی تیز ہوتی سرنی میں ایک اذیت، ایک یاد کا درد، ایک پرچھائیں کی چاپ ہمیشہ محسوس ہوتی تھی۔

وہ اپنی ذات کی تہ در تہ کسی پرت میں چھپا تھا۔

جہاں وہ اتنا ہی اکیلا اور تنہا تھا، جتنا آسمان پر بسنے والا اس کائنات کا خالق۔

وہ خالق کائنات اپنی بادشاہت کا بے تاج بادشاہ ہے۔

جب کہ وہ اپنی ذات کی پستیوں سے شرمندہ، اپنے ہی اندر کہیں چھپ کر بیٹھا تھا

ایڈم خود سے ہم کلام نہیں ہوتا تھا وہ جو بھی تھا دنیا کے سامنے تھا۔ اپنے لیے،

اپنی ذات کے لیے وہ منکرین میں شامل تھا۔

”اس نے خود کو قبول نہیں کیا تھا، وہ خود سے بات نہیں کرتا تھا۔“

”وہ خود سے لپٹ کر نہیں رویا تھا، وہ خود سے مل کر کبھی نہیں ہنسا تھا۔“

”اسے خود سے کوئی غرض یا طلب نہیں تھی۔“

”اور دنیا میں سب سے مشکل کام، خود سے نظر ملانا، خود سے بات کرنا ہوتا ہے

۔ دنیا سے نظریں ملانا، جھوٹ بولنا، دھوکا دینا بہت آسان ہوتا ہے۔“

”بس خود کے ساتھ جھوٹ بولنا، خود کو دھوکا دینا انگاروں پر چلنے کے مترادف ہوتا

ہے اور وہ تو انگاروں پر چلتا چلتا یہ بھول ہی گیا تھا کہ نرم زمین، نرم مٹی بھی

پیروں کا مقدر ہوتی ہے۔“

عجیب سیلانی طبیعت کا مالک تھا، ہر کام میں ٹانگ اڑانے والا، ہر رسک لینے والا۔

مگر کسی بھی کام کو شروع کرنے سے پہلے اچھی طرح سے اس کے تمام پہلوؤں کا

جائزہ لیتا، ریسرچ ورک کرتا، پھر پوری لگن اور جنون کے ساتھ کام کی ابتدا کرتا

اور جب تک مکمل نہ کر لیتا، چین سے نہیں بیٹھتا تھا۔ وہ اپنے کام میں پرفیکشن کا

قائل تھا اور ایسی ہی ٹیم بھی چنتا تھا جو اس کے ساتھ، اسی سوچ اور لگن کو لے کر چل سکے مگر اکثر ایسا ہوتا کہ اسے ایسے سر پھرے لوگ بہت کم ہی ملتے تھے۔

”ایڈم کو آرٹ سے بہت دلچسپی تھی جو فیشن انڈسٹری سے ہوتی ہوتی، فلم میکینگ تک پہنچ گئی۔ اس نے اسی شوق میں کچھ کورسز اور ڈپلومے بھی کیے پھر کچھ لوگوں کے ساتھ مل کر فلم میکینگ کا کام شروع کر دیا۔ ٹیم چھوٹی ہونے کی وجہ سے زیادہ سرمایہ، ایڈم ہی لگاتا تھا۔ یہ سب کچھ وہ اپنے شوق کی بنیاد پر کر رہا تھا۔ اسی لیے اسے نفع یا نقصان کی پروا بھی نہیں تھی مگر پھر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ وہ اس فیلڈ کو سنجیدگی سے لینے پر مجبور ہو گیا۔“ اسے لگتا تھا کہ دو اور دو چار بنانے کے چکر میں وہ ساری زندگی، اپنے اندر کی آوازوں سے بے خبر رہے گا۔ بزنس اس کی ضرورت ضرور تھی مگر اس کی اندرونی تسکین اور سکون اس میں نہیں تھا۔ اس کے لیے اسے مختلف قسم کے تجربات کرنے تھے۔ وہ آرٹسٹ تو تھا نہیں جو کینوس پر اپنے خوابوں اور ادھوری خواہشوں کے رنگ پیٹ کر تا مگر بڑی اسکرین پر دوڑتے، بھاگتے مناظروں نے اسے سوچوں کے نئے انداز سکھائے۔ اسے لگا کہ وہ اپنے اندر کی سوچوں اور خواہشوں کو بڑے پیمانے پر لوگوں کے سامنے لا سکتا ہے۔ وہ اس فیلڈ میں زیادہ سے زیادہ تجربات کر سکتا ہے۔

اسی بات کو مد نظر رکھتے ہوئے اس نے اپنے کام کو بڑے پیمانے پر لانے کا فیصلہ کر لیا اور اسی جستجو میں دن رات ایک کر دیے۔

☆...☆...☆

”کیا تم آج بھی فارینہ کی ایک طرفہ محبت میں مبتلا ہو؟“

پارٹی میں شہرام کو الگ تھلگ، بیزار بیٹھے دیکھ کر انصب نے پاس آ کر درشت لہجے میں پوچھا۔ وہ شہرام کا بہت قریبی اور دیرینہ دوست تھا۔ اُس کے سب حالات و واقعات سے واقف۔ شہرام جس نے اکیلے، اپنے دم پر آج اپنا ایک مقام بنایا تھا اور جب وہ کامیابی اور شہرت کی بلندیوں پر تھا، تو اس کا ایک دم بے دل اور بیزار کن رویہ اس کے روزمرہ کے معاملات کے ساتھ ساتھ اس کے کام پر بھی اثر انداز ہو رہا تھا۔ شہرام کے کولیگز مبشر اور احمد کی طرح انصب کو بھی یہ ہی لگتا تھا کہ شہرام فارینہ کی محبت میں مبتلا ہونے کی وجہ سے ہر نئی لڑکی کو ریجیکٹ کر رہا ہے۔ وہ اپنے الوٹن کا شکار ہے۔ ہر چہرے میں اسی کا چہرہ تلاش کرنے کی خواہش میں وہ پچھلے تین سال سے اس فلم کو لیے بیٹھا ہوا تھا۔

”انصب... تم بھی۔“

شہرام نے چونک کر اس کی طرف دیکھا اور پھر افسردہ سا ہو گیا۔ انصب اس کے سامنے والی کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گیا اور میز پر اپنے دونوں بازو رکھتے ہوئے، شہرام کے وجہ چہرے کو گھورتے ہوئے بولا:

”تو اور کیا سمجھوں؟ تم جانتے ہو آج وقت، شہرت اور پیسہ تمہارے ساتھ ہیں مگر ضروری نہیں کہ یہ تینوں کل بھی تمہارے پاس رہیں۔ تمہارا یہ رویہ، تمہیں اور تمہارے کام کو مشکوک بنا رہا ہے۔ آج جو لوگ تمہارے پیچھے پیچھے کام لینے کو پھرتے ہیں، کل ایسا نہ ہو کہ تم ان کے پیچھے ہو اور وہ تمہیں لفٹ نہ کروائیں۔“

انصب نے اسے تصویر کا دوسرا رخ دکھایا اور شہرام اسے دیکھتا رہ گیا۔

”اس سب میں فارینہ کا ذکر کہاں سے آگیا؟“ شہرام نے سنجیدگی سے پوچھا۔

”یہ سب اسی کی وجہ سے ہوا ہے۔ وہ ہی اصل وجہ بنی تم لوگوں کے درمیان اختلاف کی۔ اتنی تیز لڑکی تھی کہ بیک وقت تم دونوں کو الو بناتی رہی، اسی کے جوگ کو لیے وہ خاموشی سے منظر عام سے ہٹ گیا اور اس کے کچھ عرصے بعد وہ بھی اچانک روپوش ہو گئی۔ رہ گئے تم۔ جس نے اس کی یاد اور محبت کا روگ آج تک دل میں چھپایا ہوا ہے اور آگے بڑھنے سے انکاری ہو۔ اگر یہ سب جھوٹ ہے، تو مجھے بتاؤ کہ فارینہ کے جانے کے بعد، تم نے خود کو ایک جگہ کیوں روک لیا

ہے؟ یہ تمہارا ڈریم پروجیکٹ ہے جو تمہیں شہرت اور کامیابی کے آسمان پر لے جائے گا۔ تمہارے نام کو ہمیشہ کے لیے امر کر دے گا اور اسی کی تکمیل میں تم اتنے لاپرواہ اور بے زار ہو کہ جیسے...”

انصب غصے میں بولتا بولتا ہانپنے لگا۔ آج کافی دنوں بعد اسے شہرام سے بات کرنے اور دل کی بھڑاس نکالنے کا موقع ملا تھا۔ شہرام نے گلاس میں پانی ڈالا اور اس کی سامنے رکھا، تو انصب نے اسے گھورا۔ جو اب میں وہ مسکرا نے لگا۔ انصب نے پانی کا گلاس اٹھایا اور ایک ہی گھونٹ میں خالی کر دیا۔

”ہاں اب بتاؤ۔ کیا کہنا ہے؟“ انصب نے کرسی کی پشت سے ٹیک لگاتے ہوئے اطمینان سے پوچھا۔

”فارینہ سے محبت اپنی جگہ مگر تم خود ایمانداری سے سوچو کہ اس جیسا چہرہ اور صلاحیت کیا عام ہے؟ یہ تو تم بھی مانو گے کہ وہ خوب صورتی اور فن کا مکمل سراپا تھی۔ اب تم اسے میری بد قسمتی یا اس کی خوش قسمتی کہہ لو کہ مجھے اب تک ویسا کیا، اس سے ملتا جلتا چہرہ اور باصلاحیت ہی نہیں ملا۔ تم جانتے ہو کہ یہ میرا ڈریم پروجیکٹ ہے اور اس کے لیے مجھے ہر چیز مکمل اور بہترین چاہیے۔ اسی لیے کام میں دیر ہوتی جا رہی ہے۔ رہ گئی بات میرے کام کی تو تم شاید بھول گئے ہو کہ یونی

انٹرنیٹ کے اشتراک سے پچھلے دو سالوں میں میری دو فلمیں اندرون اور بیرون ملک سینما گھروں کی زینت بن چکی ہیں اور وہ بھی بہت اچھے بزنس کے ساتھ مگر یار میں مارکیٹ میں کچھ الگ، کچھ بہت منفرد کام سامنے لانا چاہتا ہوں۔ وہی ایک جیسے چہروں اور کہانیوں کے ساتھ نہیں۔ پلیز اب تم اپنے دل سے سب وہم نکال دو۔ فارینہ سے میری خاموش محبت کو بار بار الزام دے کر مجھ تکلیف مت پہنچاؤ۔ میں اسے بھول نہیں سکتا مگر پھر بھی اسے بھولنے کی کوشش کر رہا ہوں۔”

شہرام نے سنجیدگی سے کہا، تو انصاف خاموشی سے اسے دیکھتا رہ گیا۔ جیسے اس کی بات میں سچ اور جھوٹ کا تناسب جانچ رہا ہو۔ پھر کچھ دیر بعد بولا۔

”میں جانتا ہوں کہ تم مجھ سے جھوٹ نہیں بولو گے مگر پھر بھی میرا دل تمہارے لیے پریشان ہے۔ میں تمہیں بہت مضبوط دیکھنا چاہتا ہوں مگر نہ جانے کیوں مجھے لگتا ہے کہ محبت تمہارے وجود کی دیمک بن گئی ہے۔ تمہیں اندر سے کمزور بنا رہی ہے اور اگر ایسا نہیں ہے، تو تم اپنی طرف بڑھنے والے کسی بھی ہاتھ کو تھام سکتے ہو۔ پھر یہ روگ کیوں؟ یہ جوگ کس لیے؟“

انصاف کی باتیں سن کر شہرام گہری سانس لے کر رہ گیا۔ جیسے اسے سمجھانا مشکل ہو گیا ہو۔

”یار محبت وجود کی دیمک نہیں ہوتی بلکہ محبت میں جدائی، دیمک بن کر آہستہ آہستہ، اندر ہی اندر کھانے لگتی ہے۔ میں مبتلائے محبت ضرور ہوں مگر منکر محبت نہیں۔“

تم جانتے ہو محبت میں منکر ہونا، نہ صرف اس کی توہین ہے بلکہ یہ اپنی ہی ذات، اپنے آپ کی نفی کرنے، دھتکارنے کے برابر ہے۔ آپ جس جذبے سے پہلی بار آشنا ہو کر زمین سے آسمان تک کا سفر لمحوں میں طے کرتے ہیں جو جذبہ آپ کو محبت کی آفاقی سچائی پر یقین لانے، الہام کے اترنے، جسموں کے بندھن سے آزاد کر کے روح کے تعلق کی نوعیت اور اہمیت سکھا دے، تم خود ہی سوچو کہ اس کا انکار کیا اپنی ذات، کا شرک ہی نہیں ہے؟ میری محبت کا جو تار اس کی روح سے بندھا تھا، وہ آج بھی جدائی کے موسم میں، یاد کے سروں سے بچتا اور محبت کے نغمے سناتا ہے۔ شاید دنیا کی ہر آواز، ہر ساز کو چپ کروایا جاسکتا ہے مگر اپنے دل کی آواز، اپنے دل میں بجتے سازوں کو خاموش کروانا کبھی بھی آسان نہیں رہا۔

شہرام کی آنکھوں میں محبت کے رنگ بہت گہرے تھے۔

”اچھا خیر چھوڑو ان باتوں کو، مجھے لگتا ہے کہ انسان کسی چیز کے آگے بے بس اور مجبور نہیں ہے سوائے اپنی تقدیر کے!“ شہرام نے مضبوط لہجے میں کہا۔

”جانتا ہوں مگر تم یہ بھی مان لو کہ اگر تمہاری تقدیر اور تمہاری محبت ایک دوسرے کے متضادم ہوں، تو یہ جنگ کتنی تباہی لاتی ہے۔ تمہیں اس بات کا اندازہ ہی نہیں ہے میرے دوست۔“ انصب نے کہا تو شہرام سر جھٹک کر رہ گیا۔

”فکر مت کرو بہت جلد تمہیں اچھی خبر ملے گی۔ مجھے اپنی فلم کے لیے ہیروئن مل گئی ہے اور بہت جلد شوٹنگ شروع ہونے والی ہے۔“

شہرام نے کرسی سے اٹھتے ہوئے کہا۔ کیونکہ اب انصب اس کے طرف جارحانہ تیور لیے بڑھ رہا تھا۔

”تیری تو... اتنی دیر سے میرا دماغ خالی کروا دیا۔ میں سمجھا کہ میرا دوست کسی پریشانی اور مصیبت میں گرفتار ہے اور یہاں صاحب... مجھے ہی بے وقوف بنا رہے تھے۔“

انصب نے شہرام کی طرف دیکھتے ہوئے، دانت پیسے۔ شہرام ہنستے ہوئے جیسے ہی پلٹا کسی سے ٹکرا گیا۔ وہ بھی اپنے دھیان میں تھی۔ سیدھا اس کے چوڑے سینے سے آگئی۔ پھر ایک دم ہی گڑبڑا کر پیچھے ہٹی، شہرام بھی جھینپ سا گیا۔ جب کہ انصب کا قہقہہ بہت اونچا تھا جس پر اس حسینہ نے بہت ناگواری سے اس کی طرف دیکھا۔

”سوری مس! غلطی میری تھی۔“ شہرام نے مؤدب لہجے میں کہا مگر ساتھ ہی انصب کو گھوری بھی ڈالی۔

”نہیں مجھے بھی دیکھ کر چلنا چاہیے تھا مگر یہاں کافی بد تہذیب لوگ موجود ہیں۔“

اس حسینہ نے تیز نظروں سے انصب کو گھورا، تو وہ بھی اس کے لفظوں پر تڑپ اٹھا۔

”او ہیلو مس! بد تہذیب کس کو کہا؟“ انصب کڑے تیوروں کے ساتھ بولا۔

”جس نے زیادہ محسوس کیا، اسے ہی کہا تھا۔ بائے داوے میرا نام عانیہ ہے، تمیز سے میرا نام لیں۔“ اس نے بھی تڑاق سے جواب دیا۔

”ایک منٹ مس عانیہ! آپ کو جو تکلیف پہنچی اس کے لیے میں معذرت خواہ ہوں۔ امید ہے کہ آپ نظر انداز کر دیں گی۔“

شہرام نے دونوں کے بگڑتے تیور دیکھتے ہوئے فوراً کہا، تو عانیہ ایک دم ہی رک کر اس کی طرف متوجہ ہوئی اور پھر اثبات میں سر ہلاتی، انصب کی طرف دیکھ کر منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑاتی وہاں سے پلٹ گئی۔

”دیکھا! یہ مجھے گالی دے کر گئی ہے۔“ انصب نے تڑپ کر کہا، تو شہرام نے مسکرا کر اس کے طرف دیکھا۔

”میں نے تو نہیں سنا کچھ بھی ایسا۔“

”منہ سے بھلے نہ کہا ہو مگر اس کے تاثرات تو ایسے ہی تھے نا۔“ انصب نے منہ بناتے ہوئے کہا۔

”تم نے بھی تو بد تہذیبی کا مظاہرہ کیا تھا۔ اس لیے اب بھگتو۔“ شہرام نے ایک نظر دور تک ہنستے مسکراتے، لوگوں پر ڈالی اور اپنے میزبان سے مل کر وہاں سے باہر نکل آیا۔ انصب بھی اس کے ساتھ ساتھ ہولیا۔

”کوئی بات نہیں اگلی بار ملے تو سہی۔“ انصب نے خود کلامی کی۔ شہرام نے گاڑی کا دروازہ کھولتے ہوئے اس کی طرف دیکھا۔

”اچھا تو جناب دور تک کا سوچ رہے ہیں۔“ شہرام نے شرارتاً کہا، تو انصب بھی مسکرا کر اسے دیکھنے لگا۔

☆...☆...☆

”سنا ہے کہ ایک بہت پینچے ہوئے بابا جی ہیں جو کسی دور کے قصبے میں رہتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ ان کی دعا میں بہت اثر ہے۔ میری مائیں تو خان زادہ احمد کو ان کے پاس لے جائیں۔“

اماں رحیمہ نے گم صم سی بیٹھی نوربانو سے کہا جو خاموش نظروں سے اماں رحیمہ کے بوڑھے چہرے کی طرف دیکھنے لگی۔ پھر گہری سانس لے کر بولی۔

”اماں رحیمہ آپ سے کیا چھپا ہوا ہے؟ خان صاحب نے کون سی درگاہ، کون سا مزار چھوڑا ہے جہاں جا کر، اپنے بیٹے کے لیے دعا نہ کی ہو۔ صدقہ، خیرات جو جو کسی نے کہا، ہم نے سب کیا مگر خان زادہ احمد کی حالت ٹھیک ہونے کے بجائے روز بہ روز بگڑتی جا رہی ہے۔“

نوربانو کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ اماں رحیمہ بھی افسردہ ہو گئیں۔

”ٹھیک کہتی ہیں آپ بی بی۔ بڑے خان نے کوئی کمی نہیں چھوڑی۔ بس آگے جو بھی اللہ کو منظور ہو۔“

اماں رحیمہ نے دوپٹے کے پلو سے اپنی آنکھیں صاف کیں۔ کچھ دیر دونوں ہی چپ بیٹھی اپنے اپنے خیالوں میں گم رہیں۔ جب اس خاموشی کو نوربانو کی بہت ہلکی اور سرگوشی جیسی آواز نے توڑا۔

”اماں رحیمہ آپ کو وہ ننھے اور گلابی ہاتھ پائوں والا بچہ یاد ہے جس کے دائیں ہاتھ کی شہادت کی انگلی کے پاس کالا تل تھا۔“

آپ نے تو اسے گود میں اٹھایا تھا۔ سینے سے لگایا تھا۔

”اماں رحیمہ اس کا لمس، اس لمس کی ٹھنڈک کیا تھی؟ میری ممتا آج بھی اس کے لیے پیاسی ہے۔ ایک بار اسے چھونے، اس چومنے، اسے سینے سے لگانے کے لیے اندر ہی اندر تڑپتی، اپنی ہی آگ میں جل رہی ہے۔“

”اماں رحیمہ! ہم عورتیں بظاہر کتنی بھی طاقتور اور خود کو مضبوط ظاہر کریں مگر اپنی فطرت اور حساسیت کی وجہ سے ہمیشہ رشتوں کے ترازو میں تولی جاتی ہیں۔ ہمیں کتنی آسانی سے مختلف خانوں، مختلف رشتوں میں تھوڑا تھوڑا کر کے بانٹ دیا جاتا ہے۔ کبھی ماں باپ کے مان اور محبت کے خانے میں، تو کبھی بھائی کی غیرت اور عزت کے ترازو میں، تو کبھی غیر لوگوں کے سپرد کر کے خوشیوں بھری زندگی کی دعا دے کر رخصت کر دیا جاتا ہے۔ وہ عورت اپنے مجازی خدا کو اپنا بنانے کے لیے ہر وقت آزمائش کی آگ میں جلتی، قربانی دیتی رہتی ہے۔ حتیٰ کے اپنی اولاد کی بھی۔ مجازی خدا کا ہر حکم سر آنکھوں پر مگر اماں رحیمہ دنیا کا کوئی مرہم، کوئی تریاق ایسا نہیں بنا ہے جو ممتا پہ لگے زخموں کو بھر سکے۔ میرا وقت تو جیسے تیسے گزر گیا۔ اولاد کا سکھ اور میوہ بھی چکھ لیا۔ بیٹے اور بیٹیوں کا سکھ بھی پالیا۔ میرے دکھ کا کسی نہ کسی طرح ازالہ تو ہو گیا مگر وہ کیا کرتا ہو گا؟“

”کیا اس کو بھی ماں باپ جیسے رشتے ملے ہوں گے؟“

”کیا کسی نے اس کے سر پر نرمی اور محبت سے ہاتھ پھیرا ہو گا؟“

”کیا اس نے باپ کی شفقت، باپ کی قربانی دیکھی ہو گی؟“

”کیا وہ فخر سے یہ کہتا ہو گا کہ ماں انمول تحفہ ہے رب کا۔“

”کیا وہ ماں کی عظمت کا قائل ہو گا؟“

”کیا وہ خون کے رشتوں پر اعتبار کرتا ہو گا؟“

نہیں نا...!

”وہ دنیا میں ویسے ہی آیا، جیسے حکم ربی تھا۔“

”وہ ہمارے حسن سلوک، نرمی اور محبت کا مستحق تھا نا۔“

”پھر...“

”ہم نے اسے دھتکار کر یہ سکھایا کہ خدا کا فیصلہ غلط تھا؟“

”ہم نے اسے بے اعتبار، بے یقین کیا۔“

”جب خدا، اُس سے اس کی بے یقینی، ناامیدی، بد اعمالیوں کی وجہ پوچھے گا، تو

وہ کہے گا کہ اس کے ذمے دار وہ لوگ ہیں، جنہوں نے پیدا ہوتے ہی اسے زمانے

کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا۔“

”یعنی ہم جو بھی کر لیں ہماری یہ کوتاہی ہمیں اپنے رب کی ناراضی کا مستحق قرار دے گی۔“

”کیا خان زادہ احمد کی یہ پراسرار بیماری اسی بات کی طرف اشارہ تو نہیں۔“

اماں رحیمہ نے نور بانو کے پاس آکر اس کے کندھے پر نرمی سے ہاتھ رکھا۔ جیسے اسے حوصلہ دے رہی ہو۔ وہ دونوں کتنی ہی دیر بے آواز روتی رہیں۔ نہ جانے کتنی دیر ایسے ہی گزر گئی۔ جب اماں رحیمہ کو اچانک کچھ یاد آیا اور وہ پرجوش ہو کر بولی۔

”نور بی بی میرے رشتے کی بہن نے ایک سائیں کے بارے میں بتایا ہے۔ آپ کو شاید یاد ہو کہ میں اکثر ذکر کرتی تھی کہ اس کا بیٹا کئی سالوں سے بہت بیمار ہے اور اسے کہیں سے بھی شفا نہیں مل رہی تھی۔ بہت ڈاکٹری علاج بھی کروایا تھا مگر کسی کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔ بس اللہ نے اس سائیں کو وسیلا بنا کر بھیج دیا۔ اس سائیں کی دعا سے اس کا بیٹا بہت جلد صحت یاب ہو گیا۔“

اس نے احمد بابا کے بارے میں سنا، تو خاص طور پر میرے پاس آئی کہ ایک بار انہیں سائیں کے آستانے پر ضرور لے جائیں۔ ویسے بھی تو بڑے خان زادہ نے کوئی در نہیں چھوڑا، ایک بار اسے بھی آزما کر دیکھ لیں۔ وہ سائیں کسی سے کچھ نہیں

لیتے۔ بس دعا دیتے ہیں مگر میری بہن بتا رہی تھی کہ اس کے آستانے پر ہر وقت لوگوں کا بے تحاشا ہجوم لگا رہتا ہے۔ ہر وقت لنگر جاری رہتا ہے اور سب سے دل چسپ بات۔۔۔

اماں رحیمہ نے کچھ لمحوں کا توقف کیا۔ نور بانو نے بے چینی سے اس کے چہرہ کی طرف دیکھا۔

”وہ سائیں کسی سے کچھ نہیں لیتا ہے۔ سارا دن محنت مزدوری کرتا ہے اور جو بھی کماتا ہے اس سے لنگر چلاتا ہے۔ حالاں کہ اس کے خادم بننے کے لیے بھی بہت سے لوگ تیار ہیں۔ اس کے چاہنے والے، مرید بھی بہت ہیں مگر وہ سختی سے سب کو منع کرتا ہے کہ دعا کے علاوہ وہ کسی کے لیے کچھ اور نہیں کرے گا۔ اس کی دعا کی تاثیر کے بڑے بڑے قصے مشہور ہیں۔ آپ بڑے خان زادہ سے بات کر لیں۔ مجھے امید ہے کہ اس بار ناامیدی کا منہ نہیں دیکھنا پڑے گا۔“

”خان زادہ شمشیر۔۔۔“

نور بانو کے لب آہستہ سے ہلے۔ نہ جانے کب سے خان زادہ شمشیر پیچھے کھڑے ان دونوں کی باتیں سن رہے تھے۔ ان کا سُرخ چہرہ ان کی اندورنی حالت کی خبر دے رہا تھا۔ اماں رحیمہ نے بھی فوراً مڑ کر دیکھا اور اپنی جگہ کھڑی ہو گئی۔

”نوربانو! بچھتاوے کی جس آگ میں آپ جل رہی ہیں، وہ آگ ہمارا بھی دل جلا کر راکھ کر چکی ہے۔ آپ کی طرح ہم بھی روز اسی سود و زیاں کے حساب سے گزرتے ہیں۔ مگر کہہ نہیں سکتے کیسے کہہ دیں کہ...“

خان زادہ شمشیر کا لہجہ نرم تھا۔ نوربانو تڑپ کر رہ گئی۔

”میرا مطلب یہ نہیں تھا کہ...“

”اماں رحیمہ! ہم اس سائیں کے پاس ضرور جائیں گے۔ آپ تیاری کریں۔ شاید ایسا ہی کوئی وسیلہ، ہماری معافی کا ذریعہ بن جائے۔“

خان زادہ شمشیر کہتے ہوئے واپس پلٹ گئے۔ اماں رحیمہ اور نوربانو ایک دوسرے کی طرف دیکھتی رہ گئیں۔

☆...☆...☆

”آپ نے بہت اچھا فیصلہ کیا ہے۔ انڈین موویز کی بہت ڈیمانڈ ہے دنیا بھر میں۔ انڈین فلم انڈسٹری بہت بڑی ہے اور اگر آپ یہاں سرمایہ کاری کرنا چاہ رہے ہیں، تو بہت ہی سمجھ داری اور عقل مندی کا فیصلہ ہے۔“

ایڈم اس وقت اپنے کچھ کولیگز کے ساتھ آرٹ اینڈ فلم سٹوڈیو آیا تھا۔ جہاں نئے پرانے اور تجربہ کار، باصلاحیت لوگوں کا ہجوم ہر وقت لگا رہتا تھا۔ وہ اپنے جس

دوست کے ریفرنس سے، شاطر آنکھوں اور چھوٹے قد کے مالک کمار سے ملا تھا۔ وہ انڈین انڈسٹری میں بہت عرصے سے کام کر رہا تھا۔ اس کا کام تو کوئی خاص نہیں تھا مگر وہ تعلقات بنانے اور فلم ڈسٹری بیوشن میں مہارت رکھتا تھا اور ایڈم جیسے ہی کسی رئیس زادے کی گھات میں تھا۔ جن کے پاس پیسہ تو بہت ہوتا تھا مگر معلومات اور راہنمائی نہ ہونے کے برابر۔ اسی وجہ سے وہ اپنا بہت سارا روپیہ، پیسہ آسانی سے کمار جیسے اژدھا کے منہ میں ڈال دیتے تھے۔

اس وقت کمار کو ایڈم اپنے تازہ شکار کے ماند لگ رہا تھا اور وہ اس کے سامنے بچھا جا رہا تھا۔ ایڈم نے اس کی بات توجہ سے سنی اور پھر مسکراتے ہوئے بولا۔

”آپ کی بات اپنی جگہ درست مگر ایک مسئلہ ہے۔“

”کمار دیو کے پاس سب مسئلوں کا حل موجود ہے۔“ کمار دیو نے ناک سے مکھی اڑاتے ہوئے کہا۔

ایڈم گہری سانس لے کر اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہنے لگا۔

”میں فلم میکیننگ میں نئے نئے تجربات، نئے نئے موضوعات کے ساتھ کرنا چاہتا ہوں اور سب سے اہم بات کہ...“

ایڈم سانس لینے کو رکا۔

”یہ کون سی بڑی بات ہے۔ بس آپ حامی بھریں۔ بالی وڈ فلم انڈسٹری آپ کو خوش آمدید کہنے کے لیے بے قرار ہے۔“

کمار دیو کی آنکھوں میں شاطرانہ چمک تھی۔

”بہت شکریہ مگر میں یہ تجربہ آپ کے پڑوسی ملک پاکستان کی فلم انڈسٹری میں کرنا چاہتا ہوں۔“ ایڈم نے کہا، تو کمار حیرت سے آنکھیں پھاڑے اس کی طرف دیکھنے لگا۔ جیسے اس کے منہ سے نکلے لفظوں پر یقین نہ آرہا ہو۔

”کیا کہا آپ نے پاکستان؟ ہاہاہاہاہا...“ کمار اپنی بے ساختہ ہنسی پر قابو پانے کی کوشش کر رہا تھا۔ کافی دیر بعد اس کی ہنسی تھی۔

”شاید آپ کو پتا نہیں کہ پاکستانی فلم انڈسٹری کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ آپ کا نالغ اس بارے میں نہ ہونے کے برابر ہے۔“ کمار دیو کا لہجہ استہزائیہ تھا۔

”میں نے آپ سے کب مشورہ مانگا ہے کہ مجھے وہاں کام کرنا چاہیے یا نہیں۔“ ایڈم نے سرد لہجے میں کہا، تو کمار دیو فوراً سنجیدہ ہو گیا۔

”نہیں میرا مطلب یہ نہیں تھا۔“ کمار نے کچھ کہنا چاہا۔

”میرے خیال سے آپ پہلے ہی کافی وقت لے چکے ہیں میرا۔“ ایڈم نے سختی سے کہا اور اپنے کو لیکز کو اشارہ کرتیہوئے وہاں سے پلٹ گیا۔

”ایلیکسیوزمی سر! اگر آپ برا نہ مانیں تو مجھے آپ کے صرف پانچ منٹ چاہئیں۔“ ایک خوب صورت اور وجیہ لڑکے نے اس کا راستہ روکا تھا۔ ایڈم نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

وہ لڑکا شکل سے ایشین لگ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں کچھ کرنے کا عزم بہت واضح تھا۔ ایڈم نے ایک سرسری نظر میں اسے اندر تک پرکھ لیا تھا۔

”معذرت میں ان صاحب کے ساتھ آپ کی گفتگو سن چکا ہوں۔ ویل ان صاحب کی طرح میرے لیے بھی یہ بہت حیران کن ہے کہ آپ اپنا قیمتی وقت اور پیسہ ایسی جگہ لگانا چاہ رہے ہیں جہاں کامیابی کے مواقع بہت کم ہیں مگر مجھے اس بات کی خوشی بھی ہے کہ آپ نے میرے ملک کے بارے میں سوچا۔“

اب کی بار ایڈم نے حیرانی سے اس کی طرف دیکھا، تو اس لڑکے نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

”جی میں پاکستان سے ہوں اور یہاں اپنی تعلیم مکمل کرنے آیا ہوں اور حیرت کی بات یہ ہے کہ آپ کی سوچ اور خیالات مجھ سے کافی ملتے جلتے ہیں۔ میرے خیال سے ایک بار ہمیں ساتھ مل کر کام ضرور کرنا چاہیے۔“

اس لڑکے نے پراعتماد لہجے میں کہا۔

”ضرور، مجھے رسک لینا اور نئے نئے چیلنج بہت پسند ہیں۔ نائٹس ٹو میٹ یو مسٹر۔“
ایڈم نے اپنا ہاتھ آگے بڑھاتے ہوئے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔
”شہرام علی خان۔“ جواباً اس نے بھی گرم جوشی سے ہاتھ ملایا۔

اور یہاں سے ابتدا ہوئی دونوں کے درمیان دوستی کی۔ دونوں بہت تیزی سے ایک دوسرے کے قریب آئے۔ حالاں کہ ایڈم، اس سے کچھ سال بڑا تھا مگر دونوں میں ذہنی ہم آہنگی کمال کی تھی۔ شہرام کو اسی دوران پتا چلا کہ بچپن میں، اس نے اپنی ایک قریبی پاکستانی فیملی کے ساتھ بہت وقت گزارا تھا اور ان کے پاس ہی پرانے ٹی وی ڈرامے اور فلمیں دیکھی تھیں جو اسے بہت پسند آئی تھیں۔ وہ یہاں کے کلچر سے الگ، کچھ کرنا چاہتا تھا۔ کچھ عرصہ دونوں نے مل کر تجرباتی طور پر شارٹ موویز بنائیں اور پھر جب شہرام نے اپنے دادا کی موت اور ان کی خواہش کے مطابق اپنے وطن میں رہنے کا فیصلہ کیا، تو وہاں سے آتے ہوئے ایڈم کو بھی پاکستان آنے اور اپنے ساتھ کام کرنے کی دعوت دی جسے اس نے فوراً قبول کیا اور کچھ عرصے بعد وہ شہرام کے پاس پاکستان آگیا۔ دونوں نے مل کر کام شروع کیا، تو اس کی دھوم ہر طرف مچ گئی۔ کیوں کہ ان کے کام کا طریقہ الگ اور انٹرنیشنل لیول کا تھا۔ ان کے انٹرٹینمنٹ ہائوس سے بنی فلمیں اور ڈرامے ہر طرف شہرت

رکھتے تھے۔ انٹرنیشنل مارکیٹ میں بھی ان کا نام سامنے آنے لگا۔ ایڈم جو پہلے پہل اپنے غیر ملکی ہونے کی وجہ سے لوگوں کی توجہ کا مرکز بنا ہوا تھا۔ بعد میں اپنے کام اور قابلیت کی وجہ سے قابل قدر جانا جانے لگا۔ شہرام اکثر ایڈم کے نالج سے بہت متاثر ہوتا۔ لگتا ہی نہیں تھا کہ وہ پاکستان سے لاعلم ہے۔ بہ قول ایڈم کے اس نے پاکستان کے بارے میں بہت پڑھا اور سرچ کیا تھا تا کہ جب کبھی بھی وہ پاکستان کے لیے کام کرے، تو اسے مشکل پیش نہ آئے۔ اپنے مغربی لب و لہجے میں تھوڑی بہت اردو بولتا، شہرام کو بہت اچھا لگتا تھا۔ سب کچھ بہت اچھا اور بہترین تھا۔ ان دونوں نے ہی انٹرنیشنل لیول کی ایک فلم بنانے کاعلان کیا اور آڈیشن کے دوران ان کی ملاقات حسین اور ذہانت سے بھرپور، ماڈل فارینہ سے ہوئی جس نے کچھ عرصہ پہلے ہی شوقیہ ماڈلنگ شروع کی تھی۔ امیر والدین کی لاڈلی بیٹی ہونے کی وجہ سے اس میں نخرا اور ناز بھی بہت تھا۔ کچھ اس کی بے تحاشا خوب صورتی اور حسن نے اس کا دماغ ساتویں آسمان پر پہنچا دیا تھا۔ فارینہ شہرام کی دریافت تھی جسے دیکھ کر ایڈم کتنی ہی دیر گم صم رہا۔

اور یہ بات بعد میں فارینہ نے بھی اکثر محسوس کی کہ ایڈم اسے کن انکھیوں سے دیکھتا رہتا تھا۔ فارینہ اس طرح کے رویے کی عادی تھی مگر نہ جانے کیوں اسے ایڈم

کا اپنی طرف دیکھنا اچھا نہیں لگتا تھا۔ اس کی لائٹ برائون آنکھوں میں اس کے حسن کے قصیدے یا ستائش نہیں ہوتی تھی بلکہ عجیب سی جلن، عجیب سے کھوج تھی۔ ایسے جیسے وہ نظریں اس سے کچھ بہت الگ اور پراسرار سے سوال کر رہی ہوں۔

فارینہ جو پہلے پہلے بہت خوش اور مطمئن تھی۔ ایڈم کی بولتی، کچھ کھوجتی نظروں سے گھبرا کر اس کی موجودگی سے چڑنے لگی۔ اس کا یہ رویہ لاشعوری طور پر تھا۔ جسے بہت بار شہرام نے بھی محسوس کیا تھا مگر اکثر نظر انداز کر دیتا مگر گزرتے وقت کے ساتھ ساتھ فارینہ ایڈم کے ساتھ بہت تلخ ہونے لگی۔ مجبوراً شہرام کو اسے سمجھانا پڑا کہ فلم کی پرموشن اور کامیابی کے لیے ان کا ایک نظر آنا بہت ضروری ہے۔ فارینہ نے ہامی تو بھر لی کہ وہ اب خود پر کنٹرول رکھے گی مگر وہ جانتی تھی کہ ایسا کرنا اس کے لیے زیادہ دیر تک ممکن نہیں ہے۔ جب کہ پہلے بھی بہت بار اس نے خود کو سمجھایا کہ ایڈم سے اس کا تعلق صرف کام کی حد تک ہے۔

فلم کی شوٹنگ ختم ہوئی تو اس کی پرموشن کے سلسلے میں اکثر وہ تینوں ایک جگہ اکٹھے ہونے لگے۔ دیکھنے والوں کے لیے وہ کامیابی کی مثلث تھی۔ لوگ رشک و حسد سے انہیں دیکھتے اور ان کی بہترین کیمسٹری پر باتیں کرتے تھے مگر کوئی نہیں جانتا

تھا کہ وہ تینوں اپنی اپنی جگہ، ایک ان دیکھی آگ، ایک ان دیکھی سوچ میں بندھے ایک دوسرے کا ساتھ دے رہے تھے۔

☆...☆...☆

”صاحب میں آپ کی کوئی مدد کر سکتا ہوں؟ کافی دیر سے آپ کو یہاں پریشان کھڑا دیکھ رہا ہوں۔“

خان زادہ شمشیر اچانک گاڑی میں پیدا ہونے والی خرابی کی وجہ سے سڑک کنارے کھڑے تھے۔ ڈرائیور کسی مدد کی تلاش میں گیا ہوا تھا۔ پچھلی سیٹ پر خان زادہ احمد نڈھال سا اپنی ماں کی گود میں سر رکھے لیٹا تھا۔ وہ سوکھ کر ہڈیوں کا ڈھانچہ بن گیا تھا۔ نور بانو کے ساتھ اماں رحیمہ بھی بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کی خالہ زاد بہن نے اسے جو راستہ سمجھایا تھا۔ اب وہ کہیں گم ہو کر رہ گیا تھا۔ خان زادہ نے تیز دھوپ میں ملگجے سے کپڑوں میں ملبوس، چہرے پر ہلکی برائون ڈاڑھی اور آنکھوں میں نرمی لیے ایک درمیانہ عمر کے شخص کو اپنی طرف آتا دیکھا۔ وہ فوراً چوکنا ہو گئے کہ آج کل چور ڈاکو بھی ایسے حلیوں میں پھرتے ہیں۔

”نہیں! ہمارا ڈرائیور ابھی آتا ہی ہو گا۔ اسی طرف گیا ہے وہ۔“

خان زادہ شمشیر نے سختی سے کہتے ہوئے ایک طرف اشارہ کیا۔ اس شخص کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔

”یہاں سے ورکشاپ زیادہ دور نہیں ہے۔ اس علاقے کی سب سے بڑی ورکشاپ ہے وہ اور میں بھی وہیں کام کرتا ہوں۔ ابھی واپس گھر جا رہا تھا تو پانی پینے کے لیے اس ٹیوب ویل کے پاس رک گیا۔ آپ چاہیں تو ٹھنڈے پانی کا لطف لے سکتے ہیں۔ پاس ہی ہے۔“

اس نے ایک طرف اشارہ کیا، تو خان زادہ شمشیر نے تھوڑا غور سے دیکھا تو اس کی بات میں صداقت نظر آئی۔ وہ گہری سانس لے کر رہ گئے۔

”دراصل میرے ساتھ عورتیں اور میرا بیمار بیٹا ہے۔ وہ زیادہ چل نہیں سکتا اور...“

”آپ فکر مت کرے۔ اگر کوئی بوتل ہے تو مجھے دیں۔ میں پانی بھر کے لا دیتا ہوں۔“

خان زادہ نے غور سے اس کے چہرے کی طرف دیکھا۔ اس کا رنگ شدید دھوپ میں جھلسا ہوا تھا مگر عمر زیادہ نہیں تھی۔ خان زادہ شمشیر نے خالی بوتل نکال کر دی، تو وہ فوراً مڑ گیا۔ کچھ دیر بعد تیز تیز قدم اٹھاتا واپس آیا، تو اس کی سانس پھولی ہوئی تھی۔

”یہ لیجیے! تب تک میں آپ کی گاڑی میں خرابی ڈھونڈتا ہوں۔“

اس نے کہا تو خان زادہ نے سر ہلا کر کار کا بونٹ کھول دیا اور پانی کی بوتل گرمی میں ہلکان ہوتی نوربانو کی طرف بڑھائی جسے تھام کر اس نے فوراً اپنے نڈھال ہوتے بیٹے کے منہ سے لگا یا۔ گرمی اپنے عروج پر تھی۔ سارا سفر پر سکون اور آرام سے اے۔ سی کی ٹھنڈک میں گزرا تھا مگر منزل کے پاس پہنچ کر گاڑی دغا دے گئی۔

جب تک اس نے گاڑی کا نقص ڈھونڈ کر اسے اسٹارٹ کیا۔ ہانپتا، کانپتا ڈرائیور بھی ان تک پہنچ گیا۔ اس کے ساتھ ایک آدمی تھا جو حیران نظروں سے سامنے کی طرف دیکھ رہا تھا۔

”لیجیے صاحب آپ کی گاڑی ٹھیک ہو گئی ہے۔“ اس نے کار کا بونٹ بند کرتے ہوئے مطمئن انداز میں کہا، تو حیران کھڑا ڈرائیور فوراً آگے بڑھا اور گاڑی اسٹارٹ کر کے دیکھی۔ گاڑی کے اسٹارٹ ہوتے ہی خان زادہ شمشیر نے متاثر نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

”اچھا میں چلتا ہوں۔“ اس شخص نے ہاتھ اٹھا کر کہا، تو خان زادہ نے فوراً اپنی جیب میں ہاتھ ڈالا اور اسے روکتے ہوئے بولے۔

”ٹھہرو اپنا انعام تو لے کر جاو۔“

اس نے مڑ کر خان زادہ کے ہاتھ میں پکڑے نیلے نوٹوں کی طرف دیکھا۔

”میں انعام صرف اللہ سے لیتا ہوں۔ انسانوں سے اپنے کام کی اجرت۔“

”اچھا بر خودار ایسا ہی سمجھ لو۔ اپنی اجرت سمجھ کر رکھ لو۔“

خان زادہ شمشیر نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ اس کی طرف دیکھا۔

”اجرت کام کی لیتا ہوں، مدد کرنے کی نہیں صاحب۔“

اس نے سر تک ہاتھ لے جا کر سلام کی اور بے نیازی سے اپنے راستے کی طرف

چل پڑا۔ نور بانو نے کار کے شیشے سے بہت حیران کن نظروں سے اسے جاتے ہوئے

دیکھا۔

”عجیب سر پھرا تھا۔“

خان زادہ شمشیر نے سر جھٹکتے ہوئے کہا، تو ڈرائیور کے ساتھ آئے آدمی نے منہ بنا

کر کہا۔

”جو خود دوسروں کو دیتا ہو، وہ کسی سے کیسے لے سکتا ہے۔“

”تم یہاں کے رہنے والے لگتے ہو۔ سنا ہے یہاں کوئی اللہ والا رہتا ہے۔ میں اپنے

بیٹا بیٹے کے لیے دعا کروانے آیا ہوں۔ تم بتا سکتے ہو کہ وہ کہاں ہوتے ہیں۔“

خان زادہ شمشیر نے اس کی بات پر غور کیے بغیر سوال کیا، تو وہ شخص مسکراتے

ہوئے کہنے لگا۔

”ابھی کچھ دیر پہلے جو یہاں موجود تھے، وہ ہی اللہ والے ہیں جنہیں ہم سب

سائیں کہہ کر مخاطب کرتے ہیں۔“

”کیا وہ جس نے ہماری مدد کی مگر وہ تو بہت عام سے حلیے میں سڑکوں میں پھر رہا

تھا اور اس نے بتایا کہ اپنا کام ختم کر کے واپس جا رہا ہے۔ وہ ہیں سائیں؟“

خان زادہ شمشیر نے حیرت سے پوچھا۔ تو وہ شخص سر ہلا کر رہ گیا۔

”پہلے پہل یہ بات ہمارے لیے بھی حیران کن تھی مگر وہ ایسے ہی ہیں۔ بظاہر بہت

عام سے، ہمارے جیسے۔ ہم میں رچے بسے ہوئے سے مگر اللہ کا بہت خاص کرم ہے

ان پر۔ ان کی دعا رد نہیں ہوتی صاحب۔“ اس شخص نے یقین سے کہا۔

”اچھا! دیکھ لیتے ہیں۔ ویسے یہ حضرت ملیں گے کہاں؟“ خان زادہ شمشیر نے پوچھا

۔

”سائیں کا ویسے تو شہر میں کوئی خاص ٹھکانہ نہیں ہے۔ وہ علاقے میں گھومتے رہتے

ہیں اور شہر سے باہر ایک پرانے مزار میں رات گزارتے ہیں مگر دوپہر کے وقت

یہ اس علاقے میں ایک بیوہ عورت کے نعمت خانے میں ایندھن پہنچانے کا کام

کرتے ہیں اور شام کے وقت وہ مدرسے میں مولوی صاحب کے ساتھ کچھ دیر ضرور بیٹھتے ہیں اور اگر کوئی ان سے خاص طور پر ملنا چاہے، تو مولوی صاحب کو پیغام بھیجوا دیتے ہیں اور پھر سائیں تک پیغام پہنچ جاتا ہے اور وہ مسجد کے پچھلے طرف مولوی صاحب کے مکان کی بیرونی بیٹھک میں لوگوں سے ملاقات کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ ہر جمعرات کو اسی پرانے مزار میں ہونے والی محفل سماع میں بھی ضرور شرکت کرتے ہیں۔ دراصل سائیں بہت من موعی ہیں۔ اس لیے کسی ایک جگہ ٹک کر نہیں بیٹھتے۔

اس شخص نے تفصیل سے جواب دیا اور ڈرائیور کو راستہ سمجھا کر چلا گیا۔

”عجب سیلانی مزاج کا بندہ ہے۔ اگر خلق خدا کی خدمت کرنی ہی ہے تو ایک جگہ ٹک کر بیٹھے۔“

جس کا اپنا کوئی ٹھکانہ نہیں وہ کسی اور کو کیا دے سکتا ہے۔ پتا نہیں کیوں میں اماں رحیمہ کے کہنے پر یہاں تک چلا آیا۔ پہلے کسی کو بھیج کر تصدیق کر لینی چاہیے تھی۔“

خان زادہ شمشیر نے جھنجھلاتے ہوئے کہا اور گاڑی کا دروازہ زور سے بند کر دیا۔

”آپ کی بات بجا ہے مگر نہ جانے کیوں میرا دل کہتا ہے۔ اس سائیں کی دعا ہمارے بیٹے کو ضرور لگے گی۔“

نور بانو نے پر جوش انداز میں کہا، تو خان زادہ شمشیر نے کسی سوچ میں گم اثبات میں سر ہلا دیا۔

☆...☆...☆

عورتوں کے لیے بنے بڑے سے ہوا دار کمرے سے باہر نکل کر اس نے سر گھما کر مرزا کے احاطے کی طرف دیکھا، تو دوپہر ڈھل رہی تھی۔

صبح سے لگی بھیڑ میں کچھ کمی آئی تھی مگر وہ جانتی تھی کہ یہ تھوڑی دیر تک ہے۔ آج ویسے بھی جمعرات تھی۔ عصر کے بعد پھر سے مزار کا احاطہ دور دور سے آئے لوگوں سے بھر جائے گا۔ پھر شور ہوگا، آوازیں ہوں گی۔ منتیں، مرادیں، مناجاتوں کے چراغ ہر آنکھ میں روشن اور ہر زبان پر جاری ہوں گے۔ محفل سماع میں شامل ہونے والے لوگوں کی کثیر تعداد ہوتی تھی جس میں دھمال ڈالنے والے ملنگ بھی ہوتے اور اکثر و بیشتر محفل میں شریک ہونے والے لوگ بھی۔

اسے لوگوں سے کوئی مطلب نہیں تھا۔ اسے جس سے مطلب تھا وہ صرف اسے یہاں ہی ملتا تھا۔ وہ تیز تیز قدم اٹھاتی احاطے کی پچھلی طرف بڑھی، جب اچانک کسی نے اس کا راستہ روک لیا۔

”کیسی ہے تو موہنی؟ ہمیں بھی تھوڑا وقت دے دیا کر۔“

پینو عرف پروین نے ہاتھ میں پکڑا گڑ کی چھوٹی سی ڈلی اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ موہنی نے اپنے چہرے پر بڑے سے گھونگٹ میں سے ایک نظر اس کے بڑھے ہوئے کالے اور سانولے ہاتھوں کی طرف دیکھا اور نفی میں سر ہلا کر جانے لگی۔ پینو کی شاطر آنکھوں میں ابھرتی ناگواری بہت واضح تھی۔

”اتنی جلدی کس بات کی ہے تجھے۔ تو خود کو سائیں کی خاص مریدنی کہتی ہے، تو ہم بھی سائیں کے مرید ہی ہیں۔ کیا ہوا اگر خاص نہیں ہیں، عام تو ہیں نا۔“

پینو نے بظاہر ہنستے ہوئے مگر زہر خند لہجے میں کہا۔ موہنی سے اس کی حسد اور جلن روز بہ روز بڑھتی ہی جا رہی تھی۔ موہنی نے اس کی بات کا جواب دینا ضروری نہیں سمجھا۔

”علی یار نے کہا ہے کہ سائیں کے آنے سے پہلے ان کے لیے حقہ تیار کرنا ہے۔“ موہنی نے ایسے کہا جیسے خود سے بات کر رہی ہو۔

مزار کے بہت سے چھوٹے چھوٹے کاموں کے ساتھ، سائیں کے حقے کا خیال بھی وہ اپنی رضا اور خوشی سے رکھتی تھی۔ اسی لیے اسے خاص درجہ اور مقام ملا ہوا تھا جو بہت سے لوگوں سے ہضم نہیں ہوتا تھا۔ وہ اس سرخ اینٹوں سے بنی کچی پکی درگاہ میں ایک سال پہلے آئی تھی مگر کہاں سے آئی، یہ کوئی نہیں جانتا تھا۔ کچھ

عرصہ پہلے ہی اس مزار کا ایک مخصوص حصہ بے سہارا اور مسافر عورتوں کے لیے مختص کر دیا گیا۔ جہاں اس کا قیام تھا اور ان کی ذمہ داری علی یار اور سائیں پر تھی جسے وہ بخوبی نبھا رہے تھے۔

پکے سانولے رنگ کا علی یار اس مزار میں کئی سالوں سے مجاوری کے فرائض سر انجام دے رہا تھا۔ اس کی چھوٹی چھوٹی آنکھیں ہر وقت متحرک رہتی تھیں۔ وہ درگاہ پر آنے والے سب لوگوں پر نظر رکھتا تھا۔ پہلے پہل یہ مزار اپنی خستہ حالی اور شہر سے کچھ دور ہونے کی وجہ سے اکثر خالی اور ویران پڑا رہتا مگر جب سے سائیں نے یہاں آنا شروع کیا تھا، مزار کی رونق اور چہل پہل بہت بڑھ گئی تھی۔

لوگ سائیں سے ملنے کے شوق میں چلے آتے مگر سائیں یہاں صرف رات گزارنے آتا تھا۔ باقی کا دن محنت مزدوری کر کے یا خلق خدا کی خدمت کرتے گزار دیتا تھا مگر علی یار کی درخواست پر اس نے جمعرات کا دن مزار پر گزارنا شروع کر دیا تھا جہاں لوگ جوق در جوق اس سے ملنے آتے تھے مگر سائیں ان سے بے پروا صرف محفل سماع میں گم نظر آتا تھا۔

سائیں کے آنے سے مزار کی حالت بہت بہتر ہو گئی تھی۔ سائیں نے بے سہارا اور مجبور عورتوں اور بچوں کی کفالت کی ذمہ داری نبھانے کے لیے مزار کا ایک

مخصوص حصہ ان کے لیے مخصوص کر دیا تھا۔ جہاں ابھی تھوڑی تعداد میں خواتین اپنی بچوں کے ساتھ موجود تھیں۔ یہ وہ خواتین تھیں جنہیں گھر والوں نے کسی نہ کسی وجہ سے دھتکار دیا تھا جو اپنے گھر والوں پر بوجھ تھیں۔ جنہیں معاشرے میں سر چھپانے کے لیے کوئی محفوظ ٹھکانہ نہیں ملا تھا۔ علی یار اپنے بیوی بچوں کے ساتھ مزار کے پیچھے بنے چھوٹے سے کوارٹر میں رہتا تھا اور ان سب کی نگرانی بہت دھیان سے کرتا تھا۔ موہنی پر اس کی نظر کرم خاص طور پر تھی۔ موہنی اس کی بیوی کے ساتھ مل کر مختلف کام سرانجام دے دیتی جن میں سے ایک کام جمعرات والے دن مزار پر آئے کچھ خاص لوگوں کے لیے حقہ بنانے کا بھی تھا۔ وہ ہر کام میں پیش پیش ہوتی جس سے پیو کو بہت تکلیف اور جلن محسوس ہوتی تھی۔ سائیں کون تھا اور کہاں سے آیا تھا۔ یہ کسی کو نہیں پتا تھا۔ اس کی کہانی بھی بہت دل چسپ ہے۔ وہ ایک دن لٹے، تھکے ہارے مسافر کی حیثیت سے وہاں پہنچا تھا۔ علاقے کے لوگوں نے اپنی روایت کے مطابق اس کی مہمان داری کی۔

اگلے دن اس نے مفت میں کھانا لینے سے انکار کر دیا اور اپنے لیے کام ڈھونڈنے لگا۔ دن بھر شہر میں مختلف کام کرتے گزارتا، رات کو روکھی سوکھی کھا کر مزار کے ویران کونے میں خاموش بیٹھ جاتا۔ علی یار کو اس کی خاموشی اور پراسرار شخصیت

نے اپنی طرف متوجہ کر لیا تھا۔ پھر ایک دن محفل سماع میں بے خود ہو کر اس نے ایسی دھمال ڈالی کہ دیکھنے والے دنگ رہ گئے۔

وگ اس کے بارے میں جاننے کے لیے پر تجسس ہو گئے۔ اپنی دوریش فطرت اور پراسرار شخصیت کی وجہ سے وہ ایک دم لوگوں میں مشہور ہونے لگا۔ بہت سی ضعیف الاعتقاد عورتیں اس کے حلیے کو دیکھ کر دعا کا کہتیں۔ تعویذ مانگتیں۔ وہ ان کی بات سن کر مسکراتا اور ہاتھ اٹھا کر دعا کر دیتا۔ نہ جانے یہ اتفاق تھا کہ سچ میں اسے کوئی فیض ملا ہوا تھا، اس کی دعائیں قبولیت کا درجہ پانے لگیں اور لوگوں میں سائیں کے نام سے مشہور ہو گیا۔ لوگ اس کے آگے پیچھے پھرنے لگے۔ اس کے آنے کے اسی سال علاقے میں بارش ہوئی اور ہر طرف ہریالی ہی ہریالی ہو گئی۔ سب لوگ اسے اس کی کرامت سمجھنے لگے۔ ورنہ پچھلے کئی سالوں سے بارشیں نہ ہونے سے فصلوں کو بہت نقصان ہوا تھا۔ وہ من موبجی تھا۔ کبھی موچی کے پاس بیٹھا اس سے جوتے گانٹھنا سیکھ رہا ہوتا، کبھی مزدور بن کر سامان لاد رہا ہوتا، کبھی مٹی کے برتن بنانے کے لیے کمہار کے پاس پہنچا ہوتا۔ اس کے علاوہ وہ لوگوں کے مختلف چھوٹے بڑے کام کر دیتا جس سے خوش ہو کر لوگ اسے دعا دیتے۔ وہ کسی سے کچھ نہیں لیتا تھا

کوئی صدقہ خیرات نہیں۔ لوگ اس کے پاس آتے بہت سی سوغاتیں لاتے مگر وہ نرمی سے منع کر دیتا اور کہتا کہ

”اپنے آس پاس کے مستحق لوگوں کو دے دو۔ میرے مرشد کہتے ہیں کہ جو جس چیز کا مستحق نہ ہو، اسے اس چیز کو اپنے پاس نہیں رکھنا چاہیے۔“

لوگ اپنے ساتھ لائی سوغاتیں، سائیں کے کہنے پر مزار پر آئے بے سہارا، غریب، نادار لوگوں یا مسافروں میں بانٹ دیتے۔ سائیں کے کہنے پر ہی آہستہ آہستہ اس مزار کا ایک حصہ بے سہارا اور مجبور عورتوں اور بچوں کے لیے مخصوص ہوتا گیا جن کے لنگر کے انتظام میں سائیں کے ساتھ ساتھ اور بہت سے لوگ بھی حصہ ڈالتے تھے۔ اس طرح ایک وسیلہ بن گیا جس سے فیض یاب ہونے والے لوگ بے شمار تھے۔ علی یار نے کئی بار سائیں کو مزار کے پچھلے حصے میں بنے مکان میں رہنے کی دعوت دی۔ کیوں کہ سائیں کی وجہ سے مزار پر آنے اور دعائیں کروانے والے لوگوں کا ہجوم بہت بڑھ گیا تھا۔

مگر سائیں نے نرمی سے منع کر دیا اور کہا۔

”علی یار! مزار نشان والوں کے ہوتے ہیں جب کہ میں ابھی تک بے نشان ہوں۔“

علی یار نے وقتی طور پر اس معاملے میں خاموشی اختیار کر لی مگر وہ سائیں کی قدر اور عزت دل سے کرتا تھا۔

موہنی زنانہ حصے سے نکلتے ہی لمبا سا گھونٹ نکال لیتی۔ مگر پھر بھی اس کے حسن کے جلوے ہر دیکھنے والی آنکھ کو دیوانہ بنا دیتے تھے۔ اس کا سڈول جسم اور کالے لباس سے نظر آتے سفید اور خوبصورت ہاتھ پاؤں بہت سی حریص نگاہوں کو اپنی طرف متوجہ کر لیتے لیکن اس درگاہ میں کسی کی اتنی جرأت نہیں تھی کہ اسے چھیڑتا یا تنگ کرتا۔

”بی بی کتنی بار کہا ہے تجھے زنانہ حصے سے باہر مت آیا کر۔ یہاں طرح طرح کے لوگ آتے ہیں۔ کسی کا کوئی اعتبار نہیں ہے۔ جا اندر چلی جا۔ سائیں نے دیکھا تو غصہ ہوں گے مجھ پر۔“

علی یار نے اس کے ہاتھ سے حقہ لیتے ہوئے سختی سے کہا۔ علی یار کے آخری جملے نے اسے اندر سے مہکا دیا تھا۔

”کیا سائیں نے تجھے خاص میری حفاظت کرنے کو کہا ہے؟“

اس نے فوراً اپنا سر اٹھایا، تو گھونٹ پیچھے کی طرف الٹ گیا۔ اس کی کالی آنکھوں میں اشتیاق کے کئی جگنو اڑ رہے تھے۔ علی یار نے ناگواری سے اس کی طرف دیکھا۔

”پگلی ہے تو! سائیں اس درگاہ میں آنے والی ہر عورت کی فکر اسی طرح کرتا ہے۔ اسی لیے تو سب خود کو یہاں محفوظ سمجھتی ہیں۔ تو نے پہلے ہی ضد کر کے حقہ بنانے کی ذمہ داری اپنے سر لے لی ہے، جب کہ سائیں اس بات کو بھی پسند نہیں کرتے مگر تجھے کون سمجھائے۔“

علی یار نے اپنے سر پر ہاتھ مارتے ہوئے ایسے کہا جیسے اس کی ضد سے عاجز آگیا ہو۔ وہ اداسی سے پلٹ کر جانے لگی جب علی یار نے اسے پکارا تھا۔

”اور سُن اس پیو سے دور رہا کر۔ مجھے اس کے ارادے ٹھیک نہیں لگتے۔ حاسد ہے تیری۔“

اور سائیں کہتے ہیں کہ حاسد کی حسد لاوے کی طرح اندر ہی اندر پکتی رہتی ہے اور پھر ایک دن اچانک سے پھٹ کر باہر نکل آتی ہے۔ سب جلانے اور مٹانے کے لیے۔“

علی یار نے کہا اور وہاں سے چلا گیا۔ جب کہ موہنی گم صم اسے جاتے دیکھتی رہی۔

”تُو کتنا خوش نصیب ہے علی یار۔ جو سائیں کو اتنے پاس سے بولتے ہوئے، بات کرتے ہوئے دیکھ تو لیتا ہے۔ میں پگلی سائیں کی ایک جھلک دیکھنے کے لیے پہروں دھوپ میں کھڑی اپنا رنگ روپ جلاتی رہتی ہوں۔“

کیا تجھے تیرے سائیں نے یہ نہیں بتایا کی جنہیں عشق کی آگ چھو لے، انھیں پھر کوئی اور آگ نہیں جلاتی۔“

منگ منگ مگتی، گلی گلی میں۔

تُو صاحبِ دستار پیلا۔

اندر باہر مندا، گندا میرا۔

تُو سر تا پا نکھار پیلا۔

جند تڑپے میری، جاں میری تڑپے۔

تُو ہے روح کا قرار پیلا۔

گدی پہ عشق کی تُو بیٹھا۔

میں بھٹکوں ہر ہر دوار پیلا۔

کنیز بنا کر اپنا لے مجھے۔

بن میرا بھی خریدار پیلا۔

☆...☆...☆

”واٹ ریش! تمہارے دوست کا دماغ تو ٹھیک ہے؟ وہ کون ہوتا ہے مجھ پر اس طرح کی پابندی لگانے والا؟ اگر تمہیں یاد نہیں تو میں یاد کروا دوں کہ ڈریم

انٹرنیشنل سے ہوا، میرا معاہدہ، دو مہینے پہلے ختم ہو چکا ہے۔ اب میں آزاد ہوں کسی کے ساتھ بھی نیا معاہدہ سائن کر سکتی ہوں۔ اس کے لیے مجھے کسی ایرے غیرے کی اجازت کی ضرورت نہیں ہے۔

فارینہ جو پہلے بہت خوش گوار موڈ میں شہرام کے ساتھ ڈنر کرنے آئی تھی۔ باتوں ہی باتوں میں شہرام نے ہنستے ہوئے ایڈم سے ہوئی اپنی گفتگو کا ذکر کیا، جسے سنتے ہی فارینہ آگ بگولا ہو گئی۔ حالاں کہ ایڈم نے صرف اپنی رائے کا اظہار کیا تھا۔ فارینہ پر کسی طرح کی پابندی نہیں لگائی تھی مگر نہ جانے کیوں فارینہ ایڈم کا نام سنتے ہی چڑجاتی اور اسی لیے اس کی صحیح باتوں پر بھی برا مان جاتی تھی۔

شہرام نے کھانے سے ہاتھ روک کر حیرت سے اس کے خوبصورت چہرے کے بگڑے زاویوں کو دیکھا۔ فارینہ کا اتنا غصہ اس کی سمجھ سے باہر تھا۔ ایک دم ہی وہ پریشان ہو کر بولا۔

”فارینہ تم ٹھیک ہو؟“

فارینہ نے چونک کر اس کی گہری آنکھوں میں دیکھا۔ جہاں فکر مندی کے ساتھ ساتھ اپنے پن کا جذبہ بہت واضح تھا اور یہ اپنا پن کسی بہت اپنے کے لیے ہی دل سے آنکھوں تک کا فاصلہ طے کرتا ہے۔ فارینہ نے بے ساختہ نظریں چرائی

تھیں۔ شہرام اسے بھی پسند تھا مگر اس سے آگے کا ابھی اس نے نہیں سوچا تھا اور نہ ہی وہ سوچنا چاہتی تھی۔ ابھی تو اس نے اڑنا سیکھا اور شہرت کا ذائقہ چکھا تھا۔ وہ بھلا کیسے اتنی آسانی سے کسی پنجرے میں قید ہو جاتی؟

”میں ٹھیک ہوں۔“ فارینہ نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا اور میز پر رکھا پانی کا گلاس اٹھا کر اپنے نرم و نازک لبوں سے لگا لیا۔

”پھر اتنے غصے کی وجہ؟ تم اچھی طرح سے جانتی ہو کہ ایڈم اپنے کام سے کام رکھنے والا، بے ضرر سا بندہ ہے۔ وہ اپنے کام سے عشق کرتا ہے اور اسی وجہ سے مختلف تجربات کرتا رہتا ہے۔ اس نے تمہارے نئے پروجیکٹ کے بارے میں ایک رائے، اپنے تجربے کی بنیاد پر دی تھی۔

وہ نیوون انٹرنیشنل کے مالک فیصل آفندی کو بہت پہلے سے جانتا ہے اور یہ تو تمہیں بھی پتا ہو گا کہ اس کی شہرت اتنی اچھی نہیں ہے۔ پھر تم یہ رسک کیوں لینا چاہ رہی ہو؟“

شہرام نے سنجیدگی سے سوال کیا۔ فارینہ سر جھٹک کر رہ گئی۔

”کامیابی کے لیے رسک تو لینا ہی پڑتا ہے شہرام۔ اس بار نیوٹرن انٹرٹینمنٹ غیر ملکی ٹیم کے ساتھ مل کر ایک میگا پروجیکٹ پر کام کر رہی ہے اور میرے خیال میں یہ بہت بڑا چانس ہے، خود کو منوانے کا۔“

فارینہ کی خوبصورت آنکھوں کی چمک بڑھ گئی تھی۔ شہرام گہری سانس لے کر رہ گیا۔

”فارینہ تم نے کبھی ایک چھوٹے سے، خوب صورت گھر کا خواب دیکھا ہے؟“

شہرام نے اچانک سوال کیا۔ فارینہ حیرت سے اسے دیکھنے لگی۔

”اگر ایسا کوئی خواب تمہاری خوب صورت آنکھوں میں سویا جاگتا، ادھ کھلی آنکھوں سے اپنی خواہش کے منظر سجانے لگے، تو مجھے آواز دے لینا۔ کیوں کہ ایسا ہی ایک خواب، تم سے ملنے کے بعد میری آنکھوں میں، خواہشوں کے کئی منظر سجانے لگا ہے۔“

شہرام نے اس کے خوبصورت چہرے کو اپنی نظروں میں قید کرتے ہوئے کہا۔

فارینہ اتنے خوبصورت اظہار پر دنگ رہ گئی۔ شہرام نے گم صم سی، سنگ مرمر کی مورت کی طرف دیکھا۔ وہ اپنے احساس سے چھو کر اسے مورت سے پری بنانا چاہتا تھا۔

مگر محبت میں ”چاہت“ اپنی خوشی اور خواہش کی نہیں ہوتی، بلکہ محبوب کی خوشی اور خواہش کی ہوتی ہے۔

محبوب مان رکھ لے، تو اُس کی کرم نوازی۔

نہ رکھے، تو اُس کی ادائیں۔

اور کرم نوازی ہمیشہ نصیب والوں پر ہوتی ہے، جب کہ یہ بھی سچ ہے کہ محبت میں سب کچھ ساتھ دیتا ہے، سوائے نصیب کے۔

ماضی کے پردے سے ایک یاد نے اس کے دل پر پھر دستک دی تھی۔ وہ بھی تو کم نصیب لوگوں میں سے تھا جن پر محبت مہربان نہیں ہوئی تھی۔ شہرام نے اپنی رسٹ وائچ میں وقت دیکھا۔ رات کے تین بج رہے تھے۔ آج پھر اسے سوچتے، ساری رات گزر گئی۔ کل صبح سے شوٹنگ کا آغاز کرنا تھا مگر وہ ایسے بد دل اور اداس بیٹھا تھا جیسے اسے آنے والی کسی کامیابی سے کوئی فرق نہیں پڑتا ہے کچھ دیر اسی حالت میں بیٹھنے کے بعد وہ اٹھا۔ تیز والیوم میں میوزک لگا کر ایکسر سائز کرنے لگا۔ کچھ دیر بعد اس کا ذہن ہر قسم کے بوجھ اور پریشانی سے آزاد ہو چکا تھا اور وہ اپنے نئے کام کے لیے پوری طرح چاق چوبند اور فریش تھا۔

”کس لیے تشریف لائے ہیں آپ؟“

خان زادہ شمشیر نے نظر اٹھا کر اپنے سامنے بے نیازی سے بیٹھے سائیں کو دیکھا۔ اس کے چہرے پر وہی نرم سا تاثر تھا مگر دوپہر کی نسبت، اس کے کپڑے صاف اور حلیہ بہتر تھا۔ نہانے سے اس کے چہرے پر تازگی واضح تھی۔ مولوی عبداللہ سے ملاقات کے بعد خان زادہ شمشیر نے سائیں سے ملنے کی درخواست کی تھی۔ عصر کی نماز کے بعد سائیں مولوی عبداللہ کی بیٹھک میں موجود تھا اور خان زادہ شمشیر بھی وہاں آگئے۔ پردے کی دوسری طرف نور بانو اور اماں رحیمہ بھی موجود تھیں۔ نڈھال سا خان زادہ احمد باپ کی پشت سے ٹیک لگائے آنکھیں موندے بیٹھا تھا۔

”کس لیے لوگ آتے ہیں آپ کے پاس؟“

خان زادہ شمشیر نے تیکھے لہجے میں سوال کیا۔ پردے کے دوسری طرف بیٹھی نور بانو نے بے چینی سے اماں رحیمہ کے طرف دیکھا۔ جیسے اسے خدشہ ہو کہ خان زادہ شمشیر کا تیکھا انداز سائیں کو ناراض کر دے گا۔ اماں رحیمہ نے اس کے ہاتھ پر اپنا کمزور ہاتھ رکھ کر تسلی دی۔

”ہوں! سوالی بھی ہو اور سوال بھی نہیں کرنا چاہتے۔“

سائیں نے کچھ سوچتے ہوئے مسکرا کر سر اثبات میں ہلایا۔

”میرے مرشد کہتے ہیں کہ جس در پر جھولی پھیلانے کے لیے دستک دی جاتی ہے۔ اس سے پہلے، اس کے دروازے پر ہی انا کے سب بت توڑ دینے چاہئیں۔ نہیں تو جھولی پھیلانے کی ذلت بھی اٹھانی پڑتی ہے اور خالی ہاتھ رہ جانے کا دکھ بھی جان کو لگ جاتا ہے۔“

سائیں نے کہا، تو خان زادہ شمشیر نے کچھ کہنے کے لیے پر تولے ہی تھے، جب نور بانو ایک دم بول پڑیں۔

”سائیں! دراصل میرا بیٹا بہت بیمار ہے۔ ہم نے ڈاکٹری سے لے کر ہر علاج کروایا ہے مگر کسی کو کچھ سمجھ نہیں آئی۔ ڈاکٹر کہتے ہیں کہ سب رپورٹس ٹھیک ہیں۔ ہمارا ایک ہی بیٹا ہے جس کے لیے ہم نے ہر در کی خاک چھان لی ہے مگر سوائے سوال کرنے اور ذلت کے کچھ حاصل نہیں ہوا۔ آپ کے بارے میں سنا، تو دوڑے چلے آئے کہ شاید۔“

ہم اسی لیے آپ کے در پر حاضر ہوئے ہیں۔“

سائیں نے سر جھکا کر پوری بات سنی تھی۔ پھر اپنا جھکا ہوا سر اٹھا کر بولا۔

”ہر چیز میرے رب کے حکم سے ہے۔ ہم انسان اس کی رضا کے آگے بہت مجبور اور بے بس ہیں۔ یہ بھی اس ذات کا احسان ہے کہ اس نے مجھے اتنی عزت بخشی،

مگر میں کچھ بھی نہیں ہوں۔ آپ کی طرح ہی بہت بے بس اور مجبور ہوں۔ ہاں جو میرے بس میں ہے وہ میں ضرور کروں گا اور آپ سے بھی یہ ہی کہوں گا کہ کبھی بھی اس کی ذات سے مایوس ہو کر دعا کا دامن مت چھوڑیئے کہ دعا ہی معجزوں کی کنجی ہے۔

میں آپ کے بیٹے کے لیے ضرور دعا کروں گا۔ مجھے یقین ہے میرا رب میری دعا ضرور سنے گا۔

سائیں نے ایک نظر خان زادہ شمشیر کے ساتھ بیٹھے، اس کے بیٹے پر ڈالی اور پھر دعا کے لیے ہاتھ اٹھا دیے۔

”سائیں! میرا بیٹا کسی دوا، کسی دعا سے ٹھیک نہیں ہو رہا۔ پچھلے کئی مہینوں سے اس کی حالت ایسی ہی ہے۔ اسے دیکھ دیکھ کر میرا دل دکھ کے کسی پاتال میں اتر کر دھڑکتا، تو ہے مگر اس میں زندگی کی کوئی رمق نہیں رہی ہے۔ دعا کریں سائیں ایک ماں کے دل کو سکون مل جائے۔“

نور بانو بلک بلک کر رو رہی تھی۔ سائیں کی آنکھیں بھی نم ہو گئیں۔ اس نے گردن موڑ کر پردے کی طرف دیکھا جس کے پیچھے وہ ماں تھی جو اپنے بچے کی تکلیف پر رو رہی تھی۔ اسی وقت نور بانو کی نظر بھی اس کے چہرے پر پڑی، تو وہ چونک گئی

اس کا دل بہت زور سے دھڑکا تھا۔ اسی وقت سائیں نے رُخ موڑ لیا اور سر جھکا کر دھیمے لہجے میں بولا۔

”خوش نصیب ہے آپ کا بیٹا جس کے پیچھے رونے اور دعا کرنے والے اتنے مہربان اور سچے رشتے موجود ہیں۔ بے فکر رہیں۔ اللہ اپنے بندوں پر بہت مہربان ہے۔ ماں جی۔۔۔“

سائیں ایک دم سے رکا۔ ماں کہتے کہتے اسے عجیب سا لگا۔ نور بانو نے بھی اس کا رکنا اور جھجکنا محسوس کر لیا تھا۔

”کچھ لوگوں کے منہ سے ماں سن کر اپنے پن کی خوشبو آتی ہے بیٹا۔ مجھے اچھا لگے گا اگر اپنے پن کی یہ خوشبو ہمیشہ آپ کے پاس سے آتی رہے۔“

نور بانو نے نرمی سے کہا، تو خان زادہ شمشیر نے حیرت سے پردے کی طرف دیکھا۔ ”میں اس مہربانی کے لیے شکر گزار ہوں۔ لگتا ہے آپ لوگ خود دینے والوں میں سے ہیں۔“

سائیں نے سر اٹھا کر خان زادہ شمشیر کی طرف دیکھا۔ ان کے چہرے پر بے بس سا تاثر تھا، وہ گہری سانس لے کر بولے۔

”اگر وقت کا چکر، دینے والوں کو، مانگنے والوں میں ملا دے، تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ یا تو قدرت انہیں آزما رہی ہے یا وہ اپنے کسی عمل کا خمیازہ بھگت رہے ہیں۔“

”اگر سودوزیاں کا حساب کرنا آجائے تو سمجھ لیں کہ ابھی اس ذات کی نظر کرم آپ پر سے نہیں ہٹی۔ امید وہ ڈور ہے جو مشکل سے مشکل حالات میں بھی آپ کو اس ذات سے باندھے رکھتی ہے۔“

سائیں نے مطمئن انداز میں کہا خان زادہ شمشیر نے گہری نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

”اگر میرا اندازہ غلط نہیں تو آپ کی عمر سے بڑی آپ کی سوچ ہے۔“

”نہیں!“ سائیں نے آزرده لہجے میں بہت آہستگی سے کہا۔

”میری عمر سے بہت بڑا اور گہرا ہے عشق میرا۔ اس نے گلیوں گلیوں کی خاک چھاننے پر مجبور کر دیا ہے۔“

کوئی شخص کب سے بسا ہوا مرے شہر جاں میں عجیب ہے

جو خزاں کی راہ میں یار ہے، جو گلاب رُت میں رقیب ہے

میں چراغ بن کے جلوں تو کیا، سر شاخ سبز کھلوں تو کیا

یہ ہوا جو میرے جلوں میں ہے، یہ زیاں جو میرا نصیب ہے

نہ کوئی کرن میری راہ میں، نہ وہ چاند چہرہ نگاہ میں

میرا دشت کتنا طویل ہے، مری رات کتنی مہیب ہے

وہ قریب تھا تو نظر میں تھا کئی آسمانوں کا فاصلہ

وہ جو مجھ سے دور چلا گیا تو کھلا کہ کتنا قریب ہے

مری شاعری، مری داستاں، ہے بنائے رنجش دوستاں

میرا فن نہیں مرا چارہ گر، مرے واسطے یہ صلیب ہے

سائیں کے لہجے میں سوز تھا، درد تھا، تپش تھی۔ ایک بے بسی، ایک نارسائی، اس کے لفظوں سے جھلک رہی تھی۔

خان زادہ شمشیر نے اس کے لہجے کی اداسی اور اس کی آنکھوں میں بسی تڑپ دیکھی تو گہری سانس لے کر رہ گئے۔

ہم سب ہی کہیں نہ کہیں، کسی نہ کسی کے لیے اسی طرح بے بس اور مجبور ہوتے ہیں۔

☆...☆...☆

ایڈم نے بڑے سے پلازے کے پارکنگ ایریا میں کار کھڑی کی۔ جیسے ہی وہ کار لاک کر کے باہر نکلا، ایک دم ایک مردانہ ہاتھ اس کے سامنے پھیلا۔ ایڈم چونک کر

رک گیا اور سر اٹھا کر دیکھا، تو سامنے تیز رنگ کے کپڑوں میں، گہرا میک اپ کیے، سلیقے سے بال بنائے، وہ دعائیں دیتا مانگ رہا تھا۔

”بابو اللہ تجھے بہت دے گا۔ صائمہ کی دعا لے جا۔ کبھی نامراد نہیں رہے گا۔“

اس خواجہ سرانے اتنے یقین سے کہا کہ ایڈم کے چہرے پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔ یہاں رہتے ہوئے اس نے اردو زبان بہت تیزی سے سیکھی تھی۔ اردو وہ پہلے بھی بول اور سمجھ لیتا تھا۔ اس لیے اس کا لب و لہجہ بہت اچھا تھا۔

”اللہ کون؟“

ایڈم نے پوچھا تو سامنے کھڑا خواجہ سر اپنی جگہ اچھل کر رہ گیا۔

”میں مر گئی! توبہ کر و بابو۔ ایسی بات مذاق میں بھی نہیں کہتے جو اسے نہیں مانتا، وہ پھر کچھ بھی نہیں جانتا۔ جا، بابو تجھ سے لیا، تو کہیں میں بھی گناہ گار نہ ٹھہروں۔“

خواجہ سرانے ناراضی سے کہا اور وہاں سے چلا گیا۔ ایڈم نے سر جھٹکا اور چند قدم آگے بڑھا ہی تھا کہ کسی چیز سے ٹھوکر کھا کر منہ کے بل گرا۔

اس کے سامنے کا ہونٹ پھٹ گیا اور اس سے خون رسنے لگا۔

”واٹ دا ہیل از روئنگ؟“

ایڈم نے غصے سے جھنجھلا کر کہا اور کپڑے جھاڑتا اٹھ کھڑا ہوا۔

”اب تمہیں جواب مل گیا کہ اللہ کون ہے؟“

اس نے اپنے عقب میں آواز سنی تو فوراً پلٹا۔

لال رنگ کے کپڑوں میں ملبوس، سر پر لال اور ہرے رنگ کا صافہ باندھے، گلے میں مختلف رنگوں اور جسامت کی مالائیں، کمر کے دائیں طرف کالے رنگ کا کشتول بھی لٹکا ہوا، انگلیوں میں مختلف رنگوں کی انگوٹھیاں پہنے، وہ عجیب و غریب شخص سامنے کھڑا مسکرا رہا تھا اور اپنے بائیں ہاتھ میں پکڑا ڈنڈا جس کی لمبائی اس کے سینے سے کچھ نیچے تک تھی اور اس کا اوپر اور نیچے کا سرا گولائی میں تراشا ہوا تھا۔

اس ڈنڈے پر نقش و نگار بھی بنے ہوئے تھے، زمین پر آہستہ سے مار رہا تھا۔

”یہ آج مجھے سب ہی عجیب و غریب حلیے کے لوگ کیوں مل رہے ہیں؟ کیا آپ ایکٹر، میرا مطلب ہے کہ کوئی فنکار ہیں؟ جو اس طرح کا گیٹ اپ بنایا ہوا ہے؟“

ایڈم نے کپڑے جھاڑتے ہوئے، دلچسپی سے پوچھا۔

”فنکار تو ہم سب ہی ہوتے ہیں۔ کیا تم نہیں ہو فنکار؟ تم بھی تو جو نہیں ہو، وہ نظر آنے کی کوشش کرتے ہو۔“

اس شخص نے زمین کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”کیا مطلب؟“ ایڈم نے الجھ کر پوچھا۔

”جلدی کس بات کی ہے۔ بہت سے اسرار ہم سے زیادہ، ہم تک پہنچنے کے لیے بے قرار ہوتے ہیں۔ صبر کرو، ہر سوال کا جواب ملے گا اور بہت جلد۔“

اس شخص نے کہا اور مڑ کر واپس چلا گیا۔ ایڈم نے اسے جاتے ہوئے دیکھا اور سر جھٹک کر پلازے کے مین ڈور کی طرف بڑھا جب پاس ہی سڑک سے گزرتی گاڑی پر اس کی نظر پڑی اور وہ اپنی جگہ کھڑے کا کھڑا رہ گیا۔ وہ لال کپڑوں والا شخص، اس بڑی سی گاڑی کی بیک سیٹ پر بہت شان سے بیٹھا تھا۔ اس کا باوردی ڈرائیور گاڑی چلا رہا تھا۔

”او مائی گاڈ! کیسے ڈرامے باز موجود ہیں یہاں۔ میں نے ٹھیک ہی سنا تھا۔“

ایڈم نے تمسخر سے کہا اور طنزیہ مسکراہٹ چہرے پر سجائے اندر کی طرف بڑھ گیا۔ یہاں رہتے ہوئے وہ بہت سی باتوں اور چیزوں سے واقف ہو چکا تھا۔ اس کی سیکھنے کی قدرتی صلاحیت بہت تیز تھی۔ جتنی جلدی اس نے یہاں کی فلم انڈسٹری سے لے کر فیشن انڈسٹری تک نام بنایا تھا، وہ بہت حیران کن تھا۔ سال میں اس کی فلم تو ایک آتی تھی مگر مختلف ہونے والے فیشن شوز میں اس کی شمولیت لازمی ہوتی تھی۔ وہ ریپ پر ماڈلنگ کرتا بہت سی نظروں کا مرکز بن جاتا تھا۔ اس کی لک لیسٹرن اور ویسٹرن کا ملاپ تھی۔ ڈریس ڈیزائننگ میں مختلف تجربات کرنا اسے ویسے

ہی بہت پسند تھا اور اسی چیز نے اس کے قدم فیشن انڈسٹری میں بھی مضبوطی سے جمائے تھے۔

☆...☆...☆

شہرام کو بالآخر اپنی نئی فلم کے لیے ہیروئن مل ہی گئی۔ اس لیے آج کل وہ شوٹنگ میں بری طرح مصروف تھا۔ شہرام اپنی ٹیم کے ساتھ بیس دن کے لیے ملائیشیا بھی رہ کر آیا تھا۔ اس کی فلم کا ایک حصہ یہاں بھی شوٹ ہوا۔ باقی کام، پاکستان کے نادرن ایریاز میں فلمایا جا رہا تھا۔

وہ اپنے کام سے مطمئن تھا۔ ہر چیز اس کی پسند اور مرضی کے مطابق ہی ہو رہی تھی۔

فلم کی نئی ہیروئن کا تعلق ٹی وی سے تھا۔ نیناں ابھرتی ہوئی، باصلاحیت لڑکی تھی۔ آگے بڑھنے کی لگن کی وجہ سے وہ اپنے کام کے ساتھ بہت سنجیدہ تھی اور اس کی یہ بات شہرام کو بہت پسند آئی تھی۔

انصب کو اتفاقہ طور پر ملنے والی عانیہ سے طوفانی محبت ہو گئی تھی۔ عقل مند لوگوں کی طرح اس نے وقت ضائع کرنے کے بجائے عانیہ کو پرپوز کر دیا تھا۔ اسی کے نتیجے میں بہت جلد ان کی منگنی ہونے والی تھی۔ انصب روز فون کر کے شہرام کو

یاد دہانی کرواتا رہتا۔ وہ ہنس کر حامی بھر لیتا۔ دن بھر کی مصروفیت کے بعد، تنہائی ملتے ہی اس کی سوچ کا پرندہ اُڑ کر ماضی میں پہنچ جاتا۔ جہاں فارینہ کو پرپوز کرنے سے لے کر اس کی اچانک گمشدگی تک کا ہر پل آنکھوں میں گھومنے لگتا۔

آج بھی وہ شوٹ سے جلدی فارغ ہو کر چہل قدمی کرتا قدرت کے حسین رنگوں میں، اپنی محبت کو تلاشتا دور نکل آیا تھا۔

کبھی ان ہی راستوں پر ان دونوں کے نقشِ پا ایک ساتھ بھی پڑے تھے۔ اسے آج بھی وہ شام یاد تھی جب اس نے فارینہ کو بغیر سوچے سمجھے پرپوز کر دیا تھا۔ وہ فارینہ کو دو سالوں سے جانتا تھا۔ اس کے ساتھ کئی چھوٹے بڑے پروجیکٹ پر کام کر چکا تھا۔ اسی دوران اسے احساس ہوا کہ فارینہ کی محبت اس کے اندر جڑ پکڑ چکی ہے۔ لہذا اس نے وقت ضائع کیے بغیر اچانک ہی اسے پرپوز کر کے حیران کر دیا تھا۔ وہ جتنی خوب صورت تھی، اس سے کہیں زیادہ خوب صورت اور معصوم حیران ہو کر لگتی تھی یا شاید اسے ہی ایسا لگا تھا۔ بہر حال جو بھی تھا۔ فارینہ نے اس کے دل میں وہ جگہ اور مقام حاصل کر لیا تھا جو بہت خاص تھا۔ اس لیے پانچ سال گزر جانے کے باوجود بھی وہ اسے نہیں بھول پایا تھا۔ جب کہ زندگی نے کئی بار اسے نئے سے نئے اور خوبصورت راستے دکھائے تھے مگر وہ تھا کہ جیسے کسی سحر میں

بندھا رہ گیا تھا، محبت نے کیسا کالا جادو کیا تھا اس پر کہ وہ اپنی سدھ بدھ کھوتا جا رہا تھا۔ لمحہ بہ لمحہ اپنی ہی ذات کی تہوں میں اترتا، خود ہی سے بیگانہ بن رہا تھا۔ وہ اپنے دل کے ہاتھوں ویسے ہی مجبور تھا جیسے کہ سب ہوتے ہیں۔

اسے وہ خنکی بھری سرد شام بہت اچھی طرح یاد تھی۔ جب شہرام نے فارینہ اور ایڈم کو ایک دوسرے سے الگتے دیکھا تھا۔ دور ہونے کی وجہ سے وہ ان کے چہرے کے تاثرات تو دیکھ سکتا تھا مگر وہ دونوں کس بات پر بحث کر رہے ہیں۔ وہ نہیں سن سکا تھا۔ وہ تیز تیز قدم اٹھاتا ان تک پہنچا تھا، جب فارینہ نے اسے آتے دیکھا۔ اس کی خوب صورت آنکھوں میں یک دم ایک چمک ابھری تھی۔ کسی خیال کی روشنی سے۔

وہ ایڈم کو چھوڑ کر فوراً اس کی طرف لپکی تھی اور بہت ادا سے اس کے بازو میں اپنا بازو ڈال کر بولی۔

”شہرام مجھے تمہارا پرپوزل قبول ہے۔ میری ایک شرط ہے!“

شہرام اس اچانک خوشی کے لیے تیار نہیں تھا۔ اس لیے حیرت سے اسے دیکھتا رہ گیا جو اتنی مہربان اور اس کے اتنے قریب کھڑی تھی۔ پچھلے دو مہینوں سے وہ اس کے پرپوزل کے جواب میں مسلسل خاموش تھی۔ آج ایڈم نے نئے پروجیکٹ پر

ڈسکس کرنے کے لیے انھیں ریستورنٹ بلایا تھا۔ جہاں شہرام کچھ دیر سے پہنچا۔
- شہرام نے خود کو سنبھالتے ہوئے پوچھا تھا۔

”کیسی شرط فارینہ؟“

”ہم شادی اس مہینے کے اینڈ تک کریں گے۔ بولو منظور ہے؟“

لفظوں کے برعکس فارینہ کا لہجہ سپاٹ تھا۔

”مجھے منظور ہے۔ یہ میری خوش نصیبی ہے کہ مجھے میری محبت مل جائے گی۔“

شہرام نے کہا، تو فارینہ نے اس کے کندھے پر اپنا سر اٹکا دیا۔

اس وقت شہرام نے خود کو دنیا کا امیر ترین آدمی سمجھا جس کے پاس اور قریب محبت ہو وہ خوش نصیب ہی تو تھا۔

جب کہ فارینہ طنزیہ نظروں سے سفید چہرہ لیے کھڑے ایڈم کو دیکھ رہی تھی۔ اس کی نظروں میں فاتحانہ چمک تھی۔

ایڈم نے خود کو سنبھالا اور چہرے پر مسکراہٹ سجائے آگے بڑھ گیا۔

”لگتا ہے کہ مجھے اپنے نئے پروجیکٹ کے لیے اب کسی اور کو ڈھونڈنا پڑے گا۔“

”ہاں یار! مگر تم فکر مت کرو۔ میں تمہارے ساتھ ہوں۔ یہ بتاؤ کہ اس بار بہت دن لگا دیے تم نے امریکا میں۔ کوئی مسئلہ تو نہیں تھا؟“ شہرام ایڈم سے ہاتھ ملاتے ہوئے اس کے گلے لگ گیا اور اس سے الگ ہوتے ہوئے فکر مندی سے پوچھا۔

ایڈم بے ساختہ ہنس پڑا۔ شہرام دلچسپی سے اسے سرتاپا دیکھتا رہا۔

کندھے سے نیچے آتے بالوں کی پونی بنائے، ٹائٹ جینز اور ہاف بازو شرٹ میں اس کے مسلسل واضح ہو رہے تھے۔ چہرے پر ہلکی ہلکی بڑھی شیو اور سر کے بالوں اور ڈاڑھی کا رنگ سنہرا تھا۔ اس کے تیکھے نین نقش اور رنگ سرخ و سفید تھا۔ ایڈم کے پیروں پر نظر پڑتے ہی شہرام کی مسکراہٹ گہری ہو گئی۔ اس نے لال رنگ کے کیٹس شوز پہنے ہوئے تھے اور سفید اور لال رنگ ہی اس کی شرٹ میں نمایاں تھے۔

”یار تم جو بھی پہن لو جیتا ہے تم پر“...

شہرام نے کھلے دل سے اس کی تعریف کی۔

”نہیں یار! سب کچھ تو نہیں جیتا مجھ پر...

محبت کو ہی دیکھ لو۔ اس کا کوئی رنگ مجھ پر نہیں چلتا...

مجھے نہیں رنگتا، مجھے نہیں اپناتا...

کیوں ایسا ہی ہے نا فارینہ؟”

ایڈم نے بظاہر سرسری سے لہجے میں پوچھا، مگر اس کی لہجے میں تپش تھی، دکھ تھا، نارسائی کا خوف تھا۔

”ہونہہ! ہر کوئی محبت کے قابل بھی نہیں ہوتا، مسٹر ایڈم۔ یہ رنگ سب کے لیے نہیں ہوتا، اسی لیے سب پر نہیں چلتا۔“

فارینہ نے تیکھے انداز سے کہا۔

”ایسا مت کہو فارینہ! ایک محبت ہی تو انسان کے رنگ، نسل، ذات، میں جمع یا تفریق نہیں کرتی۔ کائنات میں ایک محبت ہی تو ہے جو سب کو اپنے رنگ کا رنگنے میں ہنر اور سلیقہ جانتی ہے۔“

ایڈم نے اس کی طرف ایسے دیکھا، جیسے التجا کر رہا ہو۔

”بکواس ہے سب۔“

یک دم ہی فارینہ بولی۔ شہرام نے بات بگڑتے دیکھی تو فوراً بولا۔

”تم دونوں کبھی بھی ایک نقطے پر متفق نہیں ہو سکتے ہو۔ لہذا اس بحث کو رہنے دو۔ چلو آج کا دن سیلیبریٹ کرتے ہیں۔“

شہرام نے خوشگوار موڈ میں کہا اور فارینہ کا ہاتھ پکڑ کر آگے بڑھ گیا۔ ایڈم اسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔

”ہم جس نقطے پر کبھی متفق ہوئے تو وہ صرف ایک ہی ہوگا۔“

”محبت کا“...

ایڈم نے خود کلامی کی۔ اس کی آنکھوں میں عزم تھا۔ ایک عہد تھا۔

شہرام کو چلتے ہوئے ٹھوکر لگی، تو وہ بے اختیار ماضی سے حال میں پلٹ آیا۔ اس وقت اسے احساس نہیں ہوا مگر آج جب اس نے سوچ کے پانی سے ماضی کا چہرہ دھویا، تو اسے لگا کہ کچھ ایسا ضرور تھا جو فارینہ اور ایڈم کے درمیان ناراضی کی وجہ بنا رہا۔ فارینہ کی ایڈم سے چڑکی کوئی نہ کوئی وجہ ضرور تھی۔ جب کہ ایڈم کا رویہ بھی نارمل نہیں تھا۔

”کیا ایڈم بھی فارینہ سے محبت کرتا تھا؟“

یہ خیال آتے ہی شہرام کے قدم رک گئے۔ سبز درختوں کے نیچے نارنجی سورج شام کے الوداعی لمحات اپنے دامن میں سمیٹے ڈوب رہا تھا۔

”حیرت ہے یہ خیال مجھے تب کیوں نہیں آیا؟“

شہرام خود سے ہم کلام تھا۔

”تب کیا مجھے کبھی بھی یہ خیال کیوں نہیں آیا۔ کیا ایڈم کے امریکا جانے اور کبھی نہ پلٹنے کی وجہ یہی تھی؟ میری اور فارینہ کی اچانک ہونے والی شادی؟ مگر پھر فارینہ کیوں بغیر کچھ کہے، بغیر کچھ بتائے مجھے یوں چھوڑ کر چلی گئی کہ میں اسی کے جواب ڈھونڈتا ڈھونڈتا، خود بھی کھونے لگا ہوں۔“ شہرام نے تھک کر خود کلامی کی اور بوجھل قدم اٹھاتا، ریسٹ ہائوس کی طرف بڑھ گیا جہاں اس کا اپنی ٹیم کے ساتھ قیام تھا۔

☆...☆...☆

”تم یہ کام خود کیوں کرتے ہو؟ تم چاہو تو آرام سے بیٹھ سکتے ہو۔ بہت سے لوگ تمہاری مریدی میں آنا پسند کریں گے!“

تیز دھوپ میں ایندھن کے لیے لکڑیاں کاٹ کر ایک طرف رکھتے سائیں کو دیکھتے خان زادہ شمشیر نے پاس آکر کہا۔ سائیں کام سے فارغ ہو کر اپنی مخصوص جگہ آ بیٹھا اور اپنے کندھے پر رکھے رومال سے پسینا صاف کر رہا تھا خان زادہ شمشیر کی آواز پر چونک کر ان کی طرف متوجہ ہوا جو اس کے پاس کھڑے بہت غور سے اسے دیکھ رہے تھے۔

”آپ یہاں؟“ سائیں نے حیرت سے سوال کیا۔ یہ خاموش اور الگ تھلگ سا گوشہ اس نعمت خانے کی پچھلی طرف تھا جہاں گھنے برگد کے نیچے بیٹھنا، سامنے کچھ دور بہتی نہر کے پرسکون پانی کو دیکھنا اور وقت گزارنا سائیں کا من پسند مشغلہ تھا۔

”دیکھ لو تمہیں ڈھونڈ ہی لیا میں نے۔“

خان زادہ شمشیر نے شگفتہ لہجے میں کہا اور کچھ فاصلے پر کھڑے ڈرائیور کو واپس جانے کا اشارہ کیا۔ وہ سر جھکا کر چلا گیا۔

”حیرت ہے۔ مجھے آج پتا چلا کہ میں گم شدہ ہوں۔“

سائیں نے بھی مسکرا کر نرمی سے کہا۔ اسے خان زادہ شمشیر کی بزرگی اور بڑھاپے سے دلی ہمدردی تھی جو اس عمر میں بیٹے کی بیماری کی وجہ سے خوار ہو رہے تھے۔

”تم نے میری بات کا جواب نہیں دیا بر خودار!“ خان زادہ شمشیر نے رعب جماتے ہوئے پوچھا، تو سائیں ان کے انداز پر زیر لب مسکرا کر رہ گیا۔

”مرید، پیروں کے ہوتے ہیں، گدی نشینوں کے! میں تو خاک نشین ہوں صاحب!“

میری کیا پیری اور مریدی ہونی ہے۔“

سائیں نے بہتی نہر کے پانی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”مگر جو فیض تمہارے پاس ہے وہ بھی جھوٹ نہیں ہے سائیں۔ اسے خلقِ خدا کی خدمت کے لیے استعمال کرو! اس میں تمہارا بھی بھلا ہے۔“ خان زادہ شمشیر نے سنجیدگی سے مشورہ دیا۔

”کیسا فیض خان زادہ صاحب؟“ سائیں نے ایکپتھر اٹھا کر نہر میں پھینکا۔ تھوڑا سا پانی اچھلا، بے سکون ہوا اور پھر سے پرسکون ہو کر رواں دواں، اپنی ڈگر پر چل پڑا۔

”بس ایسا ہی معاملہ ہے میرا بھی! اس ذات کی نظر پڑتی ہے، تو ذرا دیر کے لیے پانی کی طرح اچھلتا ہوں، اوقات سے باہر ہونے سے پہلے ہی وہ ذات اپنے اصل کی طرف لوٹا دیتی ہے۔ بس وہ لمحہ ہوتا ہے جب پانی کی طرح اچھلتا ہوں، تو لوگوں کی نظروں میں آجاتا ہوں مگر سچ تو یہ ہے کہ بس اس ذات کا کرم ہے جو عزت رکھ لیتا ہے۔

جو عزتوں کا مالک ہے! جو غفار ہے، جو رحیم ہے، جو رحمان ہے۔ وہی تو مالکِ کائنات ہے، اسی کے سب رنگ ہیں اور میں ٹھہرا بے رنگ۔“

سائیں نے عاجزی سے کہا۔

”بے شک! اس میں تو کوئی شک نہیں مگر سائیں یہ فیض بھی تمہیں ہی عطا ہوا ہے اور یہ فیض بھی شاید اسی عاجزی کی وجہ سے ہے جس دن یہ سب چھوڑ دو گے، اس فیض سے بھی محروم ہو جاؤ گے۔“

خان زادہ شمشیر نے نرمی سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

سائیں نے گردن گھما کر پاس کھڑے خان زادہ شمشیر کی طرف دیکھا جن کے لمبے چوڑے وجود کے پیچھے سورج چھپ سا گیا تھا۔

”بس اتنا ہی فرق ہے خان زادہ صاحب۔“ جس طرح اس وقت آپ تپتے سورج اور میرے درمیان حائل ہیں۔ اسی طرح اس ذات کا کرم ہے جس نے اپنی رحمت کا سایہ فراہم کر دیا ہے۔ ورنہ تو میرے گناہ اور اعمال سورج کی طرح ہی جلا کر بھسم کر دینے والے ہیں۔

مجھے معلوم تھا یہ سب، میرا وجدان کہتا تھا...

اک حادثہ درپیش ہونا ہے، مجھے درویش ہونا ہے۔“

سائیں نے آنکھیں بند کرتے ہوئے افسردگی سے کہا۔ اس کی آنکھوں کی نمی بند پلکوں پر ٹھہر گئی تھی۔

خان زادہ شمشیر کا دل عجیب سے احساس سے بھر گیا۔

”یہ شخص اس عمر میں بھی عجز و انکسار کا پیکر بنا در در کی ٹھوکریں کھاتا پھر رہا ہے مگر پھر بھی اپنے کسی عمل یا نیکی پر غرور و تکبر نہیں کرتا۔ بات بات پر جس کی آنکھیں نم ہوتی ہیں، اس کا دل اپنے رب کی رحمت سے لبریز رہتا ہے کیوں کہ آنسو دلوں کو سرسبز و شاداب رکھتے ہیں۔ بلکہ اسی طرح جیسے بارش مردہ زمین کو نمو دیتی ہے۔ آنسو دل کو بنجر اور ویران نہیں ہونے دیتے۔ آنسوؤں کی بارش ہوتی رہے، تو ان دلوں پر مہر نہیں لگتی۔ یہ آنسو ہی تو ہوتے ہیں جن کی زبان سب سے زیادہ تاثیر رکھتی ہے۔

آنسوؤں کی زبان صرف اللہ ہی سمجھ سکتا ہے یا اللہ کے حکم اور کرم سے صرف اللہ والے...

کوئی کیسے بتا سکتا ہے کہ کون کس حد پر آکر، کس بے بسی، کس اذیت کی کند چھری سے ذبح ہو کر بے اختیار ایسے رویا کہ اس کے آنسوؤں اور رب کی رحمت کے درمیان پھر کوئی پردہ حائل نہیں رہتا۔

خان زادہ شمشیر کا دل جس اور گھٹن سے بھر گیا۔ ایسے کہ جیسے کوئی سانس روک رہا ہو۔

”اچانک، ننھے پائوں اور کسی بچے کے رونے کی آواز ان کے اعصاب پر سوار ہونے لگی۔ خود پر باندھے بند ٹوٹنے لگے۔ اپنے گناہ کا بوجھ اٹھاتے اٹھاتے اب وہ خود تھکنے لگے تھے۔ ساری عمر تو گزر گئی تھی۔ اس کا بوجھ اٹھاتے اور خود سے بھاگتے ہوئے۔“

اب رکنے کو دل کرتا تھا۔ کسی کے کندھے پر سر رکھ کر بے تحاشا رونے کو۔ کوئی اللہ والا ایسا ملے جو دکھ کی بوجھل پوٹلی ہلکی کر دے۔ جو انھیں یقین دلا دے کہ اللہ کی رحمت ان سے دور نہیں ہے۔

وہ ذات معاف کر دے گی۔

اگر توبہ سچے دل سے کی جائے۔

آج شدت سے ان کے دل نے خواہش کی تھی کہ نور بانو کی طرح وہ بھی اپنا دل کسی کے سامنے کھول کر رو سکیں۔

بتا سکیں کہ وہ بھی پچھتاوے کی آگ میں جل رہے ہیں۔ راتوں کو کسی کے رونے کی آواز سونے نہیں دیتی۔ مختلف وہم انہیں ستاتے رہتے ہیں۔

ایسے جیسے کوئی کُند چھری سے انھیں روز ذبح کرتا ہے مگر وہ مرتے نہیں تھے۔

پل پل کی یہ اذیت اور تکلیف ان کے لیبیموت سے زیادہ خوفناک اور ناقابل برداشت تھی۔

وہ اندر سے کمزور ہو کر ٹوٹ رہے تھے۔

یا ٹوٹ چکے تھے۔ اسی ٹوٹتی دیوار نے سہارا لیا بھی تو کس کا۔ سائیں کے کندھوں کا۔

جو خود میں گم شدہ جزیرے کی طرح تھا۔

”سب کے نامہ اعمال میں کوئی نہ کوئی ایسا گناہ، ایسی خطا ضرور ہوتی ہے جو ہمیشہ کانٹے کی طرح دل میں چبھتی، تکلیف دیتی اپنے ہونے کا احساس دلاتی رہتی ہے۔“

خان زادہ شمشیر نے افسردگی سے سر جھکا کر کہا اور سائیں کے کندھے کا سہارا لیتے ہوئے اس کے ساتھ ہی بیٹھ گئے۔ سائیں نے بہت غور سے جھکے کندھے، چہرے پر ملال لیے، پروقار شخصیت کے مالک کو دیکھا۔ ان کا سفید لباس اور سفید ڈاڑھی پاکیزگی کی علامت لگتے تھے مگر ان کی آنکھوں میں پھیلا حزن و ملال، ان کے اندرونی طوفان کی خبر دیتا تھا۔

”کوئی دکھ ہے؟“

سائیں نے بے اختیار ہمدردی سے پوچھا۔

”نہیں پچھتاوا، ندامت ... جاننا چاہو گے؟“

خان زادہ شمشیر نے امید بھری نظروں سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

”نہیں...!“ سائیں نے نفی میں سر ہلایا۔

خان زادہ شمشیر کے چہرے پر ایک دم تاریکی چھا گئی۔ ایسے جیسے تیز آندھی میں ان کی امید کا چراغ اچانک بجھ جائے۔

”اچھا۔“

خان زادہ شمشیر نے گہری سانس لی۔

”کسی کے راز کا بوجھ اٹھانا بہت مشکل ہوتا ہے اور میں تو پہلے ہی سے مشکل میں ہوں۔“

سائیں نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے تفصیل سے کہا۔

”مگر نہ جانے کیوں میرا دل کہتا ہے کہ صرف تم ہی اس راز کا بوجھ اٹھا سکتے ہو۔ میرا بوجھ بانٹ سکتے ہو۔“

نہ جانے تمہیں دیکھ کر کیوں آج خود سے ہم کلام ہونے کو دل کیا۔ تم میں ایسا کیا وصف ہے کہ تمہارے سامنے سب درد رونے، دکھ بتانے کو دل کرتا ہے۔

”آخر کیوں؟“

”شاید اس لیے کہ میری آنکھوں نے وہ معجزہ دیکھا ہے جو صرف ناممکنات میں سے تھا۔“

خان زادہ شمشیر کی آنکھوں میں ایک احساس کی بے تحاشا چمک تھی۔ اب کی بار سائیں نے چونک کر ان کے چہرے کی طرف دیکھا۔

کاسہ ذات ہوں

تیری خیرات ہوں

تو سخی، میں گدا

تو کجا...

من کجا...

☆...☆...☆

”تم یہاں بھی پہنچ گئے؟“

الحمر آرت کلچر میں ہونے والی بہت بڑے لیول پرینگ آرٹسٹ نمائش کا آج آخری دن تھا۔ ایڈم نے طلبہ و طالبات کے کام کو بہت سراہا تھا۔ پاکستان میں نئے ابھرتے ٹیلنٹ نے اسے دنگ کر دیا تھا۔ وہ اس پرینگ آرٹسٹ نمائش میں اپنے کچھ دوستوں کے اصرار کرنے پر بہ طور خاص شرکت کرنے آیا تھا۔ یہاں آنے کے لیے اس

نے اپنے حلیے میں کافی تبدیلی کی تھی تاکہ عام لوگ اسے پہچان نہ سکیں اور اس کے پیچھے نہ پڑ جائیں۔ وہ لوگوں میں پاپولر تھا۔ شہرت نے اسے سب میں مقبول بنا دیا تھا۔ دولت کی کمی اسے پہلے بھی نہیں تھی۔

مگر یہاں کام کرنے سے وہ دلی طور پر مطمئن تھا۔ وہ مشہور ڈائریکٹر بھی تھا اور پروڈیوسر بھی۔ اس نے فیشن ڈیزائننگ میں بھی قدم رکھ لیا تھا اور ماڈلنگ میں بھی۔ اس لیے اس کا زیادہ وقت امریکا کے بجائے یہاں گزرنے لگا تھا یہ سب شہرام کہ وجہ سے تھا اگر ایڈم کو اس کا مخلص ساتھ اور دوستی نہ ملتی، تو شاید اس کا اتنی آسانی سے یہاں ایڈجسٹ ہونا ممکن نہیں تھا۔

”ہمیں ضرور اس نئے آئیڈیا پر کام کرنا چاہیے۔“

مختلف پینٹنگز کو دیکھتے، ایک نیا خیال اس کے ذہن میں آیا تو وہ ہجوم سے باہر نکلتا ایک طرف ہوا تاکہ شہرام کو فون کر کے یہاں بلا سکے مگر اس کا فون بزی تھا۔ ایڈم نے موبائل آف کیا تب ہی اس کی نظر سامنے پڑی تو وہ چونک گیا۔ وہی لال رنگ کے کپڑوں والا ملنگ اس کے سامنے کھڑا مسکرا رہا تھا۔

”ناٹ اگین۔“

ایڈم نے منہ ہی منہ میں کہا۔ پھر اس کی طرف دیکھ کر بولا۔

”تم یہاں بھی پہنچ گئے۔“

ایڈم نے طنزیہ لہجے میں پوچھا۔ وہ ملنگ اپنا ڈنڈا زمین پر مار کر بولا۔

”میں تو پہلے ہی سے یہاں ہوں۔ تمہارے پہنچنے کا انتظار کر رہا ہوں۔ تم آؤ گے تو میں آگے جاؤں گا۔“

”تم اس ڈھونگ سے دوسروں کو پاگل بنا سکتے ہو مجھے نہیں۔ لگے رہو۔“

ایڈم نے ناگواری سے کہا۔ اسی وقت اس کا فون بجنے لگا۔ شہرام کانگ کے الفاظ اسکرین پر چمک رہے تھے۔

ایڈم نے فون کان سے لگایا۔

”سوری یار میں اور فارینہ شادی کی شاپنگ کرنے نکلے ہوئے تھے۔ ابھی ڈنر کے

لیے ریسٹورنٹ آئے ہیں۔ تمہاری مسڈ کالز دیکھی ہیں۔ سب ٹھیک ہے؟“

شہرام کی خوشی سے بھرپور آواز اسپیکر سے ابھری تھی۔ ایڈم ہونٹ بھیج کر رہ گیا۔ ایک تیر سا اس کے دل میں اترا تھا جیسے۔

”نہیں سب ٹھیک ہے۔ بس ویسے ہی تمہارا حال پوچھنے کے لیے کال کی تھی۔“

ایڈم نے کہا اور گڈ بائے کہہ کر فون بند کر دیا۔

”سراب کی تمنا میں بھاگ رہے ہو۔ سراب صرف آنکھوں کو اچھے لگتے ہیں۔ کبھی روح کو سیراب نہیں کرتے۔“

سیراب ہونا ہے، تو صبر کرنا سیکھو۔ اس سے مانگنا سیکھو۔ نہیں تو وہ اسی طرح تڑپا تڑپا کر اپنی طرف بلائے گا۔“

لال کپڑوں میں ملبوس ملنگ نے زیر لب مسکراتے ہوئے کہا۔

ایڈم حیرت سے اس کے چہرے کی طرف دیکھتا رہ گیا اور وہ پلٹ کر چلا بھی گیا۔ ایڈم نے سر جھٹک کر خود کو اس کی باتوں سے آزاد کیا اور سوچنے لگا۔

فارینہ اور شہرام...

شہرام اور فارینہ...

اس کی آنکھوں میں سرخی بڑھنے لگی اور دل کی جلن بڑھتے بڑھتے حسد تک پہنچ گئی تھی۔

حسد جو نیکیوں کو ایسے کھا جاتا ہے جیسے آگ سوکھی لکڑیوں کو۔

حسد رشتوں کو بھی ایسے ہی جلا دیتا ہے کہ پیچھے کچھ نہیں بچتا۔ کچھ بھی!...

شہرام اور فارینہ!...

ان دونوں کے ناموں کے درمیان ”اور“ بھی موجود تھا

جبکہ وہ چاہتا تھا کہ اس کی محبت کے درمیان کوئی اور تو کیا، لفظ ”اور“ بھی موجود نہ ہو۔

صرف ایڈم فارینہ...

یا فارینہ ایڈم ہو...

اور کو مٹایا جاسکتا ہے، کسی بھی حادثے سے، کسی بھی زہر سے۔

اور محبت میں رقابت سے بڑا اور دوستی میں دھوکے سے بڑا زہر کیا ہونا تھا۔

☆...☆...☆

انصب اور عانیہ کی منگنی کا فنکشن بہت بڑے پیمانے پر منعقد کیا گیا۔ عانیہ کلینکل سائیکالوجسٹ تھی۔ شہر کے پوش ایریا میں اس کا کلینک کئی سالوں سے تھا۔ اس کے انکل ہارون نے کئی سال پہلے شروع کیا تھا۔ انہیں دیکھ دیکھ کر ہی عانیہ کو انسانی نفسیات میں دلچسپی پیدا ہوئی تھی۔ اسی لیے اس نے اسی شعبے کو چنا اور پھر انکل ہارون کے بیرون ملک شفٹ ہونے کے بعد وہ اس کلینک کو بہ خوبی چلا رہی تھی۔ عانیہ جو اتنے سالوں سے اپنی فیملی کے پر زور اصرار پر شادی کرنے پر راضی نہیں ہوتی تھی۔ انصب سے ہونے والی پہلی چند ملاقاتوں میں متاثر ہو گئی اور اس کے پرپوز کرنے پر اسے اپنی فیملی سے ملوا دیا۔ جہاں انصب کو ہاتھوں ہاتھ لیا گیا کیوں کہ

انصب عانیہ کے لیے بہترین چوائس تھا۔ آج دونوں کے چمکتے دھمکتے چہرے کو دیکھتے ہوئے شہرام نے ان کے لیے دل سے دعا کی تھی۔ کبھی وہ بھی اسی خوشی اور سرشاری سے اپنی شادی کی تیاری میں مگن تھا مگر اچانک ہونے والے ایک حادثے نے اس کی خوشیوں پر اداسی کی مہر لگا دی۔

شہرام نے خود کو کمپوز کیا اور چہرے پر مسکراہٹ سجاتے ہوئے آگے بڑھا۔ انصب نے اپنی جگہ سے اٹھ کر اسٹیج پر قدم رکھتے شہرام کو گلے لگایا۔

”عانیہ ان سے ملو۔ میرا بہترین دوست، بھائیوں سے بڑھ کر ہے میرے لیے۔“ انصب نے عانیہ کو مخاطب کیا جو دوسری طرف رخ کیے کسی سے مل رہی تھی۔ انصب کے پکارنے پر مڑی اور شہرام کو دیکھتے ہی اُس کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

”انہیں کون بھول سکتا ہے؟ اتنا سوبر اور مہذب انداز۔ آج تک یاد ہے مجھے!“ عانیہ نے کہا تو شہرام قہقہہ لگا کر ہنس پڑا۔ اسے عانیہ سے ہوئی پہلی ملاقات یاد آگئی۔

”اسی وجہ سے تم نے فوراً میرے حق میں فیصلہ دے دیا تھا کہ جس کا دوست اتنا اچھا ہے وہ خود کتنا اچھا ہو گا۔“

انصب نے شوخی سے اپنا کالر سیدھا کرتے ہوئے کہا۔ عانیہ نے آنکھیں سکیڑ کر اس کے شوخی بھرے انداز کو دیکھا اور پھر منہ بنا کر بولی۔

”اگر یہ سوچتی تو پھر کبھی بھی ہمارا رشتہ نہیں ہوتا مسٹر۔“

عانیہ کے بے ساختہ کہنے پر انصب نجل ہو کر رہ گیا جب کہ شہرام ہنستا ہوا اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر بولا۔

”صبر میرے دوست! یہ صرف ابتدا ہے۔ آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا؟“

”لگتا ہے آپ کو بہت تجربہ ہے ان باتوں میں۔“

نسوانی آواز پر شہرام کے ساتھ ساتھ انصب نے بھی اس طرف دیکھا۔ عانیہ سے گلے ملتی ایک حسین لڑکی نے بہت ادا سے کہا۔

”یہ ہے میری بہت قریبی دوست زویا۔“

اور زویا ان سے ملو یہ شہرام ہیں، انصب کے بیسٹ فرینڈ۔“

عانیہ نے تعارف کی رسم نبھائی۔

”آپ سے مل کر خوشی ہوئی۔“

انصب نے اخلاقاً کہا جب کہ شہرام چہرے پہ رسمی مسکراہٹ سجا کر رہ گیا اور ”ایکسیوزمی“ کہتا ہوا اسٹیج سے نیچے اتر گیا۔

”لگتا ہے آپ کے دوست کو کوئی خوشی نہیں ہوئی ہم سے مل کر۔“

زویا نے بہت ادا سے کہا۔

”ہم کون؟ آپ کے ساتھ کوئی اور بھی ہے؟“

انصب نے حیرت سے سوال کرتے ہوئے اس کے آس پاس دیکھا۔

”برامت منانا۔ انصب کی عادت ہے مذاق کرنے کی۔“

عانیہ نے فوراً انصب کو آنکھیں دکھائیں تھیں۔ انصب سر جھکا کر اپنی مسکراہٹ ضبط کرنے لگا۔ جب کہ زویا اثبات میں سر ہلاتی سیٹج سے اتر گئی۔ انصب نے دیکھا، اس کا رخ اس طرف تھا جہاں شہرام بیٹھا ہوا تھا۔ انصب کے چہرے پر بہت گہری مسکراہٹ تھی۔ شہرام نے آج پھر کسی کا دل بہت آسانی سے گھائل کر دیا تھا۔ اس بار اس کی سحر انگیز شخصیت سے گھائل ہونے والی کوئی اور نہیں عانیہ کی قریبی دوست اور فوج سے ریٹائرڈ کرنل ثقلین کیانی کی اکلوتی بیٹی زویا تھی۔

☆...☆...☆

خان زادہ احمد کی حالت یک دم بہتری کی طرف گامزن ہو گئی۔ پچھلے ایک ہفتے سے وہ یہاں مقیم تھے۔ اماں رحیمہ کی خالہ زاد کزن نے بہت خدمت کی تھی۔ خان زادہ احمد نے کسی سہارے کے بغیر اٹھنا شروع کر دیا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ جیسے اسے کوئی

بچے نے کہا اور وہاں سے بھاگ گیا۔ سائیں نے آج تک کسی کے گھر کے اندر قدم نہیں رکھا تھا۔ کچھ دیر تک سوچنے کے بعد، جھجکتے ہوئے سائیں نے دہلیز پر قدم رکھا۔

”بسم اللہ! میرا بچہ آیا ہے۔“

نور بانو نے صدقے واری ہوتے ہوئے کہا۔ سائیں کے قدم اپنی جگہ ساکت ہو گئے۔

”میرا بچہ۔“ سائیں نے زیر لب دہرایا۔

”آجائو اندر میں کب سے تمہارا انتظار کر رہی ہوں۔“

نوربانو نے مان سے اسے پکارا۔

سائیں دھیرے دھیرے قدم اٹھاتا، ان کے سامنے سر جھکا کر کھڑا ہو گیا۔

نوربانو نے ایک نظر اس کی طرف دیکھا اور پھر اماں رحیمہ کی طرف۔ وہ بھی نوربانو کی طرف دیکھ رہی تھیں۔ پھر بے ساختہ دونوں ہنس پڑیں۔

”ارے میاں تم تو ایسے سر جھکا کر کھڑے ہو جیسے کسی نے اسکول میں بچے کو سبق نہ سننے پر سزا سنا دی ہو۔“

اماں رحیمہ نے ہنستے ہوئے کہا تو سائیں نے خجالت بھری مسکراہٹ چہرے پر سجا کر ان کی طرف دیکھا۔

تکلیف تھی ہی نہیں۔ بس یہاں تک آنے کا وسیلہ بننا تھا۔ کل صبح ان کی روائگی تھی۔

نوربانو نے اپنے بیٹے کی صحت یابی کی خوشی میں خود کھیر بنائی اور بچوں میں تقسیم کی۔ حویلی میں ان کی آمد کی خبر پہنچ چکی تھی۔ عائشہ کے ساتھ ساتھ آمنہ اور مریم بھی بے تابی سے ان کے لوٹنے کی منتظر تھیں۔ حویلی کے ملازمین بھی چھوٹے خان زادہ کی صحت یابی کا سن کر بہت خوش تھے۔ حویلی میں بڑے جشن کی تیاری بھی کرنی تھی۔ اس لیے سب بہت متحرک اور پر جوش تھے۔

دروازے پر دستک ہوئی تو نوربانو نے اپنے سامنے چارپائی پر بیٹھی اماں رحیمہ سے فوراً کہا۔

”ضرور سائیں ہوگا۔ میرا پیغام سنتے ہی چلا آیا۔“

نوربانو نے پر جوش انداز میں کہا۔ اتنی دیر میں کسی بچے نے دروازہ کھول دیا مگر دروازے پر کھڑے سائیں نے اندر آنے سے انکار کر دیا۔

”آپ ماں جی کو بلا دیں بس۔ میں ان سے مل کر چلا جاؤں گا۔“

ساتیں نے سر جھکائے کہا۔

”آپ کو وہ اندر بلا رہی ہیں۔“

نوربانو نے اپنی ہنسی ضبط کرتے ہوئے ، ہاتھ کے اشارے سے اپنے پاس بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

”نہیں ماں جی میں یہیں ٹھیک ہوں۔“

سائیں نے نرمی سے منع کیا۔

”ماں جی بھی کہہ رہے ہو اور ماں کے پاس بھی نہیں آ رہے۔ آجائو بیٹا۔ تم بھی مجھے احمد کی طرح ہی عزیز ہو۔“

نوربانو نے فرطِ محبت سے کہا تو سائیں نے فوراً سر اٹھا کر ان کی آنکھوں میں دیکھا۔ جہاں ممتا کا سمندر ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ ایک ٹیس ، ایک کسک نے اس کے دل میں ہلچل مچادی۔ اس کی آنکھوں میں پھر نئی پھیلنے لگی تھی۔ اس نے فوراً سر جھکا لیا۔ نوربانو نے دل ایک دم ہی پریشان ہو گیا۔

”کیا ہوا بیٹا؟ کیا میری کوئی بات بری لگی ہے۔“

نوربانو نے بے چینی سے اس کی آنکھوں میں پھیلی نئی دیکھ کر پوچھا۔

”ساری زندگی جس رشتے کے لیے ترسا ہوں، وہ آج اتنی چاہ سے اپنی طرف بلا رہا ہے کہ اپنی قسمت پر یقین ہی نہیں آ رہا۔“

سائیں کے ہونٹوں پر پہلی بار مسکراہٹ پھیلی تھی۔ آگے بڑھ کر وہ مؤدب انداز میں چارپائی کے کونے پر ٹک گیا۔ اسی وقت اماں رحیمہ ایک کٹوری میں بادام اور پستے سے سبزی کھیر لیے آ گئی۔

”یہ میں نے خاص تمہارے لیے پہلے ہی نکال کر رکھ لی تھی۔ پتا نہیں تمہیں کھیر پسند بھی ہے یا نہیں مگر میرا دل کہہ رہا تھا کہ تمہیں ضرور پسند آئے گی! نوربانو نے اماں رحیمہ کے ہاتھ سے کٹوری پکڑ کر اس کی طرف بڑھائی۔ سائیں نے ایک نظر ان کے ہاتھ میں پکڑی کٹوری کی طرف دیکھا اور دوسری نظر دوپٹے کے ہالے میں مقید ان کے پاکیزہ چہرے پر۔“

”کیا سب ماٹوں کے چہرے اتنے ہی سادہ اور پُر نور ہوتے ہیں۔“

سائیں نے دل میں سوچا۔

”کھیر کا پہلا چمچ آپ کے ہاتھ سے کھا سکتا ہوں۔“

سائیں نے جھجکتے ہوئے پوچھا۔ نوربانو نے پہلے حیرت سے اس کی بات سنی پھر جلدی سے چمچ بھر کر اس کی طرف بڑھایا۔

”کھیر بہت مزے کی ہے۔“

سائیں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ نوربانو خوشی سے کھل اٹھیں۔

”تمہاری ماں بھی ایسی ہی مزے درا کھیر بناتی ہوں گی۔“

نوربانو کے سوال پر سائیں نے نظریں اٹھا کر ان کی طرف دیکھا اور بولا۔

”جی ہاں! بہت مزے کی بناتی ہیں۔“

”اچھا کیا تمہاری ماں حیات ہیں؟ معذرت بیٹا مگر تمہاری بے سرومانی دیکھ کر ایسا ہی لگا کہ شاید تمہارے آگے پیچھے کوئی نہیں ہے۔“

نوربانو نے نرمی سے پوچھا۔

”ٹھیک کہتی ہیں آپ ماں جی! مگر ظاہری حالت اور بے سروسامانی میرا ”حال“ ہے۔ جب کہ رشتوں میں پیدا ہونا اور بندھے رہنا میرے رب کی بنائی تقدیر جس سے منکر ہونا میری بساط سے باہر ہے۔ ویسے بھی کہتے ہیں ناکہ مائیں موجود نہ بھی ہوں، تو ان کا احساس ہمیشہ جسم میں خون کے ساتھ ڈورتا ہے۔“

سائیں نے زمین کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”سائیں! کل ہم یہاں سے واپس اپنے شہر چلے جائیں گے مگر سچ جانو تو نہ جانے کیوں میرا دل تم سے دور جانے سے گھبرا رہا ہے۔ سائیں اگر ممکن ہو، تو کیا تم مجھ سے ملنے، حویلی آؤ گے؟“

نوربانو نے بہت آس سے پوچھا۔ سائیں تذبذب کی کیفیت میں چپ چاپ بیٹھا رہا۔

”ماں جی میں دنیا کو چھوڑ چکا ہوں اور دنیا کے رشتے بھی مگر آپ کی آس توڑنا مجھے

اچھا نہیں لگ رہا۔ میں ایک بار ضرور آؤں گا۔ صرف آپ کی خواہش پر۔“

سائیں نے مضبوط لہجے میں کہا۔

”وعدہ کرو سائیں! میں جانتی ہوں کہ تم وعدہ کبھی نہیں توڑو گے۔“

نوربانو نے اسے ہر طرف سے گھیر لیا۔ سائیں نے ان کے پھیلے ہوئے ہاتھ دیکھے، تو بے ساختہ بولا۔

”وعدہ رہا۔“

سائیں کے کہنے پر نوربانو کے چہرے پر پُر سکون مسکراہٹ پھیل گئی۔

☆...☆...☆

”بہت خوش ہو؟“

فارینہ شہرام کو پک کرنے اس کے آفس آئی تھی۔ یہاں آکر اسے پتا چلا کہ شہرام اپنی فیملی کو ریسو کرنے ایئر پورٹ گیا ہے جو اچانک سرپرائز وزٹ پر اس کی شادی میں شرکت کرنے آئے تھے۔ شہرام کی سیکرٹری نے اس کی خاص ہدایت پر فارینہ کو شہرام کے کمرے میں بٹھادیا کیوں کہ شہرام نے کچھ دیر میں واپس آنے کا کہا تھا۔ فارینہ کو انتظار کرتے ابھی پندرہ منٹ ہی ہوئے تھے کہ کوئی تیزی سے کمرے

کا دروازہ نوک کیے بغیر اندر داخل ہوا۔ فارینہ نے مڑ کر دروازے کی طرف دیکھا، تو ناگواری کی شدید لہر اس کے اندر اٹھی۔ ایڈم بھی اسے وہاں دیکھ کر چونکا۔ وہ فارینہ کے چہرے کے بدلتے تاثرات دیکھ چکا تھا۔ غصے کی شدید لہر اس کے اندر بھی مچل رہی تھی۔ اسی لیے پاس آ کر اس نے لفظ چبانے والے انداز میں پوچھا۔ جس کے جواب میں فارینہ نے ایک ابرو اٹھا کر اسے تیکھی نگاہوں سے گھورا تھا۔

”میں تمہیں بتانا ضروری نہیں سمجھتی۔“

فارینہ کے لہجے میں حقارت تھی۔

ایڈم کے چہرے کا رنگ تیزی سے بدلا۔

”بائی داوے! تم شہرام سے شادی صرف اس لیے کر رہی ہو تاکہ مجھے نیچا دیکھا سکوں۔ یہ تو میں مان ہی نہیں سکتا کہ تمہیں شہرام سے محبت ہے۔ پھر کیوں تم اسے بے وقوف بنا رہی ہو؟“

ایڈم نے تلخ لہجے میں کہا، تو ہاتھ میں پکڑا میگزین زور سے میز پر مارتی وہ اپنی جگہ سے اٹھی اور تن کر ایڈم کے سامنے کھڑی ہو گئی۔ اس کی آنکھوں سے نفرت کے شعلے لپک رہے تھے۔

”تم“

فارینہ نے انگلی اٹھا کر اس کی طرف اشارہ کیا۔

”تم اپنی بکواس بند ہی رکھو تو بہتر ہے۔ میں کس سے اور کیوں شادی کر رہی ہوں یہ

تمہارا مسئلہ نہیں ہے۔ بہتر ہے کہ اپنے کام سے کام رکھو۔“

فارینہ نے نفرت سے کہا اور کرسی پر پڑا اپنا ہینڈ بیگ اٹھا کر تیزی سے وہاں سے جانے لگی۔ ایڈم کے چہرے کا رنگ غصے کی شدت سے سرخ ہو گیا تھا۔

”تمہیں یہ لہجہ اور الفاظ بہت مہنگے پڑیں گے فارینہ۔ اگر محبت کرنے والوں کی محبت بھی لازوال ہوتی ہے، تو تم شاید یہ بھول رہی ہو کہ محبت کرنے والوں کی نفرت بھی کمال کی ہوتی ہے۔ تمہاری بد قسمتی یہ رہے گی کہ نہ تو تم نے لازوال محبت کا ذائقہ چکھا ہے اور نفرت کے کمال کو تم نے خود چننا ہے اپنے لیے۔“

ایڈم نے سرد لہجے میں کہا۔ یہ سنتے ہی فارینہ کی ریڑھ کی ہڈی میں خوف کی ایک لہر اٹھی۔ اس نے پیچھے مڑ کر دیکھنے کے بجائے وہاں سے جانا مناسب سمجھا۔

اگر وہ پیچھے مڑ کر دیکھ لیتی تو اپنی زندگی کا سب سے بڑا سچ جان لیتی جو بت کی طرح اپنی جگہ کتنی ہی دیر استادہ رہا تھا۔

”کیا صرف محبت کرنا بھی کسی کی نفرت کا باعث بن سکتا ہے یا...“

سوال ہر سانس کا پھندہ بن رہے تھے مگر وہ جینا چاہتا تھا۔ کھل کر سانس لینا چاہتا تھا لیکن کوئی اس کے راستے کی، اس کی محبت کی راہ میں رکاوٹ بن کر آکھڑا ہوا تھا۔ اب اسے یہ فیصلہ کرنا تھا کہ یا تو راستہ بدل لے یا پھر... اور اس نے دوسرا راستہ چننے کا فیصلہ کر لیا۔

☆...☆...☆

”اوہ تو آپ ہیں شہرام علی خان! جس کی تعریفیں ہم پچھلے کئی دنوں سے اپنی لاڈلی بیٹی کے منہ سے سن کر خواہ مخواہ ہی متاثر ہو رہے تھے۔“

شہرام نے ایک بھاری اور گونج دار آواز پر پیچھے مڑ کر دیکھا، تو ایک سوئڈ بوٹڈ شخص اس کی طرف دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔ اس کے پہلو میں زویا بھی کھڑی تھی۔ شہرام گہری سانس لے کر رہ گیا۔ وہ آج انصاف کے گھر ہونے والی گیٹ ٹو گیدر پارٹی میں شرکت کرنے آیا تھا۔ جہاں زویا بھی اپنی فیملی کے ساتھ مدعو تھی۔ شہرام نے رسمی مسکراہٹ چہرے پر سجاتے ہوئے کرنل ثقلین کیانی سے ہاتھ ملایا۔ جسے کرنل ثقلین کیانی نے بہت مضبوطی سے تھاما تھا۔ شہرام کے ساتھ رسمی گفتگو کا آغاز ہوا۔ شہرام جو پہلے کسی بہانے سے وہاں سے بھاگنے کا سوچ رہا تھا مگر کرنل ثقلین

کیانی کی شگفتہ اور دل چسپ باتوں نے اسے رکنپیر مجبور کر دیا جو بھی تھا آرمی سے محبت اور عقیدت اس کی خون میں شامل تھی۔ باتوں ہی باتوں میں جب کرنل ثقلین کیانی کو پتا چلا کہ شہرام کے دادا اور دونوں تایا آرمی سے تعلق رکھنے کے ساتھ ساتھ شہادت کا تغمہ بھی رکھتے ہیں، تو وہ چونک پڑے۔ تھوڑی سی تفصیل جانے کے بعد، خوشی اور جوش سے ان کا چہرہ تہمتانے لگا اور پھر کرنل ثقلین کیانی نے بتایا کہ

”کارگل کے جس محاذ پر تمہارے تایا نے شہادت پائی۔ وہ بھی اسی یونٹ کا حصہ تھے اور بہت اچھی طرح سے اس کے تایا سے واقف بھی تھے۔“

اس اتفاق نے شہرام کے ساتھ ساتھ زویا کو بھی حیران کر دیا۔ جو تھوڑے بہت تکلفات تھے، ان کے درمیان وہ بھی اس ملاقات نے ختم کر دیے۔ جب وہ وہاں سے اٹھے تو کرنل ثقلین کیانی نے شہرام کو گلے لگاتے ہوئے کہا۔

”میں نے جو کچھ تمہارے بارے میں سنا تھا۔ تم اس سے کہیں زیادہ کے مستحق ہو برخوردار۔“

شہرام نے مسکرا کر ان کا شکریہ ادا کیا۔

گھر والہی پر آج وہ بلا وجہ ہی گنگنا رہا تھا۔ جیسے آج کسی نے بہت عرصے بعد اس کے دل کے کسی خاص حصے کو چھوا تھا جو زندگی کی بھاگ دوڑ میں کہیں چھپ سے گیا تھا، مگر آج پھر سے ماضی تازہ ہوا تھا جیسے سب کچھ لوٹ آیا ہو۔ اپنے پچھڑے پیاروں کی یاد بھی۔

☆...☆...☆

سائیاں ہر سو درد بہت

موسم موسم سرد بہت

رستہ رستہ گرد بہت

چہرہ چہرہ زرد بہت

اور ستم ڈھانے کی خاطر

تیرا اک اک فرد بہت

پتیل کے درخت کے نیچے مزار کا وہ حصہ تھا جو کچھ ہٹ کر اور خستہ حالی کی وجہ سے زیادہ تر ویران پڑا رہتا تھا۔ پہلے اکثر یہاں پر نشہ کرنے والے یا جرائم پیشہ نوجوانوں کا بجوم رہتا تھا۔ تاش، سٹہ بازی سے لے کر جوا تک کھیلا جاتا، مگر جب سے لوگوں نے مزار پر آنا شروع کیا تھا۔ ان لوگوں نے خود بہ خود اس جگہ سے

کوچ کرنا مناسب سمجھا کیونکہ بہت سی نظروں میں ان کی مشکوک سرگرمیاں آنے لگیں تھیں۔ تین سیڑھیوں کے بعد اوپر چھوٹا سا چبوترہ بنا ہوا تھا۔ خستہ حالی کی وجہ سے سیڑھیاں ٹوٹ پھوٹ کا شکار تھیں۔ سائیں نوربانو سے جب سے مل کر آیا تھا بہت خاموشی سے پتیل کے نیچے، چبوترے کی دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا کہ اس کے پاؤں ٹوٹی سیڑھیوں پر رکھے ہوئے تھے۔ اس نے آنکھیں موند رکھی تھیں مگر بند آنکھوں کے پیچھے دوڑتے بھاگتے منظروں کو دیکھتے دیکھتے، تھک ہار کر ایک دم ہی اس نے اپنی آنکھیں کھولیں، تو وہ سرخ ہو رہی تھیں۔ درخت پر چڑیوں نے شور مچا رکھا تھا۔ مغرب کا وقت قریب تھا۔ سائیں چڑیوں کی حرکات و سکنات کو دیکھتا ایک دم ہی چونکا۔

خشک پتوں پر کسی کے قدموں کی چاپ ابھر رہی تھی۔ سائیں نے آواز کی سمت کا تعین کیا۔ کچھ لمحوں بعد کالے رنگ کی جھلک دیکھ کر وہ گہری سانس لے کر رہ گیا اور پھر سے دیوار سے ٹیک لگا کر آنکھیں بند کر لیں۔ آواز پاس آ کر رک گئی۔ سوگوار سی خوشبو چاروں طرف پھیل گئی تھی۔

”ہم سے اچھی تو یہ چڑیاں ہیں سائیں جن پر کچھ دیر ہی سہی، تیری نظر ٹھہری تو تھی۔ کیا سچ میں ہمارے لیے ایک نظر بھی نہیں ہے۔“

موہنی کے لہجے میں تڑپ تھی۔ سائیں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ جیسے اس نے سنا ہی نہ ہو۔ موہنی کچھ دیر خاموش کھڑی رہی۔ اسی خاموشی میں ہی آواز کے سب رنگ تھے، سب لفظ تھے۔ خاموشی من پسند ہو، تو چاہے کتنی بھی طویل ہو، بری نہیں لگتی۔ مگر یہ ہی خاموشی اگر من پسند نہ ہو تو، اس سے زیادہ اذیت ناک بھی کچھ نہیں ہوتا۔ موہنی کی ہیرے جیسی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ اس لیے نہیں کہ سائیں نے اس کی بات کا جواب نہیں دیا یا اس کی طرف نظر اٹھا کر نہیں دیکھا۔ اس کے لیے یہ بھی بہت تھا کہ سائیں نے اسے دھتکارا نہیں تھا۔ اسے رونا اس بات پر آیا کہ اس کے واپس جانے کا وقت ہو گیا تھا۔ آج کی یہ ملاقات اپنے اختتام کو پہنچی تھی۔ نہ اس کی آنکھوں کی پیاس بجھی اور نہ سماعتوں پر لفظوں کی پھوار برسی تھی، مگر یہ بھی اس نے سائیں ہی سے سیکھا تھا۔

”تھوڑا ہی سہی مگر من رنکی ہو تو، اسی پر قناعت کر لینا چاہیے کیوں کہ من رنکی تھوڑا بھی مل جائے تو وہ بھی بہت ہوتا ہے۔“

جب شام کے سائے گہرے ہونے لگے، تو وہ خاموشی سے پلٹنے لگی۔ سائیں نے اسی وقت آنکھیں کھولیں تھیں۔ خالی خالی نظروں سے وہ اسے چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتے ہوئے واپس جاتے دیکھتے رہا۔

وہ ترک دنیا کا قائل نہیں تھا، بلکہ ایسا کوئی بھی شخص ترک دنیا کا قائل نہیں ہو سکتا جو اسلام کی اصل روح کو جانتا ہو۔

جو حضرت محمد ﷺ کی سنت پر عمل کرتا ہے جو اسوہ حسنہ کا پیروکار ہو۔ وہ کبھی بھی ترک دنیا کا خواہش مند نہیں ہو گا۔

وہ جانتا تھا کہ انسان زمین پر ایک مخصوص وقت کے لیے اپنے فرائض کی ادائی اور اپنا کردار بہتر طریقے سے ادا کرنے کے لیے بھیجا گیا ہے۔

خیر کا تعلق صرف اپنی ذات سے نہیں ہوتا خیر وہ ہے جو سب کے لیے ہے۔

ایک فرد کا دوسرے فرد کے لیے خیر بننا بڑی کامیابی کی بات ہے۔

سائیں کے پاس جو تھوڑا بہت علم تھا، اس کی روشنی میں اس نے اپنے لیے جو راستہ چنا تھا وہ خلق خدا کی خدمت اور محبت کا تھا۔ اس کی دعا کا فیض کب اور کیسے عام ہوا، وہ نہیں جانتا تھا۔ یہ اس پر اللہ کی خاص مہربانی تھی یا اس کی آزمائش تھی۔

وہ اگر عام لوگوں کی طرح چاہتا، تو مزار کی گدی سنبھال کر اپنے آپ پر، اندھی تقلید کرنے اور ماننے والوں کا ہجوم لگا لیتا۔ ضعیف الاعتقادی کی جڑیں اس معاشرے میں بہت اندر تک پھیل چکی تھیں۔ لوگ صرف پوجنے اور سجدہ کرنے کے لیے جگہ ڈھونڈتے تھے، بغیر سچ اور جھوٹ کی پہچان کیے۔ سائیں خود کو ایسی کسی بھی

بدعت سے بچا کر رکھنا چاہتا تھا۔ وہ ایسے نقش نہیں چھوڑنا چاہتا تھا کہ بعد میں لوگ ان پر چلتے ہوئے، راہ سے بھٹک جائیں۔

بھلا جسے محمدؐ جیسی ہستی کے نقش پالیں ہوں، انہیں کسی اور کی اندھی تقلید کرنے کی کیا ضرورت ہے۔

سائیں نے اپنے سفر کے لیے جو راستہ چنا تھا وہ لوگوں کے درمیان میں سے ہو کر گزرتا تھا، مگر موہنی یا اس جیسی کسی بھی خواہش کی حد سے وہ بہت آگے نکل چکا تھا۔ وہ اپنی ذات کی پہچان کے سفر پر نکلا تھا اور اسے تب پتا چلا کہ ذات کی پہچان، فنا کے راستے سے ہو کر گزرتی ہے۔

فنا اپنی میں کی!

فنا اپنے نفس کی!

فنا اپنے تکبر کی!

فنا اپنی انا کی!

فنا اپنی ہر دل عزیز شے کی!

فنا اپنی محبت کی!

دراصل یہ فنا عشق کی وہ آگ ہے جو اندر باہر سے جلا کر، اپنی آگ میں تپا کر، جلا کر، راکھ بنا کر اپنی مرضی سے اپنی راہ میں اڑاتی ہے۔ عشق کی تال اور کیا اس کی دھمال کبھی کسی نے نہیں دیکھی۔

اتنی بے خودی، اتنا سرور عشق کا جام ہی دیتا ہے۔

سائیں اسی جام کے نثار میں، اپنی پہچان کا سفر تیزی سے طے کر رہا تھا۔

سارا جہاں مست، جہاں کا نظام مست

دن مست، رات مست، سحر مست، شام مست

دل مست، شیشہ مست، صبو مست، جام مست

ہے تیری چشم مست سے ہر خاص و عام مست...

☆...☆...☆

”ایڈی تم نے شادی کے ہر فنکشن میں ضرور شرکت کرنی ہے۔ تمہارے لیے یہ پہلا تجربہ ہو گا، مشرقی شادی میں شرکت کرنے کا۔ مجھے امید ہے کہ تم بہت انجوائے کرو گے۔“

شہرام کا چہرہ اندرونی خوشی سے چمک رہا تھا۔ وہ اپنی شادی کا کارڈ دینے ایڈی کے اپارٹمنٹ میں آیا تھا۔ ایڈی جو عام سے حلیے میں بڑھی شیو کے ساتھ، گھر میں بند پڑا تھا۔ شہرام کی اچانک آمد نے اس کے اپارٹمنٹ پر چھائی خاموشی کو توڑ دیا تھا۔ شہرام کے ہر انداز، ہر انگ سے خوشی جھلک رہی تھی۔ بستر پر لیٹے ایڈی کا ہاتھ کھینچ کر اسے زبردستی اٹھا کر وہ کچن میں لے آیا۔

”اپنے ہاتھ سے بنا کر کافی پلاؤ۔ کافی دن ہو گئے تمہارے ہاتھ کی مزے دار سی کافی پیے۔

قسم سے یار! اگر تم یہ سب چھوڑ چھاڑ کر کافی شاپ کھول لو، تو بھی بھوکے نہیں مرو گے۔“

شہرام نے ہنستے ہوئے کہا تو ایڈی اسے گھور کر رہ گیا۔

”میں تمہاری بیوی نہیں ہوں، جس سے ایسی فرمائش کر رہے ہو۔ بہتر ہے کہ ایسی فرمائشوں کو آنے والے وقت کے لیے سنبھال کر رکھو۔“

ایڈی نے منہ بنا کر جواب دیا۔ اسے کچن میں آتا دیکھ کر کام میں مصروف اسلم نے چونک کر دیکھا۔ اسلم بہترین لکھ ہونے کے ساتھ ساتھ اس کے اپارٹمنٹ کی دیکھ

بھال بھی کرتا تھا۔ وہ شہرام اور ایڈی کی دوستی سے بہت اچھی طرح واقف تھا۔ ابھی بھی ان دونوں کو ساتھ آتا دیکھ کر وہ زیر لب مسکرا کر ایک طرف ہو گیا۔ ”شہرام صاحب آئے اور ایڈی سر کے ہاتھ کی بنی کافی نہ پیے، یہ ممکن ہی نہیں تھا۔“

اسلم نے سوچا اور دونوں کو باتوں میں مگن دیکھ کر باہر نکل گیا۔

”یار ہمارے ایسے نصیب کہاں۔“ شہرام نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ کافی پھینٹے ہوئے ایڈی نے اس کی مصنوعی اداسی کو دیکھا۔

”کیا مطلب؟“

ایڈی نے مصروف سے انداز میں پوچھا۔

”فارینہ اور کچن۔ مجھے تو لگتا ہے کہ شادی کے بعد مجھے ہی اسے کافی بنا کر پلانا پڑے گی۔“

شہرام نے ہنستے ہوئے کہا۔ ایڈی بھی مسکرا نے لگا۔

شہرام بہت دلچسپی سے اسے تیزی اور مہارت کے ساتھ کام کرتے دیکھ رہا تھا۔ وہ خود بھی کئی سالوں سے اکیلا ہی رہ رہا تھا، مگر یہ بھی سچ تھا کہ اسے انڈا ابالنا بھی

نہیں آتا تھا۔ شہرام کے والدین کے رکھے قابل اعتماد ملازموں کی وجہ سے اس کا گھر بہت اچھی طرح سے سنبھلا ہوا تھا۔

”تمہیں یہ کوکیز بہت پسند ہیں نا۔“

خوشبودار، گرم گرم کافی کے ساتھ کوکیز کا جار ایڈی نے اس کے سامنے رکھا، تو شہرام کی آنکھوں کی چمک بڑھ گئی۔

”جیو میرے دوست! دوست ہو تو تم جیسا۔“

شہرام نے کہا، تو کافی پیتے ایڈی نے چونک کر بہت غور سے اس کے چہرے کی طرف دیکھا۔ وہ بہت مگن سے انداز میں کافی پی رہا تھا۔

”تمہیں مجھ پر اتنا مان کیوں ہے شہرام؟“

ایڈی کا لہجہ بہت عجیب سا تھا۔ شہرام نے سر اٹھا کر سوچ میں گم ایڈی کی طرف دیکھا۔

”مان نہیں! مجھے یقین ہے اور یہ یقین مجھے اس دوستی کے رشتے نے عطا کیا ہے۔“

شہرام نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے اعتماد سے کہا۔

ایڈی خاموش نظروں سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔ اسی وقت شہرام کا موبائل بجنے لگا۔ شہرام اپنے موبائل کی طرف متوجہ ہو گیا اور فون بند کرتے ہی اس نے جانے کی اجازت چاہی۔

”سوری یار! دراصل میری بہن ثمرہ اور فارینہ آج شاپنگ پر گئی ہوئی ہیں اور اب وہ مجھے بلا رہی ہیں۔ کوئی خاص ڈریس پسند کر لیا ہے، اس پر میری رائے بھی چاہیے۔ ویسے تو آج میرا موڈ تھا کہ پہلے کی طرح ہم دونوں مل کر مختلف آئیڈیاز پر بحث کریں مگر فی الحال ابھی یہ ممکن نہیں، مگر بہت جلد ہم پھر ساتھ مل کر کام کریں گے۔“

شہرام نے کہا اور ایڈی کا بڑھا ہوا ہاتھ تھام کر اسے کھینچ کر اپنے گلے لگا لیا۔ ایڈی کی جانب سے آج گرم جوشی عنقا تھی۔ شہرام نے اپنی خوشی میں محسوس ہی نہیں کیا۔

”شہرام...“

شہرام نے دروازے کے پاس پہنچ کر جوں ہی، ہینڈل پر ہاتھ رکھا، ایڈی کی آواز پر پیچھے مڑ کر لائونج کے وسط میں کھڑے ایڈی کی طرف دیکھا۔ جس کا انداز بہت کھویا کھویا سا تھا۔

”گڈ بائے شہرام“...

ایڈی کا لہجہ سرد تھا یا اسے ایسا محسوس ہوا۔

”گڈ بائے۔“

شہرام نے بھی مسکرا کر کہا اور ہاتھ ہلاتا ہوا دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔ ایڈی کے ہونٹوں پر پراسرار سی مسکراہٹ پھیل گئی تھی۔

اس نے میز پر پڑے شہرام کے خالی مگ کی طرف دیکھا اور کونسلنگ کرتا ہوا، اپنے روم کی طرف بڑھ گیا۔

☆...☆...☆

”بابا تم سے مل کر بہت خوش ہیں شہرام۔“

گھڑ سواری کی شوقین اور ماہر زویا نے گھوڑے سے جپ لگا کر نیچے اترتے اور اصطبل میں گھوڑوں کو دیکھتے ہوئے شہرام سے کہا تھا۔ گھڑ سواری کے لباس میں وہ بہت پرکشش لگ رہی تھی۔ شہرام کافی دیر سے اسے دیکھ رہا تھا۔ کسی زمانے میں گھڑ سواری کا شوق اسے بھی رہا تھا مگر کئی سالوں سے اپنی شدید مصروفیت کی وجہ سے اس کا یہ شوق کہیں گم ہو کر رہ گیا تھا مگر زویا کو اتنی مہارت سے گھڑ سواری کرتے دیکھ کر وہ متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔

یہ وسیع فارم ہائوس کرنل ثقلین کیانی کا تھا۔ جہاں آج رات عانیہ اور انصب کی منہدی کا فنکشن منعقد ہونا تھا۔ اسی لیے شہرام صبح ہی انصب کی فیملی کے ساتھ یہاں پہنچ گیا تھا۔ فارم کا ایک حصہ انصب اور مہمانوں کے لیے مختص تھا۔ زویا کی شہرام سے دوستی اور بے تکلفی بہت بڑھ گئی تھی۔ پہلے پہل شہرام کو وہ بہت مغرور اور ضدی لگی تھی مگر دراصل ایسا نہیں تھا۔ زویا فطرتاً صاف گو، منہ پھٹ اور بہادر تھی۔ اسی لیے دل کی بات فوراً کہہ دیتی تھی۔ شہرام کو اس کی یہ عادت پسند بھی تھی اور وہ اکثر گھبراتا بھی تھا کہ پتا نہیں اگلے ہی پل وہ کیا کہہ دے یا کر دے۔ اسی لیے ابھی بھی شہرام نے چونک کر اس کے سرخ چہرے کی طرف دیکھا۔

”مجھے بھی بہت اچھا لگا، ان سے مل کر۔“

شہرام نے گھوڑے کی پشت پر ہاتھ پھیرتے ہوئے سرسری سے لہجے میں کہا۔

”اے مسٹر زیادہ فارمل ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ تم اچھی طرح سمجھ رہے ہو کہ ہم کیا کہہ رہے ہیں، خیر چھوڑو یہ بتاؤ! ہمارے ساتھ گھڑ سواری کرو گے؟“

زویا نے اپنے مخصوص انداز میں چیلنج کرتے ہوئے پوچھا۔

تو شہرام اس کی طرف دیکھ کر مسکرا دیا۔ زویا کے سلکی بال ہوا کے زور سے لہرا لہرا کر اس کے چہرے کو چھو رہے تھے۔ کیپ ہاتھ میں پکڑے وہ بہت اعتماد سے شہرام کی طرف دیکھ رہی تھی۔

”ضرور کرتا اگر ایک حسین اور ذہین لڑکی کے سامنے گھوڑے سے گرنے کا ڈر نہ ہوتا۔ جو بھی کہہ لو اب میل ایگو تو بہر حال اپنی جگہ موجود ہے نا۔“

شہرام نے کندھے اُچکاتے ہوئے کہا تو زویا کھکھلا کر ہنس پڑی۔ اس کی ہنسی بھی، اس کی طرح بہت دلکش تھی۔ شہرام نے دل چسپی سے اسے دیکھا۔

”تم اس لیے خوش ہو رہی ہو کہ میں نے تمہاری تعریف کی ہے؟“

شہرام نے مزاحیہ انداز میں کہا۔

”اپنی ذات اور اس کے وصف سے ہم بہت اچھی طرح واقف ہیں۔ خوشی تو اس بات کی ہوئی کہ تم نے ہمارے سامنے اپنی شکست تسلیم کر لی بغیر کسی مقابلے کے! اور بابا کہتے ہیں کہ اگر مرد مقابلے کے بغیر اپنی ہار تسلیم کر لے، تو یا تو وہ بزدل ہوتا ہے یا دل والا! اور اتنا تو ہم جانتے ہیں کہ تم بزدل نہیں ہو مسٹر شہرام علی خان۔“

زویا کی آنکھوں میں جگنوؤں کی کہکشاں تھی۔ شہرام مبہوت ہو کر رہ گیا۔ محبت کسی کی ہو یا کسی کے لیے بھی ہو۔ ہر دیکھنے والی آنکھ کو مبہوت کرنا بخوبی جانتی ہے۔

”کیا ہوا؟ ایسے کیا دیکھ رہے ہو؟“

زویا نے اس کی آنکھوں کے آگے ہاتھ ہلایا۔

”میں سوچ رہا ہوں کہ تمہارے اس ”ہم“ کے پیچھے اور کتنے لوگ ہیں محترمہ۔ اچھا بھلا کنفیوز کر کے رکھ دیتی ہو۔“

شہرام نے بات کا رخ دوسری طرف موڑ دیا۔ زویا نے بہت ادا سے اسے گھورا، تو شہرام زیر لب مسکراتا ہوا اپنے گھنے بالوں میں ہاتھ پھیر کر رہ گیا۔ جبکہ زویا کے دل کی صدا بہت واضح تھی۔

”ٹو چلے ساتھ، تو آہٹ بھی نہ آئے اپنی

درمیاں ہم بھی نہ ہوں، یوں تجھے تنہا چاہیں!“

☆...☆...☆

”میں جسے سننا چاہتا ہوں مدت سے

وہ شخص کوئی بات ہی نہیں کرتا

موہنی گھونگٹ نکالے ، ایسی جگہ دیوار کی اوٹ میں کھڑی تھی جہاں سے اسے دیکھے جانے کا امکان بہت کم تھا مگر وہ بہت آسانی اور سکون سے پیاسی نظروں سے سامنے کی طرف دیکھ رہی تھی۔ آج جمعرات تھی۔ مزار پر آنے والوں کا ہجوم تھا۔ محفل سماع اپنے عروج پر تھی۔ سائیں ارد گرد سے بے نیاز آنکھیں بند کیے ، دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ کون کون اس کے پاس آ رہا تھا ، کیا کہہ رہا تھا ، سائیں کو کسی بات کا ہوش نہیں تھا۔ ایک جنوں ، ایک وجد اس کے وجود پر چھا رہا تھا۔

”نہ نماز آتی ہے مجھے، نہ وضو آتا ہے۔۔۔

سجدہ کر لیتا ہوں جب سامنے ٹو آتا ہے۔۔۔“

موہنی کے منہ سے سسکی نکلی تھی۔ اس کے دل کا درد ہر بول کے ساتھ شدت اختیار کرتا جا رہا تھا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو موتی کی لڑیوں کی طرح گر رہے تھے۔ جب کہ سائیں وجد کے عالم میں اپنی جگہ سے اٹھا اور تال کے سنگ قدم اٹھانے لگا۔ لوگ حیرت اور دلچسپی سے اسے دھمال ڈالتے ہوئے دیکھ رہے تھے۔ بہت سے ملنگ پہلے بھی جھوم رہے تھے مگر سائیں کی دھمال میں جو جنوں اور شدت تھی وہ دیکھنے والی سب نگاہوں کو سحر زدہ کر دیتی تھی۔ موہنی نے تڑپ کر اپنے دل پر ہاتھ رکھ لیا۔ سائیں کا ہر اٹھتا قدم اس کے دل پر پڑ رہا تھا۔ وہ قدموں سے

مٹی نہیں ، اس کے ارمانوں کی خاک اڑا رہا تھا۔ اس کا وجود بھی اس کے ساتھ خاک بن کر عشق کی گلیوں میں اڑ رہا تھا۔ یہ ہی اس کا حاصل اور نصیب تھا۔

”میں ازل سے بندہ عشق ہوں ، مجھے زہد و کفر کا غم نہیں

میرے سر کو در تیرا مل گیا، مجھے اب تلاشِ حرم نہیں

میری بندگی ہے وہ بندگی جو مقیدِ دیر و حرم نہیں

میرا اک نظر تمہیں دیکھنا، باخدا نماز سے کم نہیں

بس میری زندگی تیرا پیار ہے

تیرا نام لوں زباں سے، تیرے آگے سر جھکاؤں

میرا عشق کہہ رہا ہے ، میں تجھے خدا بنا لوں

تیرا نام ہے میرے لب پر، میرا تذکرہ ہے گھر گھر

مجھے بھول جائے دنیا، میں اگر تجھے بھلا دوں

میرے دل میں بس رہے ہیں تیرے بے پناہ جلوے

نہ ہو جس میں نور تیرا، وہ چراغ ہی بجھا دوں۔۔۔“

سائیں کے قدم ایک دم ہلکے ہوئے تھے۔ اگلے بولوں نے اس کے دل پر آرا سا چلا دیا تھا کہ بے اختیار اس کی آنکھوں سے آنسو بہ نکلے ، جسے اس نے فوراً آستین

سے پونچھ لیا، مگر دیکھنے والی نگاہ دیکھ چکی تھی۔ بھلا دل کی نگاہ سے دیکھنے والوں سے بھی کبھی کچھ چھپا ہے۔

”خطائے محبت کی اچھی سزا دی

میرے دل کی دنیا مٹا کر بنا دی

میرے بعد کس کو ستاؤ گے

مجھے کس طرح سے مٹاؤ گے

سائیں کے ساتھ اب اور لوگ بھی جھومنے لگے تھے۔ محفل کا رنگ اپنے عروج پر تھا اور اٹھنے والوں کے دل میں درد کی لہر بھی آج اتنے زور سے اٹھی تھی کہ وجود کند چھری کی زد پر لٹکا ہوا تھا اور روح پرواز کے لیے پر تولتی، جسم کی دیوار سے سر ٹکرا رہی تھی مگر ابھی حکم اذن نہیں ملا تھا۔ روح کے پاک ہونے، جسم کی آلائشوں سے نکلنے میں ایک معین وقت درمیان میں آڑکا تھا۔

جاننے والے جانتے تھے کہ بندش صرف وقت کی ہے۔ جو فاصلوں کو خود میں سمیٹے ہوئے ہے۔ جب اس وقت کی قید ختم ہو جائے گی اور سب فاصلے سمٹ جائیں گے، تو ”من و تو“ کا فرق بھی مٹ جائے گا۔

پھر سامنے وہ ہو گا جس کی چاہت، نے کائنات میں رنگ بھرے۔

جس کے کُن سے کائنات تخلیق ہوئی۔

جس کے حکم سے پتا بھی نہیں ہل سکتا، تو پھر ایک انسان کی کیا بساط کہ اس کی

عشق میں، مبتلا ہونے کا دعویٰ کرے۔

اس دعویٰ کی توفیق بھی وہ ہی دیتا ہے۔

جیسے اپنے عشق میں جلنے والوں، فنا ہونے والوں کو وہ اپنی رضا، اپنی مرضی سے چنتا ہے۔

کسی جن، پرند یا انسان کی کیا اوقات کہ اس ذات سے اس کی رضا کے بغیر عشق و محبت کا دعویٰ کرے۔

اُس ذات نے جسے اپنے لیے مخصوص کرنا ہوتا ہے، اسے دنیا سے بے نیاز کر دیتا ہے۔

جیسے پرندے صرف اس کی حمد و ثنا کرتے ہیں، سب سے بے نیاز ہو کر۔

جیسے لاکھوں فرشتے اس نے اپنی عبادت کے لیے پیدا کیے جو صرف اُس ذات کے لیے ہی مخصوص ہیں۔

پھر انسان ہوں یا جن ، وہ خیر و شر کے ساتھ ان کی تخلیق کرتا ہے ، جو اس کے ماننے والے ہوں گے ، وہ شر کے سب راستوں سے گزر کر بھی اس تک ضرور پہنچتے ہیں۔

وہ ذات کسی کی نیت اور عمل کو ضائع نہیں کرتی۔

وہ سب دیکھتا ہے ، ظاہر بھی اور پوشیدہ بھی۔

بس جلنے والوں کو ، اپنے کیمیا ہونے کا یقین ہونا چاہیے۔

بھلا ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ کوئی اُس ذات کے عشق میں جلے اور وہ خام رہ جائے

-

وہ ذات خالص ہے اور خالص کو ہی اپنے لیے چنتی ہے۔

روح کے خالص پن کو۔

جسموں کے خام کو نہیں۔

☆...☆...☆

فارینہ اور ثمرہ فوڈ کورٹ میں بیٹھی کب سے شہرام کا انتظار کر رہی تھیں مگر وہ ابھی تک نہیں پہنچا تھا۔ فارینہ سے جب اس کی بات ہوئی، اس وقت وہ ایڈی کے

اپارٹمنٹ میں موجود تھا۔ فارینہ نے اپنی نازک کلائی میں بندھی گھڑی میں وقت دیکھا۔

”اب تک اسے آ جانا چاہیے تھا۔

فارینہ نے بے چینی سے خود کلامی کی۔

”تم فکر مند مت ہو۔ ابھی پہنچ جائے گا شہرام۔ اس کا بھی قریبی دوست ہے یہ ایڈم یا ایڈی ! واٹ ایور... بہت ذکر کرتا ہے شہرام اس کا مگر مجھے وہ کچھ عجیب سا لگتا ہے۔“

ثمرہ نے منہ بناتے ہوئے کہا تو فارینہ نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

”اچھا وہ کیوں؟“ فارینہ کا لہجہ بہ ظاہر سرسری سا تھا۔

”تم نے کبھی اس کی ظاہری حلیے پر غور نہیں کیا؟ کیسے عجیب و غریب سے فیشن کرتا ہے۔ قسم سے خواتین تو مفت میں بدنام ہیں۔ ویسے ایک بات ہے ، اس پر یہ سب جچتا بھی ہے نا!“

ثمرہ نے مسکراتے ہوئے اس سے تائید چاہی اور فارینہ نے طنزیہ مسکراہٹ اچھالی تھی۔

”بہر ویسا ہے وہ، کسی کا دوست نہیں۔ شہرام کو ابھی اندازہ نہیں کہ وہ کتنا خطرناک ہے۔“ فارینہ نے زہر خند لہجے میں کہا۔

”یہ تم کیا کہہ رہی ہو فارینہ؟“

ثمرہ نے حیرت سے سوال کیا۔ اس سے پہلے کے فارینہ کوئی جواب دیتی اس کا موبائل بجنے لگا۔ ایک انجان نمبر دیکھ کر، غصے کی شدید لہر اس کے اندر اٹھی تھی۔ کیونکہ پچھلے کئی دنوں سے کچھ لوگ اسے مسلسل تنگ کر رہے تھے اور خطرناک نتائج کی دھمکیاں دے رہے تھے۔ جسے فارینہ کسی خاطر میں نہیں لا رہی تھی۔ ابھی بھی وہ یہی سمجھی تھی۔ اسی لیے غصے سے فون اٹھا کر کچھ کہنے ہی لگی، جب کسی نے مہذب آواز میں اس کا نام اور تعارف پوچھا اور پھر جو اطلاع اسے ملی۔ اس نے ایک لمحے کے لیے اسے ساکت کر دیا۔ دوسرے ہی پل وہ فوراً اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی اور بولی۔

”کون سے ہاسپٹل میں ہے وہ؟ میں آرہی ہوں۔“

ثمرہ بھی اس کے چہرے کی طرف دیکھتی پریشانی سے پوچھنے لگی۔

”سب ٹھیک ہے نا؟“

فارینہ نے خالی خالی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

”شہرام کا ایکسیڈنٹ ہوا ہے اور وہ ہاسپٹل میں ہے۔ اس کے موبائل میں کی گئی لاسٹ کال مجھے تھی۔ اس لیے مجھے فون“!۔

آنسوؤں نے بات پوری نہیں کرنے دی۔ ثمرہ نے بے یقینی سے اپنے منہ پر ہاتھ رکھا۔

”وہ ٹھیک تو ہے؟“

ثمرہ نے آگے بڑھ کر اس کا بازو تھاما۔ فارینہ نے اس کی طرف دیکھا اور نفی میں سر ہلاتے ہوئے اپنی لاعلمی کا اظہار کیا۔

”ابھی ایمر جنسی میں ہے۔“

”اللہ میرے بھائی کی حفاظت فرما۔ چلو جلدی، میں فون کر کے عدنان اور فاخر بھائی کو اطلاع دیتی ہوں۔“

ثمرہ نے کانپتے ہاتھوں سے موبائل پکڑا اور بڑے بھائیوں کو کال کرنے لگی۔

ان کے وہاں پہنچنے کے کچھ دیر بعد، عدنان اور فاخر کے ساتھ ساتھ ثمرہ کا شوہر واسق بھی پہنچ گیا تھا۔ ثمرہ کا رو رو کر برا حال تھا۔

”یہ کوئی معجزہ ہی ہے کہ شہرام کو معمولی چوٹیں آئیں ہیں۔ ورنہ گاڑی جس بری طرح تباہ ہوئی ہے۔ اس کا بچ جانا ناممکن تھا۔“

سب سے بڑے عدنان نے ثمرہ کو خود سے لگاتے ہوئے تسلی دی۔ وہ ابھی ابھی جائے حادثہ کا جائزہ لے کر آئے تھے۔ شہرام کے ماتھے اور ایک بازو پر پٹی بندھی ہوئی تھی اور وہ مسکراتے ہوئے پریشان چہروں کو تسلی دے رہا تھا۔ اسی وقت ایڈم بھی وہاں پہنچ گیا۔ جسے دیکھتے ہی کتنی دیر سے گم صم بیٹھی، فارینہ چیل کی طرح اس پر چھٹی اور اس کا گریبان پکڑ کر چیختے ہوئے بولی۔

”تم یہاں یہ دیکھنے آئے ہو کہ شہرام بچ کیسے گیا ہے؟ تم نے اپنی طرف سے پوری تیاری کی تھی اسے مارنے کی۔“

ایڈی کے چہرے کا رنگ سُرخ ہو گیا۔ جسے وہ بہت مشکل سے ضبط کر رہا تھا۔

”تماشا مت لگاؤ فارینہ!“ ایڈم نے سخت لہجے میں کہا۔ سب حیرت سے تماشا دیکھ رہے تھے۔

”فارینہ! یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟ مت بھولو تم سے پہلے ایڈی میرا دوست ہے۔ میں اپنے دوست کی بے عزتی برداشت نہیں کروں گا۔“

شہرام اپنی چوٹوں کی پروا کئے بغیر تیزی سے ان کی طرف بڑھا اور فارینہ اور ایڈی کے درمیان آکھڑا ہو۔

”شہرام تم نہیں جانتے کہ یہ...“

فارینہ نے کچھ کہنا چاہا مگر شہرام نے ہاتھ اٹھا کر اسے کچھ بھی کہنے سے روک دیا۔

”بس کرو فارینہ! تم اپنی نفرت میں بہت آگے بڑھ چکی ہو۔ ثمرہ اسے یہاں سے لے جاؤ۔ اس کے حواس ابھی کام نہیں کر رہے۔ اسے آرام کی ضرورت ہے۔“

شہرام نے ثمرہ سے کہا، تو وہ فوراً آگے بڑھی اور فارینہ کو زبردستی اپنے ساتھ لے جانے لگی۔

”ایک منٹ! یہ یہاں سے ایسے نہیں جاسکتی۔ پہلے ہم ان کا بیان لیں گے اور ان صاحب کے خلاف ایف۔ آئی آر کئے گی۔ آخر کسی کی زندگی کا معاملہ تھا۔“ وردی میں ملبوس شخص نے آگے بڑھتے ہوئے کہا اور اپنے سپاہیوں کو اشارہ کیا۔

”ان صاحب کو عزت کے ساتھ وین میں بٹھائو اور محترمہ آپ کو اپنے بیان کی تصدیق کے لیے ایک بار تھانے آنا پڑے گا۔ چلو سب جلدی کرو۔ ایک اور جگہ قتل کی تفتیش کے لیے بھی جانا ہے۔“

بڑھی ہوئی توند والے انسپکٹر نے کارروائی پوری کی اور واپس مڑنے لگا جب شہرام نے اسے مخاطب کیا۔

”حادثہ میری سپروائی سے ہوا ہے انسپکٹر صاحب۔ آپ اسے چھوڑ دیں پلیز۔“

”آپ کو جو بھی کہنا ہے تھانے آکر کہنا۔ ابھی مجھے اپنی ڈیوٹی پوری کرنے دیں۔“

انسپکٹر نے کچھ بھی سنے بغیر کہا اور ایڈی کو لے کر کمرے سے نکل گیا۔ جاتے جاتے ایڈم نے بہت سخت نظروں سے فارینہ کو دیکھا جس کے ہونٹوں پر فاتحانہ مسکراہٹ تھی۔

”تم نے یہ ٹھیک نہیں کیا فارینہ!“

شہرام نے تھک کر کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ عدنان اور فاخر نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور کندھے اُچکا کر رہ گئے۔ یہ معاملہ ان کی سمجھ سے باہر کا تھا۔

☆...☆...☆

”زویا آپنی پلیز وہ ڈانس اسٹیپ کیا تھا۔ ایک بار پھر بتا دیں۔“

عانیہ کی کزن نے اپنا لہنگا سنبھالتے ہوئے، اس کے پاس آکر کہا۔ جو عانیہ کے ساتھ پھولوں سے سجے جھولے میں بیٹھی تھی۔ منہدی کا فنکشن اپنے عروج پر تھا۔ خوشیوں اور میٹھے گیتوں کے رنگ ہر چہرے پر سجے ہوئے تھے۔ زویا نے جامہ وار کا کھلے گھیرے والا غرارہ پہنا ہوا تھا۔ اس کے ساتھ ہلکے گلابی رنگ کی گھٹنوں تک آتی قمیص اور اس پر پھیلا کر لیا بڑا سا ڈوپٹا تھا۔ گھنے سیدھے اور سلکی بال کمر تک آ رہے تھے۔ کانوں میں چاندی کے جھمکے پہنے وہ بہت سی نظروں کا مرکز تھی۔

”چلو۔ سب اپنی اپنی جگہ کھڑے ہو جاؤ!“

زویا نے ماہرانہ انداز میں کہا اور میوزک کے بجتے ہی اس نے اسٹیپ لیا۔ سب اسٹیج کی طرف متوجہ ہو گئے تھے۔

زویا گول دائرے میں گھوم رہی تھی۔ اس کا ڈوپٹا زمین کو چھو رہا تھا اور وہ کسی داسی سے کم نہیں لگ رہی تھی۔

شہرام کی آنکھوں میں کسی کا عکس لہرانے لگا۔ اس کی ہنسی، اس کی آنکھوں کی چمک، اس کے انداز، کچھ بھی تو ایسا نہیں تھا جو کسی سے ملتا ہی ہو۔ شہرام کا دل جانتا تھا کہ ”وہ“ صرف ”وہ“ ہی تھی اس کے لیے۔

وہ خاموشی سے ہجوم سے پیچھے ہٹا اس کے لب وہ مصرعے دہرا رہے تھے جو گانے کا حصہ نہیں تھے۔

”ہو نین دکھ بن دید کے

رہی لباباں پر جان۔

دیو عشق مبارکاں۔

موہے ساجن ملیا آن۔

شکر و نڈاں رے۔

اس کی آنکھوں میں ہلکی سی نمی اور ہونٹوں پر اداس سی مسکراہٹ تھی۔ وہ سر اٹھا کر ستاروں سے بھرے آسمان کو دیکھنے لگا۔

کہیں وہ بھی آسمان کو ایسے ہی سر اٹھا کر دیکھتی ہو گی۔

”کہنے کو کتنا کامیاب اور پاور فل ہوں، مگر۔۔۔“

اس نے گہری سانس لی۔

”مگر دنیا کی بھیڑ میں کھونے والے۔ سب سے قیمتی فرد کو تلاش ہی نہیں کر سکا

آج تک۔ ایسی گمنامی، ایسی گمشدگی جیسے کبھی اس کا وجود تھا ہی نہیں۔ وہ جو جان محفل تھی، جس کے حسن کے چرچے دور دور تک تھے، جس کی امارت شہر کے امرا میں مثال تھی، خاندانی حسب و نسب کی مالک وہ کوئی عام سی لڑکی تو نہیں تھی کہ دنیا کی بھیڑ میں کھو جاتی، مگر وہ اپنے سب نقش پامٹا کر گئی۔ کیا وہ سچ میں۔۔۔“

اس سے آگے اس کا دل کچھ بھی سوچنے یا ماننے کو تیار نہیں تھا۔ اسی وقت کسی نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ شہرام نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ کرنل ثقلین کیانی دوستانہ انداز میں مسکرا رہے تھے۔

”تنہائی اچھی چیز ہے برخوردار، مگر اس وقت ہر گز نہیں، جب آپ کے آس پاس، آپ کے منتظر بہت سے لوگ موجود ہوں۔ اندر چلیں۔“

شہرام نے مسکرا کر اثبات میں سر ہلایا اور ان کے ساتھ قدم بڑھاتا چل پڑا۔

بہت مگن سے انداز میں ہلکے ہلکے اسٹیپ لیتی وہ بہت خوبصورت لگ رہی تھی۔ وہ اس گانے میں ایسے ڈوبی ہوئی تھی جیسے اس کے دل کی آواز ہو۔ کب گانا ختم ہوا، کب لوگوں نے تالیاں بجائیں۔ اسے پتا ہی نہیں چلا۔ وہ صرف ایک شخص کی آنکھوں میں اپنے لیے ستائش دیکھنے کے لیے، اسے ڈھونڈ رہی تھی، مگر اتنے سارے لوگوں میں وہ اسے کہیں نظر نہیں آیا۔

زویا، مایوس سی ہو کر پلٹنے لگی۔ جب کسی نے اسے پیچھے سے پکارا۔

”تم سچ میں باکمال ہو زویا۔“

وہ ایک دم پلٹی۔ شہرام کے چہرے پر مسکراہٹ تھی۔ زویا کھل اُٹھی۔

”صبح تم ٹام بوائے کے حلیے میں مہارت سے گھڑ سواری کرتی نظر آ رہی تھی اور ابھی ماہرانہ انداز میں ڈانس کرتی تم نے سب کو پیچھے چھوڑ دیا ہے۔“ شہرام کے لہجے میں ستائش تھی۔

”بابا کہتے ہیں کہ انسان کو ہر فن مولا ہونا چاہیے۔ اسی لیے ہم نے ہمیشہ ہر کام بہتر سے بہتر انداز میں کرنے کی کوشش کی ہے۔“

زویا نے اعتماد سے جواب دیا۔

”اچھی بات ہے!“ شہرام نے لوگوں کے ہجوم پر ایک نظر ڈالی۔
 ”بائی داوے! گھڑ سواری کی طرح کیا آپ اس فن میں بھی کورے ہیں؟“
 زویا نے شرارتی انداز میں پوچھا، تو شہرام ہنس پڑا۔
 ”میں صرف کیمرے کی آنکھ سے ایسے منظر نظر بند کر سکتا ہوں اور کچھ بھی نہیں
 ۔“
 ”ہوں۔ ہمیں یقین تو نہیں مگر مان لیتے ہیں۔“
 زویا نے شاہانہ انداز میں کہا۔ وہ اس کا ٹالنا محسوس کر گئی تھی۔ شہرام دل میں اس
 کی ذہانت کا معترف ہوا تھا، مگر اس وقت وہ اندر سے جس ٹوٹ پھوٹ کا شکار تھا
 اس کے لیے کسی کا بھی سامنا کرنا بہت مشکل تھا۔ اس نے دور اسٹیج پر بیٹھے، رسمیں
 انجوائے کرتے انصب اور عانیہ کی طرف دیکھا اور خاموشی سے وہاں سے نکل کر
 اپنے روم کی طرف چلا گیا۔ کچھ دیر کے لیے ہی سہی مگر وہ خود کو تھوڑا وقت دینا
 چاہتا تھا۔ وہ دل کی دنیا میں تو تماشائے بن چکا تھا، مگر دنیا کی نظر میں نہیں بننا چاہتا
 تھا۔

☆...☆...☆

خان زادہ شمشیر اور نور بانو نے سب کو خدا حافظ کہا اور دروازہ کھول کر اپنی گاڑی
 کی طرف بڑھے۔
 ”سائیں“
 نور بانو نے بے ساختہ پکارا، تو کار کے دروازے کے ہینڈل پر ہاتھ رکھتے خان زادہ
 شمشیر نے مڑ کر دیکھا۔ کچھ فاصلے پر، ایک گھر کی ٹوٹی دہلیز پر وہ خاموشی سے سر
 جھکائے بیٹھا تھا۔ خان زادہ شمشیر کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ در آئی۔ نور بانو
 بے ساختہ اس کی طرف بڑھی تھیں۔
 ”سلام ماں جی“
 سائیں ان سے بے خبر نہیں تھا۔ پاس آنے پر فوراً سلام کیا۔ نور بانو نے اس کے
 سر پر ہاتھ رکھا۔
 ”میرا دل کہہ رہا تھا کہ تم ہم سے ملنے ضرور آؤ گے سائیں۔“
 نور بانو نے خوشی سے بھرپور لہجے میں کہا۔ سائیں نے نظریں اٹھا کر ان کی طرف
 دیکھا۔

”آپ کے دل کی آواز مجھ تک پہنچ گئی تھی ماں جی۔ اسی لیے چلا آیا۔“

سائیں کا لہجہ سادہ تھا، مگر اس کی آنکھوں میں ہلکی سی سُرخی تھی۔

خان زادہ شمشیر بھی ان کے پاس آکر کھڑے ہو گئے۔

”برخودار! اچھا ساتھ نبھایا۔ سہارا دے کر ایک دم سے ہی غائب ہو گئے، آج ملے ہو۔ جب ہماری روانگی کا وقت قریب ہے۔“

خان زادہ شمشیر نے اپنے مخصوص بارعب انداز میں کہا۔

”آپ سزا تجویز کریں۔ مجرم حاضر ہے۔“

سائیں نے سر جھکاتے ہوئے کہا۔

”تمہاری یہی سزا ہے کہ ساری زندگی، ہمارا ساتھ دیتے رہنا۔“

خان زادہ شمشیر کے چہرے پر اپنائیت بھری مسکراہٹ تھی۔ سائیں نے سر اٹھا کر

ان کے چہرے کی طرف دیکھا۔ جہاں آج کتنا سکون اور خوشی تھی۔ سائیں کو یاد آیا

کہ جب وہ پہلی بار خان زادہ شمشیر سے ملا تھا، تو وہ چہرے سے کتنے نڈھال اور

پریشان حال لگ رہے تھے، مگر بیٹے کی صحت یابی نے نئی زندگی پھونک دی تھی

ان میں۔ سائیں گہری سانس لے کر رہ گیا۔ اولاد کی محبت بھی کیا چیز ہوتی ہے۔ دل

کی ٹھنڈک بھی اور صبر کی آزمائش بھی۔ خان زادہ احمد دھیرے دھیرے چلتا ان

تک پہنچا، تو سب چونک کر اس کی طرف متوجہ ہو گئے۔

”میں نہیں جانتا کہ سچ میں آپ کے پاس کوئی فیض ہے یا نہیں، مگر میں صرف اتنا

مانتا ہوں کہ اللہ کو آپ کا مانگنا، دعا کرنا بہت محبوب ہے۔“ خان زادہ احمد نے نم

آنکھوں کے ساتھ کہا اور آگے بڑھ کر سائیں کے گلے لگ گیا۔ کچھ دیر کے لیے

سائیں ساکت ہی رہ گیا۔ یہ لوگ دینے میں بہت کھلے دل کے تھے۔ چاہے کچھ بھی

دیں۔

سائیں نے اسے خود سے الگ کر کے، اس کا کندھا تھپتھپایا۔

”اپنا وعدہ مت بھولنا سائیں۔ میں نے اسی لمحے سے تمہارا انتظار شروع کر دیا ہے۔

آنا ضرور۔“

نور بانو نے ایک الوداعی نظر اس کے چہرے پر ڈالی۔ ان کا دل چاہ رہا تھا کہ ابھی

کچھ دیر اور سہی مگر وہ اسے دیکھتی رہے۔

وہ لوگ باری باری سائیں سے مل کر رخصت ہوئے۔ گاڑی میں بیٹھ کر بھی نور بانو

اسے دیکھتی رہی۔ جب تک وہ نظر آتا رہا۔

اور ان کے جانے کے بعد سائیں اسی جگہ پر کتنی دیر ہی گم صم کھڑا رہا۔

کچھ لوگوں کے جانے سے یک دم ہی سب خالی خالی لگنے لگتا ہے۔

سائیں نے سر جھٹکا اور ”نعت خانے“ کی طرف قدم بڑھا دیے۔ جہاں ثریا بی بی بہت بے چینی سے اس کی منتظر تھیں کہ آج سائیں اپنے وقت سے بہت لیٹ ہو چکا تھا۔

☆...☆...☆

چوں کی زور دار آواز کے ساتھ کمرے کا دروازہ کھلا۔ ایڈم میگزین پر نظریں جمائے ارد گرد سے لا تعلق سا بیٹھا ہوا تھا۔ آنے والے نے کچھ دیر اس کی لا تعلق کو دیکھا۔ پھر اسے متوجہ کرنے کے لیے زور سے کھنکارا، مگر ایڈم نے کوئی رد عمل ظاہر نہیں کیا، تو آنے والا سوچ میں پڑ گیا۔

”کہیں اس نے بھی کان میں وہ ٹوٹنی تو نہیں لگائی ہوئی جس سے ہاتھ میں پکڑے بغیر فون سنتے ہیں۔“ کیا نام بتایا تھا میرے بیٹے نے، اس نے ذہن پر زور ڈالا مگر یاد نہ آنے پر جھنجھلا کر رہ گیا۔

”اس آلے کو بلیو ٹوٹھ ہینڈ فری کہتے ہیں۔“

ایڈم نے میگزین کے صفحے پلٹتے ہوئے سرسری انداز میں کہا، تو انسپکٹر تنویر شرمندہ ہو کر بلاوجہ ہی ہنسنے لگا۔ اسے عادت تھی اونچی آواز میں خود کلامی کرنے کی۔

”جی جی سرکار وہ ہی۔ دراصل میرے بچوں کو پتا ہے، ان چیزوں کا۔ ہم ٹھہرے پرانے دور کے سیدھے سادھے سے آدمی، ہمیں کیا پتا ایسی باتوں کا۔“ انسپکٹر تنویر نے مصنوعی پن سے کہا۔ قہقہے لگاتے ہوئے اس کا پیٹ ہلتا ہوا بہت مضحکہ خیز لگتا تھا۔

”ہم نہیں آپ۔ میں آج کے دور کا ہی فرد ہوں۔“

ایڈم نے کہا، تو انسپکٹر تنویر دل ہی دل میں اسے گالیاں دیتا، اثبات میں سر ہلانے لگا۔

”جی جی۔ ٹھیک کہا آپ نے سرکار۔“

”یہ آپ سچ میں اتنے سیدھے ہیں کہ ہر بات کے جواب میں جی جی کر رہے ہیں یا دل میں مجھے گالیاں دے رہے ہیں آپ۔“

ایڈم نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ انسپکٹر تنویر بل کھا کر رہ گیا۔

”اگر تجھ سے کام نہ ہوتا، تو تجھے اچھی طرح بتاتا کہ میں کیا چیز ہوں۔“

”نہیں جی۔ یہ لہجہ تو صرف آپ جیسے یار، دوست لوگوں کے لیے ہے۔ دشمنوں کے لیے تو انسپکٹر تنویر بہت کڑک ہے جی!“

اس نے اپنی بڑی بڑی مونچھوں کو بل دیتے ہوئے کہا۔

”نظر آ رہا ہے مجھے۔“

ایڈم نے سر ہلاتے ہوئے کہا، تو وہ خوشی سے کھل اٹھا۔

”آپ مجھے کبھی مجرم سے تفتیش کرتے ہوئے دیکھو جی۔ میرے ڈر سے قیدی وہ جرم بھی مان لیتے ہیں جو انہوں نے کیے ہی نہیں ہوتے۔“ اس نے فخریہ اپنا کالر اونچا کرتے ہوئے زور سے قہقہہ لگایا۔

”یہ پاکستانی پولیس کی وہ خوبی ہے جس کا مقابلہ دنیا کی کوئی پولیس نہیں کر سکتی۔“ ایڈم کا لہجہ تمسخرانہ تھا۔

”خیر چھوڑیں جی آپ کیوں ان خشک اور بور باتوں میں پڑ رہے ہیں۔ آپ تو فلم، ٹی وی کے بندے ہیں۔ کچھ محبت اور عاشقی کی باتیں کریں جو آپ کے مزاج سے میل بھی کھائیں۔“ انسپکٹر تنویر نے مکھن لگاتے ہوئے کہا۔

”اچھا تو یہ بات ہے۔“ ایڈم نے اثبات میں سر ہلایا۔

”دیکھیں جی میں تو اب فلمیں دیکھتا ہی نہیں۔ اس لیے مجھے آج کل کے لوگوں کے بارے میں کچھ خاص نہیں پتا۔“

اس نے گھوم کر اپنی کرسی کی طرف آتے ہوئے کہا۔ سر سے کیپ اتار کر میز پر رکھی اور اپنی کرسی پر بیٹھ کر اسے گھول گھول گھمانے لگا۔ کرسی بھی احتجاجاً آوازیں نکالنے لگی۔

”ایک زمانہ تھا جی۔ کیا دور تھا پنجابی فلموں کا۔ ہک ہا۔“

انسپکٹر تنویر نے گہری سانس لی اور کہا۔

”بڑی سی اسکرین پر جب سلطان راہی گھوڑے پر بیٹھا، اپنی ہیروئن کو بچانے آتا تھا، تو دیکھنے والے جوش سے تالیاں بجانے لگ جاتے تھے۔

کیا انداز تھا اس کا اور کیا زبردست بڑھک مارتا تھا۔

”مولاناں مولانا مارے، تے مولاناں مردا۔“

کیسے کیسے شاندار ڈائلاگ ہوتے تھے۔ کتنی خواہش تھی کبھی میری بھی کہ میں بھی فلم میں کوئی ایسا ہی کردار ادا کرتا مگر ہائے ری قسمت۔ کہاں سے کہاں لے آئی مگر وہ کیا ہے کہ...”

انسپکٹر تنویر ماضی سے حال میں واپس آتے ہوئے اس کی طرف متوجہ ہوا جو مسکراتی نگاہوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔

”میرے بیٹے کو بھی میری طرح ہی فلموں، ڈراموں میں کام کرنے کا بہت شوق ہے اور مجھے حوالدار رحمت نے بتایا ہے کہ آپ بہت مشہور فلم ڈائریکٹر ہیں۔ اگر آپ میرے بیٹے کو ایک چانس دے دیں، تو بڑی مہربانی ہوگی۔“

انسپکٹر تنویر کے انداز میں منت تھی۔ ایڈم گہری سانس لے کر رہ گیا۔ اس کا اندازہ درست نکلا تھا۔

”مگر وہ کیس!“ ایڈم نے کچھ کہنا چاہا۔

”کیس کو ماریں گولی جی۔ کسی اور پر ڈال دیں گے۔ آپ فکر ہی مت کریں۔ آج سے ہم میں رشتہ داری قائم ہوگئی ہے جی۔“

انسپکٹر تنویر نے سینہ تان کر کہا۔

”بہت شکریہ آپ کو یہ زحمت کرنے کی ضرورت نہیں۔ میں نے فون کر دیا ہے میرا وکیل کچھ دیر میں آتا ہی ہو گا۔“

ایڈم نے ابھی اپنی بات پوری ہی کہ تھی، جب اس کے وکیل حیدر بیگ نے اندر آکر اسے سلام کیا۔ انسپکٹر اسے دیکھ کر ایک دم ہی سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔

”یہ الو کا پٹھا! میری سوچ سے بھی زیادہ تیز نکلا۔“

انسپکٹر تنویر نے دل میں پیچ و تاب کھاتے ہوئے سوچا اور بہ ظاہر بہت سنجیدگی سے وکیل کی بات سنتے ہوئے کاغذ دیکھنے لگا۔

”اس سب کی ویسے بھی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ میں انہیں چھوڑنے ہی والا تھا۔“

اس نے فائل بند کرتے ہوئے کہا، تو ایڈم اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔

”وہ صاحب! آپ سے ایک گزارش کی تھی۔“

انسپکٹر تنویر نے پیچھے سے اسے آواز دی۔ ایڈم کچھ سوچ کر مڑا۔ اس کی آنکھوں میں شرارت کی چمک واضح تھی۔

”اپنے بیٹے کی بات چھوڑیں آپ۔ قابل ہو گا تو اسے ویسے بھی چانس مل جائے گا۔ آپ کی باتیں سن کر میرے ذہن میں آیا ہے کہ ایک زبردست سی پنجابی فلم بنائوں اور اس میں آپ کو ہیرو لوں۔“

بس آپ آج سے انتظار شروع کر دیں میری کال کا اور اگر آپ کو ڈانس نہیں آتا، تو وہ ضرور سیکھ لیں۔ باقی آپ فٹ ہیں۔“

ایڈم کہتے ہوئے دروازہ کھول کر کمرے سے باہر نکل گیا۔ اس کے وکیل کی آنکھوں میں پہلے حیرت اور پھر بے ساختہ مسکراہٹ در آئی تھی۔

جبکہ انسپکٹر تنویر حیرت کی شدت سے ، منہ کھولے اپنی جگہ کھڑا رہ گیا۔ اسے سمجھ ہی نہیں آئی تھی کہ وہ کیا کرے؟

”سر آپ ان حالات میں بھی مذاق کر رہے تھے۔ حیرت ہے۔“

حیدر بیگ نے کار کے پاس آکر کہا، تو ایڈم نے مڑ کر اس کی طرف دیکھا۔ اس کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ تھی۔

”مذاق ہم نہیں۔ وقت ہمارے ساتھ کرتا ہے۔ بہت شکریہ آپ کے آنے کا۔“

ایڈم نے وکیل حیدر سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔ وہ مڑ کر وہاں سے چلا گیا۔ ایڈم کی گاڑی بھی یہاں کھڑی ہوئی تھی جو شاید تلاشی کے غرض سے ہسپتال سے ساتھ لائی گئی تھی۔

”احمق لوگ۔“ انسپکٹر تنویر کی حالت کا سوچ کر ایڈم نے مذاق اڑاتے لہجے میں خود سے کہا۔

”کمال ہے بھئی۔ دوسروں کے حال پر ہنسنے والا ، اپنا حال کیوں بھول گیا ہے۔“

پیچھے سے آئی آواز پر ، ایڈم یک دم چونک کر مڑا۔

”تم یہاں بھی...“

وہ منگ چہرے پر مسکراہٹ لیے اسے دیکھ رہا تھا۔

☆...☆...☆

”یار انصوب تمہیں نہیں لگتا کہ آج موسم کچھ ابر آلود سا ہے۔“

انصوب جو ابھی ابھی عانیہ کی دوستوں اور کزنوں سے ”دودھ پلائی“ جیسا اہم معرکہ ہار کر ، پھر بھی خوشی سے چپک رہا تھا۔ شہرام کی بات پر اس کی طرف متوجہ ہوا۔ ”تجھے ہال کے اندر سے آسمان کہاں سے نظر آگیا میرے بھائی؟“

انصوب نے شہرام کی طرف ایسے دیکھا جیسے اس کی دماغی حالت پر شبہ ہو، مگر جب اس نے شہرام کی مسکراتی نظروں کو تعاقب میں دیکھا، تو ساری بات سمجھ گیا۔ عانیہ کے ساتھ بیٹھی زویا لاکھ کوشش کے باوجود اپنے آنسو نہیں روک پا رہی تھی۔ بھیگی بھیگی آنکھوں سے کبھی وہ تیزی سے پلکیں جھپکتی اور کبھی سر جھکا لیتی تھی۔ شہرام کی بات وہ سن چکی تھی۔ اس لیے خود کو کمپوز کرنے کی کوشش کرنے لگی۔

”ہائے میں قربان جانوں ایسی دوستی کے۔ رخصتی عانیہ کی ہو رہی ہے اور اُداس زویا ہے۔ اسے کہتے ہیں دوستی۔ ایک تم ہو صرف دور دور سے مسکرائے جا رہے ہو۔ کچھ شرم کر ویا۔“ انصوب نے شہرام سے کہا۔

”وہ اس لیے میرے بھولے دوست کہ مس زویا کی دوست رخصت ہوں گی۔ میرا دوست نہیں۔ لہذا میرے لیے یہ خوشی کا مقام ہے۔“ شہرام نے کہا تو دلہن بنی عانیہ نے سر اٹھا کر دونوں کو باری باری گھورا۔

”ایک لڑکی کے آنسوؤں پر رائے دینے کے بجائے اسے بہلانے کی کوشش کریں۔ آپ نہیں انصب صاحب! آپ شاید بھول رہے ہیں کہ آج آپ کی شادی ہے۔“ عانیہ نے دانت پیس کر انصب سے کہا جو عانیہ کی بات سن کر اپنی جگہ سے فوراً اٹھ کھڑا ہوا تھا، مگر پھر فوری بیٹھ بھی گیا۔ شہرام کا قہقہہ جان دار تھا جب کہ زویا بھی مسکراتے لگی۔ انصب اور عانیہ نے اطمینان سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔

”شہرام بھائی! زویا جب بھی اُداس ہوتی تو میں اسے آئس کریم کھلانے لے جاتی تھی اور آپ کو تو کہیں جانے کی زحمت بھی نہیں کرنا پڑے گی۔ سب کچھ یہاں حاضر ہے۔ جائو زویا! تم مزید تھوڑی دیر میرے ساتھ بیٹھی رہی تو میں نے بھی رونا شروع کر دینا ہے۔ سارا میک اپ خراب ہو جائے گا۔“

عانیہ نے اتنی سادگی سے کہا کہ وہ تینوں بے ساختہ ہنس پڑے۔ پھر زویا، شہرام کے ساتھ اسٹیج سے نیچے اتر گئی۔ عانیہ کے والد فاروق ملک کے ساتھ باتیں کرتے ہوئے، کرنل ثقلین کیانی نے ان دونوں کو دیکھا۔ وہ ساتھ چلتے ہوئے کتنے اچھے

لگ رہے تھے۔ ایک خواہش تھی جو شہرام کو دیکھ کر ان کے دل میں شدت سے ابھرنے لگی۔ زویا کے لیے رشتوں کی کمی تو نہیں تھی مگر نہ جانے کیوں شہرام میں انہیں کچھ الگ سے دکھتا تھا۔ شاید اس کے مزاج کی سادگی اور خلوص! جو آج کل نایاب ہو کر رہ گیا ہے۔ کرنل ثقلین کیانی کے دو بڑے بیٹے بھی آرمی میں تھے اور اپنی اپنی فیملیز کے ساتھ دوسرے شہروں میں پوسٹڈ بہت اچھی زندگی گزار رہے تھے۔ کرنل ثقلین کیانی کی بیوی، چار سال پہلے کینسر کے موذی مرض سے لڑتے لڑتے جان کی بازی ہار گئی تھی۔ تب سے کرنل ثقلین زویا کے لیے بہت حساس ہو گئے تھے۔ حالاں کہ وہ ان خوش قسمت والدین میں سے تھے جن کی اولاد، ان کی فرماں بردار اور قابلِ فخر ہوتی ہے۔ زندگی نے انہیں ہر طرح سے نوازا تھا۔ بس اب ایک آخری فرض زویا کی شادی ادا کرنا رہ گیا تھا۔ اس کے لیے انہیں جس گوہر نایاب کی تلاش تھی وہ لگتا تھا کہ اب شہرام پر آکر ختم ہو گئی ہے۔

”میں تو تمہیں بہت بہادر لڑکی سمجھتا تھا زویا مگر تم تو بہت عام سی، چھوٹے دل کی مالک نکلی۔ ویری اسٹریچ“۔۔۔

اداس بیٹھی زویا نے سر اٹھا کر اپنے سامنے بیٹھے شہرام کی طرف دیکھا اور پھر سر گھا کر اسٹیج کی طرف گھورنے لگی۔ عانیہ کی امی جس طرح اس کے آس پاس

فکر مندی اور محبت سے چکر لگا رہی تھیں۔ یہ بات بار بار اس کی آنکھیں نم کر رہی تھی۔ آج اسے اپنی ماں کی یاد شدت سے آئی تھی۔ وہ کوشش کر کے بھی اس اداسی سے نجات نہیں پاسکی تھی۔

”شہرام جن کی مائیں بہت دور چلیں جائیں نا، وہ اسی طرح بات بات پر رونے والے اور چھوٹے دل کے مالک بن جاتے ہیں، مگر خیر تم نہیں سمجھو گے۔“ زویا نے کہتے ہوئے اپنی توجہ آئس کریم کی طرف مبذول کر لی۔

”ٹھیک کہا تم نے زویا! میں کیسے سمجھ سکتا ہوں جب کہ میں نے بھی اپنے ماں، باپ دونوں کو ہی ایک ساتھ، ایک حادثے میں کھو دیا تھا۔ میں کیسے جان سکتا ہوں تمہارا درد۔“

زویا اپنی جگہ ساکت ہو گئی۔ جب اس نے سر اٹھایا، تو اسے شہرام کی خالی کرسی نظر آئی۔ اس نے فوراً ادھر ادھر دیکھا۔ شہرام اسے ہال سے باہر جاتا ہوا نظر آیا۔ وہ اپنی جگہ پچھتاوے کے احساس میں جلتی کڑھتی رہ گئی۔ کبھی کبھی ان جانے میں ہی سہی، مگر ہم دوسروں کے زخم اُدھیڑنے کا باعث بن جاتے ہیں۔ یہی آج اس سے ہوا تھا جس کا افسوس اسے کئی دن رہا۔

☆...☆...☆

”میری بات سن موہنی۔ مجھے تجھ سے بہت ضروری کام ہے۔“ موہنی مزار کی احاطے کی صفائی میں دوسری عورتوں کی مدد کروا رہی تھی۔ جب پیو نے پاس آکر اسے مخاطب کیا۔ گھونگٹ کی اوٹ سے موہنی نے اس کی طرف بے زاری سے دیکھا۔

”نہ جانے یہ کیوں ہر وقت میرے پیچھے پڑی رہتی ہے۔“ موہنی نے اکتا کر سوچا۔ ”کیا بات ہے۔ نظر نہیں آ رہا میں کام میں مصروف ہوں۔ تجھے بھی ابھی آنا ہوتا ہے۔“ موہنی نے چڑ کر کہا۔ پیو اسے کوئی سخت بات کہتے کہتے رک گئی اور دوبارہ ٹیٹھے لہجے میں بولی۔

”ذرا سی بات ہے۔ سن لے! پھر کرتی رہنا اپنے کام، میں نے کون سا تیرے ہاتھ پکڑ کر روک لینا ہے۔“

پیو لجاجت سے کہتے ہوئے اسے ایک طرف لے گئی۔

”ہاں اب بول۔“

موہنی نے گردن موڑ کر کام کرتی عورتوں کی طرف دیکھا۔ اس کا انداز ایسا تھا کہ جیسے اسے بہت جلدی ہو واپس جانے کی۔

”دیکھ موہنی! تو علی یار کی بہت پسندیدہ اور...“ پیو کی بات پر گردن موڑ کر موہنی نے دیکھا کہ وہ آخر کہنا کیا چاہتی ہے، مگر اسی وقت اس کے چہرے کا رنگ ایسے بدلا۔ جیسے اس نے کوئی خطرناک چیز دیکھ لی ہو۔

”ارے موہنی، تیرے دوپٹے پر سانپ کا بچہ چڑھا ہوا ہے۔ یہ دیکھ۔“

پیو نے جلدی سے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔ موہنی بھی اس اچانک افتاد پر گھبرا گئی۔ پیو نے آگے بڑھ کر اس کا دوپٹا کھینچ کر اتار دیا۔

”کہاں ہے سانپ؟“

موہنی نے خوف زدہ لہجے میں پوچھا۔

”شاید بھاگ گیا، تو دوپٹا اچھی طرح جھاڑ کر پہنا کر۔ اس پاس جنگل ہے نا۔ اس لیے احتیاط ضروری ہے۔“

پیو نے ہم دردی سے دوپٹا اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

موہنی کا دل اس کی طرف سے صاف ہو گیا تھا۔

”اچھا اب تم جائو اپنا کام ختم کرو۔ میں بھی چلتی ہوں۔“

پیو نے جلدی سے کہا اور مُڑ کر جانے لگی۔

”ہاں مگر تمہاری بات تو ادھوری رہ گئی پیو؟“

موہنی نے کچھ یاد آنے پر پوچھا، تو پیو گڑبڑا گئی۔

”آں... کچھ خاص نہیں۔ ابھی تو جا۔ ہم پھر بات کر لیں گے۔“

پیو نے ایسے کہا جیسے اسے کہیں پہنچنے کی بہت جلدی ہو۔ موہنی کندھے اُچکا کر چلی گئی۔

جب پیو نے اچھی طرح تسلی کر لی کہ اس کے واپس پلٹنے کا کوئی خدشہ نہیں رہا، تو وہ تیز تیز قدم اٹھاتی، محتاط نظروں سے ادھر سے ادھر دیکھتی مزار کے اسی ٹوٹے حصے کی طرف چلی گئی جہاں سائیں اکثر بیٹھا ہوا، سوچ و گیان میں نظر آتا تھا۔

”اتنی دیر کر دی تو نے آنے میں۔“

کالی چادر میں لپٹے شخص نے اچانک سامنے آ کر اس کا راستہ روکا تھا۔ وہ لمبا تڑنگا سا شخص جس کی سرخ آنکھیں اس کے نشے میں ہونے کو ظاہر کر رہی تھیں۔ اس نے پیو کو گھورا۔

”تُو بھی حد کرتا ہے دلاور! سوچ سمجھ کر ہی قدم اٹھائوں گی نا۔ اچھا یہ بول نکینہ کیسا لگا؟“

پیو کا لہجہ معنی خیز تھا اور آنکھوں میں شاطرانہ چمک۔

”وہ اس زمین کی تو نہیں لگتی پیو بیگم! اتنا حسن اور یہاں اس کھنڈر میں چھپی ہوئی ہے۔ ایک بار میرے ہاتھ لگ جائے، قسم سے وارے نیارے ہو جائیں گے۔“

دلاور کے لہجے کے ساتھ ساتھ، آنکھوں میں بھی خباثت تھی۔

”تو اپنے وعدے پر قائم رہنا۔ میں تیرا یہ کام بھی کر دوں گی۔ تو جانتا ہی ہے کہ آج سے پہلے بھی میں نے کتنی مہارت سے لڑکیاں یہاں سے غائب کی ہیں۔ بس تو میرا حصہ تیار رکھنا۔“ پیو نے مکروہ ہنسی ہنستے ہوئے کہا۔

”ہوں! مگر پہلے کی بات اور تھی۔ اس وقت یہ مزار اتنا آباد نہیں تھا اور یہ علی یار اور وہ سائیں بہت چوکس اور ہوشیار ہیں۔ بہت سوچ سمجھ کر اور دھیان سے کام کرنا۔ کسی کو ٹھجہ پر شک نہیں ہونا چاہیے۔ چل اب جا۔ میں جمعرات کو آؤں گا۔ مزار پر جب محفل سماع منعقد ہوگی۔“

دلاور نے چادر اچھی طرح اپنے گرد لپیٹتے ہوئے منہ بھی چھپا لیا۔ پیو نے سر ہلایا اور محتاط نظروں سے دیکھتی وہاں سے چلی گئی۔ دلاور اور پیو کئی سالوں سے یہ ہی کام کر رہے تھے، مگر کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہوتی تھی۔ مزار پر جب کبھی بھی بے سہارا اور حالات کی ستائی ہوئی عورتیں آتیں تو پیو جھوٹی ہم دردی جتا کر ان سے دوستی کر لیتی اور جو ہدف آسان لگتا کہ اس کے پیچھے آنے اور ڈھونڈنے والا کوئی

نہیں ہوگا، پیو اسے ورغلا کر دلاور کے حوالے کر دیتی۔ اس وقت علی یار کا دھیان ان باتوں کی طرف نہیں تھا۔ نہ ہی اس نے کبھی ایسا کچھ کرنے کا سوچا بھی تھا۔ یہ تو سائیں نے ایک مظلوم عورت کی فریاد کے پیچھے، اتنا بڑا قدم اٹھایا تھا اور اپنے ساتھ اسے بھی شامل کر لیا تھا۔ اس عورت کا قصہ بھی بہت دل خراش ہے۔

رضیہ اپنے سسرال میں ظلم و ستم سہتی وقت گزار رہی تھی، مگر وہ بانجھ تھی۔ اسی لیے اس کے شوہر نے دوسری شادی کرنے کا فیصلہ کرتے ہوئے، ایک شام دھکے دے کر اسے گھر سے نکال دیا۔ رضیہ یتیم لڑکی تھی۔ اس کے چچا نے بہ مشکل اس کی شادی کی تھی اور اب کوئی تعلق نہیں رکھا ہوا تھا۔ اسی لیے کئی سالوں سے وہ سسرال والوں کے ستم خاموشی سے سہتی چلی آرہی تھی۔ شوہر تو ظالم تھا ہی۔ اس کی ساس اور دونوں نندیں بھی اسے بہت بری طرح سے مارتی بیٹتی تھیں، مگر وہ دو وقت کی روٹی اور چھت کے لیے یہ ظلم سہتی رہی۔ محلے دار اس کے حالات سے واقف ہونے کے باوجود اس سے ہم دردی ہی کرتے تھے۔ کبھی کوئی اس ظلم کو روکنے یا اس کے حق میں آواز اٹھانے کے لیے آگے نہیں بڑھا تھا۔ وہ بھی ایک ایسی ہی شام تھی۔ جب اس کے شوہر مختار نے رضیہ کو مار مار کر، بالوں سے گھسیٹتے ہوئے گلی میں دھکا دے دیا۔ اس کی دوسری شادی میں رضیہ سب سے بڑی رکاوٹ

تھی جسے ہٹانے کے لیے یہ کرنا ضروری ہو گیا تھا۔ مختار نے قصہ ختم کرنے کے لیے اس پر بد چلنی اور زبان درازی کا الزام لگایا اور تین حرف بول کر اسے اپنی زندگی سے نکال دیا۔ آس پاس کے لوگ روتی بلکتی، منتیں کرتی رضیہ کو دیکھ کر افسوس تو کر رہے تھے مگر کسی میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ اسے سہارا ہی دے دیتا۔ سب کو یہ خوف تھا کہ کہیں یہ مصیبت ان کے گلے نہ پڑ جائے۔ رضیہ نیلوں نیل جسم کے ساتھ، کراہتی ہوئی زمین سے اٹھنے کی کوشش کرنے لگی۔ جب کسی نے اس کے سر سے اتری چادر اسے اڑھائی۔ رضیہ نے چونک کر دیکھا۔ ملگجے سے حلیے میں ملبوس سائیں اس کے سامنے کھڑا تھا۔ اس وقت وہ اس علاقے میں نیا تھا مگر اس کے بارے میں بہت سے لوگ جان چکے تھے۔ اس لیے آس پاس بت بنے لوگ عقیدت سے اس کی طرف بڑھے۔ سائیں نے ہاتھ کے اشارے سے انھیں روک دیا۔

”جب تم لوگ کسی مظلوم عورت کی مدد کے لیے آگے نہیں بڑھ سکتے، تو میرے لیے بھی ایسا کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔“

سائیں نے سخت لہجے میں کہا اور ایک نظر دروازے پر کھڑے رضیہ کے سسرال والوں پر ڈالی جن کے چہرے پر تمسخر بہت واضح تھا۔

”جو خود تیرے میرے در کی ٹھوکریں کھاتا ہو، وہ کسی کو سہارا دے گا۔ ہونہ۔“ مختار نے حقارت سے زمین پر تھوکا۔

”سہارا صرف خدا کی ذات دیتی ہے۔ لوگ صرف وسیلہ بنتے ہیں ... مگر تم جیسے لوگ اس بات کو کیسے سمجھ سکتے ہیں؟ چلو اٹھو بہن۔“

سائیں نے مختار کی بات کا جواب دینے کے بعد، رضیہ سے نرمی سے کہا اور اسے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔ رضیہ کی مدد کے لیے کچھ خواتین فوراً آگے بڑھیں اور پھر تجسس کے مارے ان کے ساتھ ساتھ ہی چلنے لگیں۔ سائیں تیز تیز قدموں سے چلتا ایک جگہ آکر رُک گیا۔

”ثریا بہن! تمہاری طرح یہ عورت بھی حالات کی ستائی ہوئی ہے۔ اگر بُرا نہ مانو تو کچھ دنوں کے لیے اسے اپنے پاس رکھ لو۔ بہت جلد میں اس کے رہنے کا بندوبست کر دوں گا۔“

ثریا ایک درمیانی عمر کی بیوہ عورت تھی جس کا شوہر پہلے یہ ہوٹل چلاتا تھا اور اس کے مرنے کے بعد جب تین جوان ہوتے بچوں کی ذمہ داری اس پر پڑی تو ثریا نے ہوٹل کا انتظام خود سنبھال لیا۔ وہ ایک بڑی سی چادر میں سر سے پائوں تک خود کو چھپائے، ہر کام کی نگرانی کرتی مگر پھر بھی وہ لوگوں کی حریص نظروں اور جملے

بازی سے محفوظ نہیں رہتی تھی اور تو اور اس کے شوہر کے ساتھ کام کرنے والے ملازم، اسے کمزور عورت سمجھ کر تنگ کرنے لگے تھے۔ اسی وجہ سے ثریا نے بہت سے نئے لوگوں کو بھی کام پر رکھا مگر معاملہ جوں کا توں رہا۔ پھر اللہ نے سائیں کو اس کے لیے رحمت کا فرشتہ بنا کر بھیجا۔ سائیں نے ثریا کو پس پردہ رہنے کا کہا اور آگے بڑھ کر خود سارا انتظام سنبھال لیا۔ آہستہ آہستہ سائیں نے بہت اچھے اور قابل اعتماد بندے کام پر رکھے جن کی نگرانی وہ خود کرتا، مگر سارا کنٹرول ثریا کے ہاتھ ہی میں تھا۔ سائیں کی وجہ سے اس کے بگڑے کام سنورنے لگے۔ پھر سائیں نے اس نعمت کدے میں ایندھن پہنچانے کا کام اپنے ذمے لے لیا۔ کیوں کہ کھانا پکانے کا سارا کام مختلف ضرورت مند عورتیں کرتی تھیں۔ لوگوں کے آرڈر اور سرونگ، لڑکے کرتے تھے۔ یہ کام ذرا مشکل تھا جسے سائیں نے اپنے سر لے لیا۔ وہ مخصوص وقت میں وہاں پہنچ جاتا۔ ثریا اس کی دل سے عزت کرتی تھی۔

”سو بسم اللہ! جب تک چاہے یہ میرے پاس رہ سکتی ہے۔ آپ بے فکر رہیں۔“ ثریا نے آگے بڑھ کر رضیہ کا ہاتھ تھما اور اپنے گھر کے اندر لے گئی۔ ساتھ آئی عورتیں ایک دوسرے سے باتیں اور تبصرے کرتی گھروں کو واپس لوٹ گئی تھیں۔ پھر سائیں نے علی یار سے اس مسئلے پر بات کی اور یوں مزار کا ایک حصہ تھوڑی

سے مرمت کے بعد ایسی خواتین کے لیے مختص کر دیا گیا، مگر سائیں اور علی یار جانتے تھے کہ یہ بہت بڑی ذمہ داری ہے جسے نبھانا آسان نہیں تھا۔ رضیہ مزار کے اسی مخصوص حصے میں رہتی تھی اور یہاں پر بہت سے کام کر دیتی تھی۔ اس کی زندگی بہت سکون اور عزت سے گزر رہی تھی جس کی تمنا اسے ہمیشہ سے تھی اور یہ سب سائیں کی بدولت ممکن ہوا تھا جس کے لیے اس کے دل سے دعائیں نکلتی تھیں۔

☆...☆...☆

”تم یہاں بھی پہنچ گئے؟ آخر تم چاہتے کیا ہو؟ کیوں میرا پیچھا کر رہے ہو؟“ ایڈم نے سارا دبا ہوا غصہ اس پر نکالا تھا۔ ملنگ کے چہرے پر موجود مسکراہٹ یک دم سے غائب ہو گئی۔ اس نے سنجیدہ نظروں سے سامنے کھڑے، بے زار چہرے والے ایڈم کی طرف دیکھا۔

”یہ بات میں بھی تو کہہ سکتا تھا۔ جہاں بھی میں ہوتا ہوں، تم وہاں کیوں پہنچ جاتے ہو؟“

”واٹ رلبش! مجھے کیا کرنا ہے تم جیسے ڈرامے باز آدمی کا پیچھا کر کے۔“

ایڈم نے ناگواری سے جواب دیا۔

”چلو مان لیتے ہیں مگر تم بھی اب یہ جان لو کہ بہت جلد تم خود مجھے تلاش کرتے ہوئے آؤ گے۔ یہ اس ڈرامے باز کا دعویٰ ہے۔“

ملنگ نے کہتے ہوئے اپنے ہاتھ میں پکڑا ڈنڈا زور سے فرش پر مارا جس سے سچچھن کی آواز پیدا ہوئی۔ جو شاید اس پر بندھے گھنگھروں کی وجہ سے تھی۔

”اس زندگی میں تو یہ ممکن نہیں۔ ہاں مگر تم انتظار کرتے رہنا۔ گڈ بائے۔“

ایڈم نے طنزیہ لہجے میں کہا اور اپنی کار کا دروازہ کھول کر اس میں بیٹھ گیا۔ کار بیک کرتے ہوئے اس نے جب بیک مرمر میں دیکھا تو چونک گیا۔ وہ ملنگ بڑی سی شاندار کار کا دروازہ کھول کر بیٹھ رہا تھا۔

”اگلی بار ملا، تو بچے گا نہیں میرے ہاتھوں سے۔“

ایڈم نے دانت پیستے ہوئے کہا اور کار کی سپیڈ بڑھا دی۔ رات گزر چکی تھی۔ وہ اپنے اپارٹمنٹ پہنچا، تو اسلم بے چینی سے اس کا منتظر تھا۔

”شکر ہے صاحب آپ آگئے۔ آپ کا فون بند تھا۔ شہرام صاحب نے کتنے ہی فون کیے آپ کا پوچھنے کے لیے۔“

اسلم نے جلدی جلدی بولتے ہوئے کہا۔

”میں سونے جا رہا ہوں۔ کسی کا بھی فون آئے، مجھے ڈسٹرب مت کرنا۔“

ایڈم نے سختی سے کہا اور اپنے کمرے میں جا کر زور سے دروازہ بند کر لیا۔ اسلم فکر مندی سے گہری سانس لے کر رہ گیا۔

”جی صاحب! وہ سونے چلے گئے ہیں۔ انہیں ابھی تک کچھ پتا نہیں چلا۔ جی میں ایسا ہی کروں گا۔“

اسلم نے دوسری طرف سے بات سنتے ہوئے کہا اور ایک دو باتوں کے بعد فون بند کر دیا۔ اس نے فوراً پورچ میں جا کر دیکھا۔ آج کا اخبار آچکا تھا۔ اسلم نے جلدی سے اٹھایا۔ شہرام کا اندازہ درست تھا۔ فرنٹ بیچ پر ایڈم، فارینہ اور شہرام کے واقعے کو نمک مرچ لگا کر شائع کیا گیا تھا۔ یہ وہ پہلا شگاف تھا جو دنیا والوں کو ان کی دوستی میں نظر آیا۔ اس کے بعد گوسپ کا نہ رکنے والا سلسلہ شروع ہو گیا۔

☆...☆...☆

”سر آپ سے ملنے کوئی خاتون آئیں ہیں۔ میرے منع کرنے کے باوجود اندر آنے پر ضد کر رہی ہیں۔“

شہرام اپنی فلم کی ایڈٹنگ میں بری طرح کھویا ہوا تھا۔ جب اس کے پی۔اے نے اندر آ کر جھجکتے ہوئے کہا۔

”وہ ”خاتون“ ضد کر نہیں رہی بلکہ اندر آ بھی گئی ہے اور کیا سچ میں ہماری شخصیت خاتون جیسی ہے۔“

زویا نے پہلے اس کے پی۔اے کی طرف دیکھ کر طنزیہ کہا اور پھر شہرام کی طرف متوجہ ہو کر معصومیت سے پوچھنے لگی۔

شہرام کے ہونٹوں پر مسکراہٹ رنگ گئی۔ اس نے اپنے پی۔اے کو جانے کا اشارہ کیا۔

”خیریت خاتون! آپ آج یہاں کیسے؟“

شہرام کا انداز بہ ظاہر سنجیدہ تھا، مگر آنکھوں میں شرارت ناچ رہی تھی۔

”بابا کہتے ہیں کہ ہمارا نشانہ بھی بہت اچھا ہے۔ کیا خیال ہے آزما کر دیکھو؟“

زویا نے میز پر رکھے نازک سے گلدان پر اپنی مخروطی انگلیاں پھیرتے ہوئے کہا۔

”اوکے میں ڈر گیا محترمہ۔“

شہرام نے ہنستے ہوئے اپنے دونوں ہاتھ اٹھائے تھے۔ زویا مسکراتے ہوئے اس کے

سامنے بچھی کر سی پر بیٹھ گئی۔ اسی وقت دروازہ کھٹکھٹا کر مبشر اندر داخل ہوا۔ وہ زویا

کو دیکھ کر ٹھٹک کر رک گیا۔

”آجاؤ مبشر۔“

شہرام نے اسے اجازت دی اور اس نے آگے بڑھ کر ہاتھ میں پکڑی کنٹریکٹ فائل میز پر رکھی۔ ایک نئے پروجیکٹ کے لیے کچھ نئے چہروں کو کاسٹ کیا جا رہا تھا جس کے کنٹریکٹ پیپرز شہرام نے منگوائے تھے۔

”ہوں! ٹھیک ہے۔ آپ یہ فائل کر دیں اور اسکرپٹ کی ایک ایک کاپی انہیں ڈلیور کر دیں۔ میں چاہتا ہوں کہ شوٹنگ شروع ہونے سے پہلے وہ سب اپنے اپنے کرداروں سے اچھی طرح واقف ہوں باقی کسی دن ایک میٹنگ رکھ لیتے ہیں جس میں مزید ڈسکشن کر لیں گے۔“

شہرام نے مصروف سے انداز میں کہا۔ مبشر سر ہلا کر رہ گیا اور کن انکھیوں سے زویا کو دیکھتے ہوئے کہنے لگا۔

”سر میرے خیال سے ان سے بھی کنٹریکٹ سائن کروا لیتے ہیں۔“

”کافی فضول خیال ہے آپ کا مسٹر مبشر!“

شہرام نے اسے گھورتے ہوئے فائل اس کی طرف بڑھائی۔

”میرا کیا ہے سر! آپ ہی کا فائدہ سوچ رہا تھا۔ ہر بار اتنے لوگوں کے آڈیشن لیتے

ہیں پھر بھی کوئی پسند نہیں آتا۔ اب اگر اللہ نے مہربانی سے ایک پری بھیج ہی دی

ہے، تو موقع کا فائدہ نہ اٹھانا کہاں کی عقل مندی ہے، مگر بھئی ہماری کون سنتا ہے۔“

مبشر نے منہ بنا کر کہتے ہوئے فائل پکڑی اور ایک افسوس بھری نظر ان پر ڈالتا کمرے سے نکل گیا۔

زویا بے ساختہ کھکھلا کر ہنس پڑی۔ شہرام کے چہرے پر بھی مسکراہٹ تھی۔ ہنستے ہنستے زویا کی آنکھیں جھجک گئی تھیں۔

شہرام بہت دلچسپ نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔

”تمہاری ٹیم کے لوگ بھی کمال ہیں۔“ زویا کے لہجے میں ستائش تھی۔

”ہاں ٹھیک کہا تم نے۔ میں اس معاملے میں خوش قسمت ہوں کہ مجھے ہمیشہ بہت اچھے لوگوں کا ساتھ نصیب ہوا ہے۔ خیر تم بتاؤ کہ کیسے آنا ہوا، سب ٹھیک ہے نا؟“ شہرام نے پوچھا تو زویا اسے گھور کر رہ گئی۔

”زیادہ فارمل ہونے کی ضرورت نہیں مسٹر۔ ایک ہفتہ ہو گیا ہے تم سے بات ہوئے۔ عانیہ اور انصب تو ہنی مون پر گئے ہی ہیں۔ تم بھی کہیں غائب ہو گئے ہو۔ اس ویک اینڈ پر بابا اور ان کی خوب صورت بیٹی تمہارا لہجہ پر انتظار کریں گے۔“

وقت پر آ جانا اور ہاں بابا کی خوب صورت بیٹی کو پھول بہت پسند ہیں اور اس کے لیے پھول لانے والوں کو، اس کے ہاتھ کی بنی اسپیشل کافی بھی ملتی ہے۔“

زویا نے اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے، اپنے مخصوص تحکمانہ انداز میں کہا۔

”اچھا اگر بابا کی بیٹی خوب صورت ہیں تو محترمہ آپ کون ہیں؟“

شہرام نے اس کی باتوں پر مسکراتے ہوئے سوال کیا۔ دروازے کی طرف جاتی زویا نے پلٹ کر اس کی طرف دیکھا۔

”میں؟“ زویا نے پوچھا تو شہرام نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔

”جی آپ محترمہ۔“

”ابھی تو کہا ہے کسی نے۔ پری ہوں میں۔“

زویا نے خوبصورت مسکراہٹ کے ساتھ جواب دیا اور ہاتھ ہلاتی وہاں سے چلی گئی۔ جب کہ شہرام کتنی ہی دیر بیٹھا اس کی باتوں سے محفوظ ہوتا رہا۔

☆...☆...☆

”علی یار میں کچھ دنوں کے لیے یہاں سے رخصت چاہتا ہوں مگر...“

علی یار اور سائیں دونوں مزار کے ٹھنڈے فرش پر بیٹھے تھے۔ جب کافی دیر چپ رہنے کے بعد سائیں نے کہا تو علی یار نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

”سب خیر ہے سائیں۔“

علی یار کے لہجے میں تشویش تھی کیوں کہ اس کے ساتھ رہتے ہوئے علی یار یہ تو جان چکا تھا کہ وہ دنیا میں بالکل اکیلا ہے۔ اس کے آگے پیچھے غیر تو بہت سے ہیں، مگر اپنا کوئی ایک بھی نہیں۔

”ہاں سب خیر ہی ہے۔ بس کسی سے وعدہ کیا تھا کہ ایک بار ہی سہی، مگر اس سے ملنے ضرور آؤں گا۔ بس وہ وعدہ ہی اب راتوں کو سونے نہیں دیتا۔“

سائیں نے اُداسی سے کہا۔

”ایسا وعدہ کیوں کیا سائیں جو دل پر بوجھ بن گیا ہے؟“

علی یار نے فکر مندی سے پوچھا۔ سائیں کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔

”علی یار! کبھی بھرے پیالے کو غور سے دیکھا ہے؟ چاہے جتنی بھی احتیاط کر لو، چھلکتا ضرور ہے۔ اسی طرح محبت سے بھرا دل کتنا بھی سنبھال کر رکھ لو، ذرا سی ٹھیس لگنے سے ٹوٹے گا ضرور اور میں نہیں چاہتا کہ میری وجہ سے میرے انتظار میں کسی کا محبت بھرا دل ذرا سا بھی چھلکے۔“

”سب کے دل کی فکر ہے، ایک میرے دل کا کیا سائیں۔“

پاس آتی موہنی کے کانوں میں لباس کے الفاظ پڑے تو بے اختیار اس کے منہ سے نکلا۔ علی یار نے ایک دم پلٹ کر کالے لباس میں، بڑا سا گھونٹ نکالے پیچھے کھڑی موہنی کو دیکھا۔ جب کہ سائیں نے اسے دیکھنے کے بجائے سر جھکا لیا تھا۔ موہنی کے دل کو تکلیف پہنچی۔

”کیسا محبوب ہے۔ بے خیالی میں بھی ایک سرسری سی نظر بھی نہیں ڈالتا۔ کیا اس کی کوئی نظر میرے عکس کے لیے نہیں بنی۔“

موہنی کا دل چاہا کہ وہ دھاڑیں مار مار کر روئے۔ ایسی بھی کیا لا تعلقی، ایسی بھی کیا بے نیازی، آخر ہے تو بندہ بشر ہی۔ کون سا اسے ولایت مل گئی تھی یا وہ ولی بن گیا تھا کہ اتنا بے نیاز بنتا تھا۔ ”آج موہنی کے دل کی جلن عروج پر تھی۔“

”کیا بول رہی ہے تُو اور کس سے؟“ علی یار نے کڑے تیوروں کے ساتھ اس کے طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

”میں تو صرف یہ عرض کر رہی تھی کہ سائیں سب کا اتنا خیال رکھتے ہیں، مگر مجھے جس کام کے کرنے سے خوشی ملتی ہے اسی سے منع کر دیتے ہیں۔ میں کتنے شوق سے سائیں کے لیے حقہ بناتی تھی مگر اب اس سے بھی منع کر دیا ہے۔ اگر میرا

وجود اتنا ہی ناگوار لگتا ہے تو میں یہاں سے چلی جاتی ہوں۔ ”موہنی کا لہجہ روہانسا ہو گیا مگر سائیں ایسے اپنے گیان میں گم تھا جیسے کچھ سن ہی نہیں رہا۔

”سچ میں پگی ہے تو۔ خود سے ہی مفروضے قائم کر لیتی ہے۔ ارے پگی سائیں نے حقہ پینا ہی چھوڑ دیا ہے اور یہاں کرنے والے کام بہت سے ہیں۔ تو کچھ اور کر لے۔ خلق خدا کی خدمت ہی اصل مقصد ہے نا ہمارا۔ دیکھ تو کتنے دکھی دکھی لوگ موجود ہیں آس پاس۔“ علی یار نے نرمی سے اسے سمجھایا۔ موہنی نے خاموشی سے اس کے بات سنی اور بے دلی سے سر اثبات میں ہلاتی واپس جانے کے لیے مڑ گئی۔

”کل تیرے تشنگاں سے یہ کیا معجزہ ہوا

دریا پر ہونٹ رکھے، تو دریا تمام سُند!“

پیچھے سے آتی گمبھیر اور سوز میں ڈوبی آواز پر موہنی کے قدم رُک گئے اور وہ فوراً پلٹی۔ سائیں اپنے مخصوص انداز میں آنکھیں بند کیے بیٹھا تھا، مگر اس کے لب آہستہ آہستہ ہل رہے تھے۔ علی یار بہت عقیدت سے سر جھکائے اسے سنتے ہوئے سر دھن رہا تھا۔ موہنی ٹکٹکی باندھے اسے دیکھنے لگی۔

”دنیا تو ایک برف کی سل کے سوانہ تھی

پہنچی ذرا سی آج، تو دنیا تمام سُند!“

عشاق پر یہ اب کے عجب وقت آ پڑا
مجنوں کے دل سے حسرت لیلیٰ تمام سُند!
شہر دل تباہ میں پہنچوں تو کچھ کھلے
کیا بچ گیا ہے راکھ میں، اور کیا تمام سُند!
ہم شہر جاں میں آخری نغمہ سنا چکے
سمجھو کہ اب ہمارا تماشا، تمام سُند!“

”اللہ نہ کرے۔“ موہنی کا دل دہل گیا اور بے ساختہ اس نے دعا مانگی تھی۔ سائیں کی آنکھوں کے غم کنارے وہ دیکھ چکی تھی۔ خود پر ضبط نہ رہا تو وہ تیزی سے مڑی اور بھاگتی ہوئی وہاں سے چلی گئی۔ اس کے دوڑتے قدموں کی چاپ نے کسی کے دل میں خاموشی کی جھیل میں دور تک دائرے بنائے تھے اور دل کے پانی میں بننے والے دائرے، آنکھ کی سطح تک ضرور سفر کرتے ہیں۔ بس دیکھنے والی آنکھ چاہیے۔ یہ اشارے جتنے عام ہوتے ہیں، ان کے دیکھنے کے لیے اتنی ہی خاص نظر کی ضرورت ہوتی ہے۔

جیسے بہت عام سے نظر آنے والے لوگوں کے لیے ، بہت سی نظریں خاص ہوتی ہیں۔ جیسے کہ سائیں تھا۔ بہ ظاہر کچھ نہ ہوتے ہوئے بھی ، بہت سی نظریں اس کی منتظر رہتی تھیں۔

جیسے کہ کسی بہت خاص نظر آنے والے لوگوں کے لیے ، بہت اپنے کی عام سی نظر بھی نہیں ہوتی۔ جیسے کہ موہنی تھی۔

دیکھنے میں خاص مگر وہ جس عام سی نظر کے لیے ترستی تھی وہ اتنے عرصے میں کبھی اس کا نصیب نہیں بنی۔

☆...☆...☆

”یہ اچھا نہیں ہوا شہرام۔“

ایڈم نے غصے سے ٹی وی کاریموٹ دور پھینکا اور اسی عالم میں کمرے میں چکر کاٹنے لگا۔ شہرام فروٹ سیلڈ کا بائول سامنے رکھے مزے سے کھا رہا تھا۔

”میں کچھ کہہ رہا ہوں۔“ ایڈم اس کے سر پر کھڑے ہو کے چلایا تھا۔ شہرام نے ڈرنے کی ایکٹنگ کی۔

”سن لیا ہے میں نے۔ اب کیا کروں؟ اگر میرے فروٹ سیلڈ نہ کھانے سے تمہارا مسئلہ حل ہو جائے گا، تو یہ لو نہیں کھاتا۔ اسلم او اسلم لے جا یہ بائول میری آنکھوں کے سامنے سے۔ نہ سامنے ہو گا اور نہ میں ترسوں گا۔“

آس پاس منڈلاتے اسلم نے فوراً انٹری دی۔

”میں یہ ظلم ہوتے ہوئے نہیں دیکھ سکتا صاحب۔“

اسلم نے جذباتی پن سے کہا۔ ایڈم نے سخت نگاہوں سے اسے گھورا، تو وہ کھسیانا ہو کر وہاں سے کھسک گیا۔

”تم بھی اب یہ ڈرامے بازی بند کرو اور میری بات سنجیدگی سے سنو۔ یار تم اچھی طرح جانتے ہو ہمارے آنے والے ڈریم پروجیکٹ کے لیے یہ اسکیڈل۔“

ایڈم نے جھنجھلا کر کہنا چاہا مگر شہرام اس کی بات کاٹتے ہوئے بولا۔

”بھڑ میں گیا ڈریم پروجیکٹ۔ یہاں میرے ڈریم کے تنکے تنکے بکھر گئے ہیں اور تمہیں اپنی پڑی ہوئی ہے۔“

شہرام نے تپ کر کہا تو ایڈم کے ہونٹوں پر ہنسی اُٹ آئی۔

”ہنس لے، آج دل کھول کر ہنس لے۔ میری شادی کی تاریخ آگے نہ ہوتی تو تجھے ہنسنے کا موقع بھی کہاں ملنا تھا۔“ شہرام نے غصے سے کہا۔ اب کی ایڈم کی ہنسی قہقہے میں بدل گئی تھی۔ کچھ دیر شہرام اسے دیکھتا رہا پھر خود بھی مسکرانے لگا۔

”میں بھی آجائوں صاحب۔ قسم سے کافی دن ہو گئے، کھل کر ہنسے ہوئے۔“

اسلم نے دروازے سے سر نکال کر کہا۔ شہرام نے پاس پڑا کشن اسے دے مارا جو اس کے وہاں سے فوراً غائب ہو جانے کی وجہ سے دروازے کو لگ کر قالین پر گر گیا۔ ایڈم نے شہرام کے ہاتھ سے فروٹ سیلڈ کا بائول پکڑا اور مزے لے لے کر کھانے لگا۔

”میرا جھوٹا مت کھا۔ مجھے محبت کی بیماری ہے پیارے۔ کہیں تجھے بھی نہ لگ جائے۔“ شہرام نے اسے ڈرایا تھا۔

”کوئی بات نہیں یار۔ کچھ مرض ہنس کر قبول ہوتے ہیں۔ بس طیب من پسند ہونا چاہیے۔“

ایڈم نے کہا تو شہرام نے سیدھے ہوتے ہوئے، غور سے اسے دیکھا۔

”مجھے کسی گڑ بڑ کی بو آرہی ہے۔ کیا دال میں کچھ کالا ہے؟“

”کالی دال تجھے ہی مبارک ہو بھائی۔ مجھے دالیں پسند نہیں ہیں۔“ ایڈم نے منہ بناتے ہوئے کہا۔

”جی آخر امریکا کے مشہور بزنس مین ہیں آپ! آپ کو کہاں ہماری غریب اور مسکین دالیں پسند آتی ہیں۔“

”جن کی قیمتیں روز بہ روز آسمان سے باتیں کر رہی ہیں۔“

اسلم نے چائے کی ٹرالی اندر لاتے ہوئے جواب دیا۔

”ویسے اسلم صاحب! آج کچھ زیادہ ہی فارم میں نظر نہیں آرہے ہیں۔“

شہرام نے اسے گھورتے ہوئے پوچھا۔ جس کے آج دانت اندر ہی نہیں جا رہے تھے۔

”اصل وجہ تم بتائو گے یا وہی لیکس کا رول مجھے ادا کرنا پڑے گا۔“

ایڈم نے چائے کی ٹرالی پر نظر دوڑاتے ہوئے سوال کیا۔ تین دن سے سوائے غصے اور بلیک کافی کے اس نے نہ کچھ کھایا اور نہ کچھ پیا تھا۔ اسی لیے اب اسے بہت زور کی بھوک لگ رہی تھی۔

”وہ کون ہے جی؟“ اسلم نے باری باری سرونگ پلیٹس دونوں کو پکڑائیں۔

”کوئی نہیں ہے۔ تم اپنی بات کرو۔“

شہرام نے بریڈ اسکوائر کا مزہ لیتے ہوئے کہا۔
”صاحب جی! اماں نے گائوں میں میری بات پکی کر دی ہے۔ مامے کی بیٹی کے ساتھ۔“

اسلم نے شرماتے ہوئے بتایا۔

”مبارک ہو میرے بھائی۔ چلو کسی کے تو سہرے کے پھول کھلیں گے۔“

شہرام نے حسرت بھرے لہجے میں کہا۔ اسلم مبارک باد وصول کرتا ہوا، کمرے سے باہر چلا گیا۔

بات کہاں سے شروع ہوئی اور کہاں پہنچ گئی تھی۔ شہرام یہ ہی چاہتا تھا کہ تین دن پہلے فارینہ کی احمقانہ حرکت کی وجہ سے جو تکلیف اور اذیت ایڈم نے اٹھائی تھی، اس کا ازالہ ہو جائے۔ اسی لیے آج وہ سب کے لاکھ منع کرنے کے باوجود، اپنی چوٹوں کی پروا کیے بغیر اس کے پاس پہنچ گیا تھا اور اس کی یہ کوشش رائیگاں نہیں گئی تھی، تھوڑا وقت لگا مگر ایڈم نارمل ہو ہی گیا تھا۔
”ویسے کبھی کبھی مجھے ایک بات کی بالکل سمجھ نہیں آتی۔“

شہرام نے کچھ سوچتے ہوئے سوال کیا۔

”وہ کیا؟“

ایڈم نے سگریٹ سلگاتے ہوئے شہرام کی طرف پیکٹ بڑھایا مگر شہرام نے معذرت کر لی۔ وہ ایسی تمام خرافات سے بہت دور رہتا تھا۔

”لوگ اچھے مستقبل کی تلاش میں یورپین ممالک کی طرف جاتے ہیں اور تم اپنا سیٹ بزنس، اپنے قابل اعتماد عملے پر چھوڑ کر یہاں آ کر بیٹھے ہوئے ہو۔ مانا کہ تمہیں کچھ تجربات کرنے کا بہت شوق تھا مگر پھر بھی۔“

شہرام نے الجھتے ہوئے سوال کیا۔ سگریٹ کا دھواں اُڑاتے ایڈم نے بہت گہری نگاہوں سے اسے دیکھا تھا۔

”سچ کہوں تو سوچا میں نے بھی کچھ ایسا ہی تھا، مگر بہت بعد میں جا کر سمجھ میں آیا کہ ایک سلسلہ دوسرے سلسلے سے جڑا ہوتا ہے۔ جیسے ایک کڑی، دوسری کڑی سے۔“

ایڈم نے سر اوپر اٹھا کر پیچھے ٹیک لگا لی۔ اب اس کی نظریں چھت پر لگی روشنیوں پر تھیں، مگر جب وہ بول رہا تھا تو اس کا لہجہ بہت کھویا کھویا سا تھا۔ شہرام نے پہلی بار اسے اس انداز میں دیکھا تھا۔ اس کی آنکھوں میں حیرت بہت واضح تھی، مگر ایڈم اس سے قطعی بے خبر اپنی ہی دھن میں بول رہا تھا۔

”پہلے میں سوچتا تھا کہ میرا سفر بہت آگے سے آگے کا ہے۔ میری مثال اس پرندے کی طرح ہے جسے پر ملتے ہی اپنے سامنے وسیع، بیکراں آسمان کی پرواز کرنے کا موقع قسمت نے اپنی مہربانی سے دیا، تو مگر اس پرندے کی پرواز صرف وہاں تک ہی تھی جہاں تک اس کی ڈور جاسکتی تھی۔

اور تم جانتے ہو شہرام! ہم کتنے بھی طاقتور ہو جائیں، کتنی بھی خود سری دیکھا لیں، دعویٰ کر لیں، مگر اپنی اپنی ڈور کے ہاتھوں، اپنی اپنی ڈور کے سامنے، اپنی اپنی ڈور کے لیے ہم سب ہی مجبور و محکوم ہوتے ہیں۔

حالاں کہ ذرا غور سے دیکھو تو ڈور بظاہر کتنی باریک اور نازک سی ہوتی ہے مگر وہ ڈور، جب چاہے بہت آسانی سے ہماری آتی جاتی سانسوں کو کاٹ سکتی ہے۔ تلوار سے زیادہ تیز دھار ہوتی ہے اس ڈور کی۔

بس ایسا سمجھ لو میں بھی کسی ایسی ہی نازک سی ڈوری سے بندھ گیا ہوں جس سے دوری کا خیال ہی میری سانسوں کو توڑنے کے لیے کافی ہے اور اس بات کا اندازہ مجھے یہاں آکر ہوا۔ اسی لیے تو واپسی کا راستہ بھول گیا ہوں۔“

ایڈم کے چہرے اور آنکھوں میں جنوں کے آثار بہت واضح تھے۔ شہرام اپنی جگہ ساکت بیٹھا رہ گیا۔

”مجھے آج تک اندازہ ہی نہیں ہو سکا کہ میرے ساتھ ایک چلتا پھرتا انسان نہیں، آتش فشاں ہے۔“

شہرام کا لہجہ بہت سنجیدہ تھا۔ ایڈم نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس کے اندر ایک آگ سی جل اٹھی تھی، وہ آگ جو اسے مدتوں سے جلاتی رہی تھی مگر خاک نہیں کرتی تھی۔ وہ آگ جو اس کے وجود سے ہوتے ہوتے دل تک پہنچ چکی تھی۔

اس کا دل شعلوں کی لپیٹ میں تھا۔ اس کی تپش سے گھبرا کر، اب اس کا دل کرتا تھا کہ سب کچھ فنا کر دے، مٹا دے ہر چیز کو۔

ایک بے چینی، ایک پارہ تھا جو اسے سکون سے بیٹھنے نہیں دے رہا تھا۔ ”ایڈی! شہرام جب موڈ میں ہوتا، تو اسے پیار سے ایڈی کہتا تھا۔ ایڈم نے نیم وا آنکھوں سے اس کی طرف دیکھا۔

”ایڈی! تم نے یہ تو بتایا ہی نہیں۔ تمہاری وہ نازک، تلوار سے تیز دھار، ڈور کون ہے؟“

شہرام کی آنکھوں میں تجسس کے بادل لہراتے صاف نظر آرہے تھے۔ ”شہرام! وقت آنے دو، سب بتا دوں گا۔“

ایڈی نے دوبارہ اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ اسے سخت نیند آرہی تھی۔ وہ ابھی سونا چاہتا تھا۔ سب کی نظروں سے بچنا چاہتا تھا۔
”وعدہ کرو!“ شہرام نے آج پہلی بار ضد کی تھی۔ نہ جانے کیوں؟ وہ خود نہیں سمجھ سکا۔

”ہوں! وعدہ رہا۔ چاہے آخری سانس ہی باقی بچی ہو، میں اپنا وعدہ ضرور پورا کروں گا۔“

ایڈی نے آنکھیں کھول کر مضبوط لہجے میں اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا اور دوبارہ آنکھیں موند لیں۔ تھوڑی ہی دیر میں اس کی گہری ہوتی سانسوں کی آواز آنے لگی تو شہرام بہت آہستگی سے اپنی جگہ سے اٹھا۔ بہت محبت سے اس نے ایڈم کا سوگوار سا چہرہ دیکھا۔ اس کے چہرے پر بچوں جیسی معصومیت اور بھولپن تھا۔ اس کی گھنی پلکیں اور چہرے کے نقوش، بالکل لڑکیوں جیسے تھے۔

اپنی مثال پر شہرام خود ہی ہنس پڑا۔ اس نے آگے بڑھ کر آہستگی سے اس کی پیشانی پر آئے بال ہٹائے اور اسلم کو اس کا خیال رکھنے کی ہدایت دے کر اپنے ڈرائیور کے ساتھ، گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔ جہاں سب اس کے انتظار میں بیٹھے ہوئے

تھے۔ اس کی تکلیف کے احساس کی وجہ سے شمرہ نے ضد کر کے ڈرائیور کے ساتھ اس آنے دیا تھا۔ سب کی بے تحاشا محبت اور فکر کے بارے میں سوچتے ہوئے شہرام خود کو دنیا کا خوش نصیب انسان سمجھ رہا تھا۔ اس نے دل ہی دل میں شکر ادا کیا کہ فارینہ کی بدگمانی نے ایڈم کا دل خراب نہیں کیا تھا۔ باقی رہ گئی لوگوں اور دنیا کی باتیں، تو وہ کچھ دن ہونی تھیں۔ پھر خود ہی دم توڑ جاتیں۔ اس کے لیے اہم چیز وہ رشتہ اور دوستی تھی جو اس کی ایڈم سے دل سے بنی تھی۔ اب وہ سنجیدگی سے فارینہ سے اس مسئلے پر بات کرنے کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ اسے لگتا تھا کہ فارینہ کسی شدید غلط فہمی کا شکار ہے۔ اسی لیے اس کا رویہ ایڈم کے ساتھ اتنا ہتک آمیز ہے۔ وہ اپنی زندگی میں ان دونوں رشتوں کو ساتھ ساتھ لے کر چلنا چاہتا تھا، مگر آنے والے وقت نے ایسا وار کیا کہ وہ صدمے سے دنگ ہی رہ گیا۔ اس کی زندگی میں ایسا طوفان آیا کہ اپنے ساتھ سب کچھ بہا کر لے گیا۔ وہ جو دوسروں کو منانے اور جوڑنے کی باتیں سوچ رہا تھا، وقت کی ستم ظریفی سے خود ہی بکھر کر رہ گیا تھا۔ اتنی تیز آندھی چلی کہ ساتھ چلنے والوں کے قدموں کے نشان تک بھی مٹا گئی۔ شہرام سب کچھ کھو کر بالکل خالی ہاتھ رہ گیا۔ اب صرف وہ تھا اور اس کا

بے تحاشا کام۔ دنیا اس کے بارے میں کیا کہتی یا سوچتی تھی اسے اب کسی چیز کی پروا نہیں تھی۔ پروا کرتا بھی کیسے۔

والدین کی حادثاتی موت کے بعد، جن دو رشتوں کو اس نے بہت محبت اور دوستی کے مان سے سینچا تھا، وہ اسے اچانک ہی چھوڑ کر دنیا کی بھیڑ میں گم ہو گئے۔ شہرام ایسا ہی رہتا اگر اس کی جس زندہ زندگی میں تازہ ہوا کا جھونکا بن کر زویا نہ آتی جس نے پھر سے اسے مسکرانے پر مجبور کر دیا تھا، مگر ایک یاد آج بھی بہت خاموشی سے، اس کے دل کے خشک پتے اڑاتے آنگن میں یادوں کے جھولے پر بڑی شان سے بیٹھی جھولا جھولتی، اپنی جگہ ہمیشہ کی طرح سے موجود تھی۔

ظاہر کی دنیا میں نہیں۔

باطن کے ہر آئینے میں صرف اس کا ہی عکس تھا۔

عکس بھی ایسا، جیسے کسی نے نقش کر دیا ہو۔

کبھی نہ مٹنے والے محبت کے لازوال رنگوں سے۔

”جتنے جو معلوم ہوتے،

وفا کے رسم و رواج سارے

محبتوں میں ہمارا قصہ،

مثال ہوتا، کمال ہوتا۔

☆...☆...☆

”میں اب اتنا بھی گیا گزرا نہیں ہوں کہ ایک عام سی گیم میں تمہارے بابا سے ہار جاؤں گا۔ دیکھنا ابھی انہیں کس طرح اپنی ذہانت اور سمجھ داری سے تاریخ ساز شکست سے دوچار کروں گا۔“

کرنل ثقلین کیانی کا خوب صورت اور پرسکون گھر شہر کے پوش ایریے میں واقع تھا۔ شہرام کو یہاں آ کر بہت اچھا لگ رہا تھا۔ کرنل ثقلین کیانی بہت شگفتہ مزاج تھے۔ فوجی زندگی سے جڑے بہت سے دل چسپ قصے انہیں یاد تھے۔ بہت سی باتوں پر ان کے قہقہے گونجے اور بہت سی باتوں میں جرأت اور بہادری کی ایسی مثالیں پیش ہوئی تھیں کہ ایک ولولہ اور جوش ہر رگ میں اٹھتا ہوا محسوس ہوتا تھا۔ ایک اور بات جو شہرام نے بہت شدت سے محسوس کی کہ کرنل ثقلین کیانی اپنی مرحوم بیوی سے آج بھی بہت محبت کرتے ہیں اور ان کی کمی قدم قدم پر محسوس کرتے ہیں۔

زویا نے ہی اپنے بابا کی توجہ شطرنج کی طرف دلوائی تھی۔ کرنل ثقلین کیانی فوراً ہی میدان میں اتر آئے اور نیپکن سے ہاتھ صاف کرتے ہوئے اسے بارعب لہجے

میں ، لاؤنچ میں آنے کا کہتے ہوئے اپنی جگہ سے اٹھ گئے۔ شہرام نے بھی ان کی تقلید کی مگر ڈائمنگ ٹیبل سے اٹھتے ہوئے بہت آہستہ آواز میں زویا کی طرف دیکھتے ہوئے بہت فخر سے دعوے کیا تو وہ معنی خیز انداز میں مسکرانے لگی۔

”دیکھ لیتے ہیں۔ جناب کتنے پانی میں ہیں۔“

زویا کا لہجہ شرارتی تھا۔ شہرام نے مسکراتے ہوئے سر خم کیا۔ جو گیم بہت زور و شور اور دعویٰ سے شروع کی بہت جلد ہی شہرام اس میں ہارتے ہوئے، سنجیدہ شکل بنا کر بیٹھ گیا تھا۔ اس کی شکل دیکھ کر زویا کی ہنسی نہیں رک رہی تھی۔ کرنل ثقلین کیانی جوش و جذبات میں اسے ہراتے ہوئے بہت فخر سے بتا رہے تھے کہ وہ شطرنج کے چمپئن رہ چکے ہیں۔

”یہ بات کھیلنے سے پہلے بتانی چاہیے تھی آپ لوگوں کو۔ سامنے والا بندہ تو خوش فہمی میں ہی مارا گیا نا۔“

شہرام نے اس طرح مظلومیت سے کہا کہ زویا کی بے ساختہ ہنسی نکل گئی۔ جب کہ کرنل ثقلین کیانی بھی زیر لب مسکرانے لگے۔

”اچھا! کیوں زویا کیا تم نے شہرام کو میری جیتی ہوئی شیلڈز اور ٹرائی نہیں دکھائی تھیں، مگر تم تو کہہ رہی تھیں کہ شہرام نے خود چیلنج کیا ہے کہ وہ جیت کر دکھائے گا۔“

کرنل ثقلین نے سنجیدگی سے زویا کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا، مگر ان کی آنکھوں کی چمک بہت واضح تھی۔

”بابا! آپ سے تو کیا، یہ صاحب آپ کی بیٹی سے بھی اس کھیل میں نہیں جیت سکتے۔“

زویا نے شہرام کی طرف دیکھتے ہوئے فخریہ انداز میں کہا۔

”کوئی بات نہیں۔ آپ دونوں باپ، بیٹی نے مل کر مجھے بے وقوف بنایا ہے۔ کبھی میرے اسٹوڈیو آئیں آپ دونوں، میں بھی ایسے ایسے سوال کرو گا اپنی فیلڈ سے متعلق کے آپ بھی پریشان ہو کر رہ جائیں گے۔ اب بتاؤ بھلا کہ پرندہ اڑتا تو آسمان میں ہو اور اسے چیلنج کرو کہ وہ پانی میں تیر کر دیکھائے۔ کیا یہ کھلا تضاد نہیں۔“

شہرام کے منہ بنا کر کہنے پر کرنل ثقلین اور زویا بے ساختہ ہنستے ہی چلے گئے۔ شہرام بھی مسکرانے لگا۔

”آپ غم مت کریں۔ اسی بار کے غم کو دور کرنے کے لیے میرے ہاتھ کی بنی کافی پیجئے۔ ویسے کافی پلانے کی شرط تو کچھ اور رکھی تھی ہم نے مگر جانے دیں، کیا یاد کریں گے کہ کس سخی سے پالا پڑا آپ کا۔“

زویا نے کہتے ہوئے کافی پیش کی جسے شہرام نے فوراً تھام کر شکریہ کہا۔ کافی پینے کے دوران ہی کرنل ثقلین سے ملنے ان کے کوئی قریبی دوست آگئے۔ وہ ایکسیوز کرتے ہوئے فوراً اٹھ کر چلے گئے۔ کچھ دیر بعد شہرام نے بھی اٹھنے کی اجازت چاہی۔

”اوہم آپ کو اپنا گھر دکھانا تو بھول ہی گئے۔“

شہرام کی کار کے پاس آکر زویا کو ایک دم سے یاد آیا۔

”کوئی بات نہیں۔ اگلی ملاقات میں سہی۔“

شہرام نے کار کا لاک کھولتے ہوئے کہا۔

”آپ اگلی ملاقات کے لیے بہانہ چاہتے ہیں۔“

زویا کی آنکھوں میں خواہشوں کے کئی دیپ جل اٹھے تھے۔ شہرام کی نظر پڑی تو وہ چونک گیا۔

”یہ نازک سی لڑکی۔ تمنا کے کس راستے پر چل نکلی ہے۔“ شہرام نے فکر مندی سے سوچا۔

”اچھے دوستوں سے ملاقات کے لیے بہانوں کی ضرورت نہیں ہوتی زویا۔ ان کا ملنا ہمیشہ اچھا لگتا ہے۔“

شہرام نے سنجیدگی سے کہا اور پچھلی سیٹ پر پڑا خوب صورت بکے نکال کر اس کی طرف بڑھایا۔ زویا خوشی اور بے یقینی سے کھل اٹھی۔

”آپ کو یاد تھا، پہلے کیوں نہیں دیا۔“

زویا نے للی کے سفید پتیوں پر اپنی نازک انگلیاں پھیرتے، ایک ادا سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا تھا۔

”پہلے دے دیتا، تو تمہیں سر پر انز کیسے ملتا۔ ایک اچھا اور پر مسرت ساتھ دینے کے لیے، بہت شکریہ۔“

شہرام نے کہا، تو بکے ہاتھ میں لیے زویا مسکرا کر بولی۔ اس کی مسکراہٹ بھی پھولوں کی طرح ہی تروتازہ اور دلکش تھی۔

”اچھے دوستوں کا شکریہ کہنا بھی ضروری نہیں ہوتا۔“

شہرام نے اس کی حاضر جوابی پر مسکراتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا۔

تب ہی اس کی نظر ڈرائنگ روم کی کھلی کھڑکی پر پڑی۔ کسی کی جھلک دیکھتے ہی وہ چونک گیا۔ اسے ایسا لگا کہ جیسے وہ اس شخص سے واقف ہے مگر دور ہونے کی وجہ سے ٹھیک سے پہچان نہیں پایا۔

”کیا ہوا؟“ زویا نے اسے سوچ میں گم دیکھ کر سوال کیا۔

”آں کچھ نہیں۔ میں چلتا ہوں۔“ شہرام نے اپنا سر جھٹکا اور کار میں بیٹھ کر، ہاتھ ہلاتا، وہاں سے چلا گیا۔

زویا ان پھولوں کے حصار میں گہری خوش دلی سے مسکرا رہی تھی۔

”یہ ضروری تو نہیں، حرف و صدا پُر زور ہو، اک شور ہو

بند ہونٹوں سے بھی کرتے آ رہے ہیں گفتگو، میں اور تُو“

اس منظر کو گلاس ونڈو سے دو نفوس نے بھی دیکھا تھا۔ ایک کے چہرے پر بے تحاشا خوشی اور دل میں اطمینان تھا۔ جبکہ دوسرا کسی گہری سوچ میں گم تھا۔ یہ دوسرا وہی تھا جس کی ایک جھلک دیکھ کر شہرام چونکا تھا۔

☆...☆...☆

”یہ سارا سامان دھیان سے اٹھانا اور تہ خانے میں رکھ دو۔“

علی یار صبح سے مصروف تھا۔ آج کسی مخیر نیک دل شخص نے غریب عورتوں اور بچوں کے لیے بہت سارا راشن بھیجا تھا۔ یہ نیک دل شخص پچھلے کچھ عرصے سے یہ کارِ خیر سر انجام دے رہا تھا۔ اس کی ٹیم کے لوگ مہینے کی مخصوص تاریخ میں آتے اور پیسوں کے ساتھ ساتھ کھانے پینے کا بہت سارا سامان بھی دے جاتے۔ وہ نیک دل آدمی کون تھا یہ علی یار نہیں جانتا تھا مگر اس کی وجہ سے جو ذمہ داری بے سہارا عورتوں اور بچوں کی انہوں نے اٹھائی تھی، وہ بہت خوش اسلوبی سے سر انجام دی جا رہی تھی۔

آج علی یار کو ایک اور خوش خبری بھی ملی جسے وہ سب سے پہلے سائیں کو سنانا چاہتا تھا، مگر سائیں ابھی تک اپنا کام ختم کر کے واپس نہیں لوٹا تھا۔ شام ڈھلے جب وہ تھکا ہارا واپس آیا، تو علی یار کو بے چینی سے اپنا منتظر پایا۔ اپنی مخصوص جگہ پر بیٹھتے ہوئے، سائیں نے کندھے پر رکھے رومال سے اپنا پسینے سے تر چہرہ صاف کیا۔

”کیا ہوا علی یار۔ آج بہت خوش نظر آ رہے ہو۔“

علی یار ابھی سامنے آکر بیٹھا ہی تھا۔ جب سائیں نے کہا۔ علی یار نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

”آپ نے کیسے جان لیا۔ ہاں آپ اللہ والے ہیں۔ کچھ بھی جان سکتے ہیں۔“

علی یار نے عقیدت سے کہا۔ سائیں اس کی بات پر بے ساختہ ہنس پڑا۔
”میرے کس عمل سے تمہیں ایسا لگا کہ میں اللہ والا ہوں علی یار۔ میں صرف اس
کا ادنیٰ سا بندہ ہوں۔ جیسے باقی سب ہیں، جیسے تم ہو۔“ سائیں نے کہا تو علی یار کہنے
لگا۔

”اللہ والا وہ ہوتا ہے، جس کی دعا قبول ہوتی ہے اور آپ کی دعا کا فیض سب کے
لیے عام ہے سائیں۔“
علی یار کے لہجے میں محبت تھی۔

”علی یار! دعا قبول کرنے کا وعدہ تو اس ذاتِ پاک نے سب سے کیا ہے۔ دعا چاہے
آخرت کے لیے ذخیرہ کر دی جائے یا دنیا میں ہی پوری ہو جائے۔ دعا تو خیر ہی
خیر ہے۔ بس مانگتے رہنا چاہیے۔“
سائیں نے نرمی سے اسے سمجھایا۔

”ہاں مگر آپ اللہ والے تو ہونا۔“ علی یار اپنی بات پر باضد تھا۔
”اللہ والا وہ ہوتا ہے علی یار جسے اللہ اپنے لیے منتخب کر لیتا ہے۔ جس پر آزمائشیں
اس طرح اترتی ہیں، جیسے آسمان سے بارش کی بوندیں اور ثابت قدم رہنے والے

ہی ”اللہ والے“ کہلاتے ہیں۔ میری مثال تو ایسی ہے۔ جیسے کسی نابینا کے ہاتھ میں
آئینہ دے دیا گیا ہے، مگر دنیا پرست ہونے کی وجہ سے وہ بینائی سے محروم رہے۔“
سائیں نے کہا، تو علی یار نے اسے غور سے دیکھا جسے کچھ بھی نہ ہونے کا دعویٰ تھا،
مگر لوگوں کے لیے وہ بہت کچھ تھا۔

”سائیں! آپ کو خوش خبری تو سنائی ہی نہیں میں نے۔“ علی یار نے کچھ یاد آنے
پر کہا۔

”اچھا! وہ کیا؟“ سائیں نے نرمی سے پوچھا۔

”وہ نیک دل شخص جو ہر مہینے باقاعدگی سے امداد بھیجتا ہے، اس نے پیغام بھجوایا
ہے کہ بہت جلد وہ یہاں ایک اسکول اور ہسپتال تعمیر کروانے لگا ہے۔ جہاں
غریبوں کے لیے مفت سہولیات ہوں گی۔ سائیں! آپ کی یہ بہت بڑی خواہش تھی
ناکہ ان غریب بچوں کی تعلیم کا سلسلہ کسی طرح سے شروع ہو سکے تاکہ کل کو یہ
مزار پر مانگنے یا گلیوں میں کوڑا چننے کے بجائے، پڑھ لکھ کر اپنے پائوں پر کھڑے
ہو سکیں۔ دیکھیں اللہ نے کیسا سوہنا وسیلہ بنایا ہے۔“

”پھر بھی آپ کہتے ہیں کہ آپ ”اللہ والے“ نہیں۔“
علی یار نے کہا، تو سائیں کسی گہری سوچ سے باہر نکلا تھا۔

”علی یار! مجھے کسی کی نیت اور عمل پر شک تو نہیں مگر تمہارا محتاط رہنا بہت ضروری ہے۔ میں کل یہاں سے جا رہا ہوں۔ میرے پیچھے ان سب کی ذمہ داری تم پر ہے۔ تم سمجھ رہے ہو نا۔“

سائیں کا اشارہ کس طرف تھا۔ علی یار نے سمجھ کر فوراً سر ہلایا۔

”سائیں آپ بے فکر ہو کر جائیں۔ علی یار اپنی جان تو دے سکتا ہے، مگر اپنے وعدے سے نہیں پھرے گا۔ مجھے آپ سے کیا وعدہ بہت اچھی طرح یاد ہے جو ان غریب و بے سہارا عورتوں کی ذمہ داری اٹھاتے ہوئے میں نے آپ سے کیا تھا۔“

علی یار نے مضبوط لہجے میں کہا۔ سائیں نے اس کا کندھا تھپکایا۔ علی یار سلام کرتا ہوا واپس چلا گیا۔

سائیں نے گھنے درخت کے تنے سے ٹیک لگائی اور سامنے مزار کے احاطے کی طرف دیکھنے لگا۔ لوگ اپنی منتوں اور مرادوں کی جھولیاں پھیلانے آتے اور جاتے رہتے تھے۔ سائیں کا زیادہ وقت اسی کونے میں گزرتا تھا۔ جہاں عام آدمی کی نظر نہیں پہنچتی تھی۔ کیوں کہ گھنے سایہ دار درخت اور کچھ فاصلے پر بنی رکاوٹ کی وجہ سے لوگ اس طرف نہیں آتے تھے۔ اگر کسی کو پتا چل جاتا کہ سائیں کا مخصوص ٹھکانہ یہ ہے تو وہ کسی رکاوٹ کی پروا کیے بغیر، اس تک ضرور پہنچتے۔

سائیں دنیا میں ویسی ہی زندگی گزار رہا تھا جیسے سب گزارتے ہیں، مگر وہ لوگوں کے اندھے اعتقاد اور توہم پرستی سے ڈرتا تھا۔ اسی لیے کسی مخصوص نشست یا جگہ پر نہیں بیٹھتا تھا کہ لوگ پیری مریدی کے چکر میں پڑ کر، اپنے اصل کو بھول جائیں۔

ان سب کوششوں کے باوجود بھی، لوگوں میں اس کا فیض اور مقبولیت روز بہ روز بڑھتی جا رہی تھی۔

”تُو بھی کیا خوب ہے میرے رب۔“

سائیں نے سر اٹھا کر آسمان کی طرف دیکھا۔

”میں جتنا زیادہ، ان سب باتوں سے بچنا چاہ رہا ہوں، تُو اپنی رحمت سے مجھے اسی طرف دھکیل رہا ہے۔“

میری ہر خواہش، ہر دعا، بن مانگے پوری کر دیتا ہے اور جس کی تمنا اور خواہش نے خاک بنا دیا، بس وہی نہیں پوری کرتا۔ کمال ہے تُو۔ تیری حکمت، تُو ہی جانے۔ میں تو جانوں اپنے دل کی۔

جو پہلے دن کی طرح، آج بھی جلوہ یار کے سامنے اپنی سُدھ بدھ کھو دیتا ہے۔

جو آج بھی محبوب کے ہر نقش کو بند آنکھوں سے دیکھتا اور جبین سے سجدہ کرتا ہے۔

بنانے والے۔

”تُو نے محبت بھی کیا خوب شے بنائی، مگر ایک شکوہ ہے تجھ سے۔“

سائیں کی آنکھوں میں نمی پھیل گئی۔

”تُو نے بہت ظالم چیز بنائی ہے یہ محبت۔

بہت درد اور دکھ دیتی ہے یہ۔

محبت اتنی عام اور سستی کہ سب کو اس کا منتر دے دیا۔

مگر نایاب اور خاص اتنی کہ صرف ”دل والے“ اس منتر کا استعمال کرنا جانتے ہیں۔

عام بنا کر بھی، اسے خاص ہی رہنے دیا۔

مگر مالک!...

مرے ہوئے کو مارنا، یہ تیری شان نہیں میرے مالک۔

یہ تیری شان نہیں۔“

سائیں نے اپنا سر گھٹنوں میں رکھ لیا اور زارو قطار رونے لگا۔

”بہانے اور بھی جو ہوتے زندگی کے لیے

ہم ایک بار تری آرزو بھی کھو دیتے

بچا لیا مجھے طوفان کی موجوں نے ورنہ

کنارے والے سفینہ میرا ڈبو دیتے

جو دیکھتے میری نظروں پر بندشوں کے ستم

تو یہ نظارے مری بے بسی پر رو دیتے

کبھی تو یوں بھی اُمنڈتے سر شکِ غم مجروح

کہ میرے زخمِ تمنا کے داغ دھو دیتے“

☆...☆...☆

”کیا بات ہے نور بانو! آج آپ کسی گہری سوچ میں گم نظر آ رہی ہیں؟“

خان زادہ شمشیر نے گائو تکیے سے ٹیک لگاتے، بیڈ پر نیم دارز ہوتے ہوئے پاؤں

سیدھے کیے تو نور بانو نے کمر ان کے اوپر اچھی طرح سے پھیلا دیا۔ بڑھتی عمر کے

ساتھ ساتھ اتنا عرصہ خان زادہ احمد کی بیماری دیکھنے اور اس سے لڑتے لڑتے، وہ

خود بہت کمزور ہو گئے تھے۔

اکھوتے بیٹے اور اپنی خاندانی گدی کے وارث کی صحت یابی کے لیے انہوں نے بڑی ٹھوکریں کھائیں تھیں۔ بڑے اتار چڑھاؤ دیکھے تھے اور سفر کی صعوبتیں جھیلی تھیں۔ راہوں کے کانٹے، اپنے تلوے میں چھوئے تھے، تب جا کر آج یہ مبارک دن دیکھنا نصیب ہوا تھا۔

آج ان کی دیرینہ خواہش پوری ہوئی تھی۔ آج ان کے بیٹے نے گدی سنبھالی تھی۔ وہ اب اس کا وارث تھا۔ اسے لے کر چلنے والا۔

آج حویلی دلہن کی طرح سجی تھی۔ آج سے سال پہلے بھی یہ حویلی، خان زادہ احمد کی صحت یابی کی خوشی میں دلہن کی طرح سجا ئی گئی تھی۔ کئی دن تک صدقہ خیرات اور لنگر تقسیم کیا گیا تھا۔ عائشہ کو ایک بار پھر دلہن کی طرح سجا یا گیا تھا۔ مریم اور آمنہ بھی اکھوتے اور لاڈلے بھائی کی صحت یابی کی خوشی میں رب کا شکرانہ ادا کرتے نہیں تھکتی تھیں اور آج بھی ایسا ہی دن تھا جب سب لوگ خوشی سے بھرپور لہجوں میں بول رہے تھے۔ نوربانو کے چہرے پر خوشی تو تھی ہی مگر خان زادہ شمشیر کو محسوس ہونے لگا تھا کہ جیسے وہ اکثر کسی گہری سوچ میں، اپنے حال سے کٹ جاتی ہیں۔ کافی دن خاموشی سے ان کا جائزہ لینے کے بعد آج بالآخر انہوں نے پوچھ

ہی لیا۔ نوربانو کے ہاتھ کمبل ٹھیک کرتے ہوئے، ایک لمحے کے لیے رکے ضرور تھے، مگر پھر دوبارہ سے خود کو مصروف ظاہر کرنے لگیں۔

”آپ کا وہم ہے۔ ایسا کچھ نہیں ہے۔“

نوربانو کا لہجہ سرسری سا تھا۔ خان زادہ شمشیر نے مسکراتی نگاہوں سے انہیں دیکھا۔ نوربانو نے ان کے چہرے کی طرف دیکھا اور چونک گئی۔

”آپ کیوں مسکرا رہے ہیں۔“

”بس ویسے ہی! آج بلاوجہ ہی دل خوش ہے۔“ انہوں نے اطمینان سے جواب دیا۔

”اور میرا دل بلاوجہ ہی اداسی میں ڈوب رہا ہے۔“

نوربانو نے بے دلی سے بیڈ کی پائنٹی کی طرف بیٹھتے ہوئے کہا۔

”نوربانو! میں آپ سے یہ ہی تو پوچھنا چاہ رہا ہوں کہ آپ کی اداسی اور کھوئے انداز کی آخر کیا وجہ ہے؟ آپ چاہیں تو اپنے دل کی بات، مجھ سے کہہ سکتی ہیں۔ آپ جانتی ہیں نوربانو۔ میں نے کسی سے سیکھا ہے کہ دل کی بات کہنے والوں کو، کہنے دینا اور اسے خود میں سمو لینا، بہت بڑی رحمت ہوتی ہے۔ اللہ سب کی سننے کا وصف بھی کسی کسی کو دیتا ہے۔“ خان زادہ شمشیر نے نرم لہجے میں کہا۔

”سائیں! کی بات کر رہے ہیں نا آپ۔ یہ وصف اس کی ذات کا سمندر ہے۔ اسی لیے تو وہ اتنا گہرا اور پُراسرار ہے۔“

نور بانو کے درست اندازے پر وہ حیران ہو کر کہنے لگے۔

”واہ! آپ تو سائیں کو بہت قریب سے جاننے لگیں ہیں۔ اتنی جلدی بوجھ لیا۔“
 ”ہوں! نہ جانے کیوں مگر آج کل اس سے ملنے کی خواہش زور پکڑنے لگی ہے۔ کیا ایسا ممکن ہے کہ ہم ایک بار جا کر اسے مل آئیں۔ آخر اس کا ہم پر بہت بڑا احسان ہے۔ اسی کی وجہ سے آج ہماری حویلی کی خوشیاں قائم ہیں۔ ان شا اللہ بہت جلد ہم اپنے احمد کی اولاد بھی دیکھ لیں گے۔ میں چاہتی ہوں کہ یہ خوش خبری بھی سائیں کو سنائوں! میرا دل چاہتا ہے کہ اب وہ ہماری ہر خوشی، ہر دکھ میں شامل ہو! شاید اس لیے کہ“...

نور بانو نے کچھ کہنے سے خود کو روکا، مگر ان کی آنکھوں سے بہتے آنسو آج بھی اسی ادھوری رات میں پیدا ہونے والے، ادھورے وجود کی کہانی سناتے تھے۔ اتنے سالوں میں نہ جانے کیا کچھ بدل گیا تھا، مگر ان آنسوؤں کا رنگ، آج بھی اوّل دن کی طرح تھا۔ ان میں کبھی کسی اور احساس کا ذائقہ شامل نہیں ہوا تھا۔ یہ آنسو جس ادھورے وجود کے لیے بہے تھے، آج بھی اسی کی یاد میں بہتے تھے۔

”اسی لیے آپ اتنے دنوں سے اُداس اور افسردہ تھیں۔“ خان زادہ شمشیر نے گہری سانس لے کر کہا۔

”مجھے اندازہ ہے کہ احساس اور ممتا کا جو تعلق آپ نے سائیں سے جوڑ لیا ہے، وہ بہت گہرا اور مضبوط ہے۔“

مگر نور بانو! ابھی آپ کا اس طرح شہر سے باہر جانا مناسب نہیں ہے۔ آپ جانتی ہیں کہ عائشہ کو اس وقت آپ کی ضرورت ہے۔

مریم اور آمنہ بھی اسی وجہ سے یہاں رہنے آئی ہوئی ہیں۔ اللہ خیر کا وقت لائے۔ ہم خود جا کر سائیں کو یہ خوش خبری سنانے کے ساتھ ساتھ، اس کا منہ بھی میٹھا کروائیں گے۔ ہمیں بھی وہ بہت پسند ہے نور بانو! مگر بس تھوڑا انتظار اور کر لیں۔“
 ان کے سمجھانے پر نور بانو اثبات میں سر ہلاتیں، دوپٹے سے اپنی آنکھیں پونچھتیں اپنی جگہ سے اٹھ کر کمرے سے باہر جانے لگیں۔ جب کچھ یاد آنے پر رکیں اور مڑ کر خان زادہ شمشیر کی طرف دیکھ کر گویا ہوئیں۔

”اور سب تو ٹھیک ہے، مگر کیا سائیں کو بھی اپنا وعدہ یاد نہیں رہا۔ میں مجبور ہوں، تو کیا وہ بھی نہیں آ سکتا مجھ سے ملنے! ماں جی کہتا تھا مجھے! کیا اپنی ماں ہوتی تو اسے بھی اتنا انتظار کرواتا؟“

نوربانو کے چہرے پر اتنی معصومیت، سادگی اور تڑپ تھی کہ کتنی دیر ہی وہ گم صم بیٹھے ان کا چہرہ بصارت کے پردے پر لہراتا دیکھتے رہے۔ جب کہ نوربانو کو وہاں سے گئے کافی دیر گزر گئی تھی۔

☆...☆...☆

”مجھے یقین نہیں آرہا۔ ایک بیچلر کا گھر اور اتنا صاف ستھرا اور خوب صورتی سے سجا ہوا بھی ہو سکتا ہے۔“

سارے گھر کا گھوم پھر کے اچھی طرح جائزہ لینے کے بعد عانیہ نے حیرت بھرے لہجے میں کہا۔ شہرام نے ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ اس کا کمپلیمنٹ قبول کیا تھا۔ جب کہ زویا کی آنکھوں میں بھی واضح ستائش تھی۔

”اس میں ان صاحب کا کوئی کمال نہیں ہے محترمہ۔ سارا گھر قابل نوکروں کی فوج کے سر پر چل رہا ہے۔ خود تو یہ ہل کر پانی بھی نہیں پیتے اور بندے کے پاس پیسہ ہو تو ایک سے بڑھ کر ایک ہوم ڈیکوریٹر مل جاتا ہے۔“ انصب نے منہ بناتے ہوئے کہا۔

”اچھا یہ سب سہولتیں تو تمہارے گھر میں بھی میسر ہیں، مگر پھر بھی اتنی صفائی، اتنی سجاوٹ نظر نہیں آتی ہے اور نواب صاحب جو چیز جہاں سے اٹھاتے ہیں، واپس وہاں رکھنا بھول جاتے ہیں اور تو اور...“

عانیہ اسے گھورتے ہوئے جو بولنا شروع ہوئی تو رکی ہی نہیں۔ سب کے سامنے انصب کھسیانا ہو کر بولا۔

”عانیہ ڈیر یہ تبصرے تم گھر میں بھی روز ہی کرتی ہو۔ ابھی کوئی اور بات کر لیں! سمجھا کرو یا میری عزت کا سوال ہے۔“

انصب نے شہرام کی موجودگی کا احساس دلاتے ہوئے کہا، تو عانیہ ”ہونہہ“ کہہ کر سر جھٹک کر رہ گئی۔

”کوئی بات نہیں میرے دوست۔ اب تم ”شوہر“ بن چکے ہو۔ اس طرح کی عزت افزائی کا خود کو عادی بنا ہی لو۔“

شہرام نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے تسلی دی، مگر اس کی آنکھوں میں ناچتی شرارت دیکھ کر انصب جل بھن کر رہ گیا۔

”اڑا لے مذاق، مگر فکر مت کر تیرا وقت بھی زیادہ دور نہیں۔ بڑے پھول گفٹ کیے جا رہے ہیں آج کل! ہمیں بھی سب خبر ہے جناب۔“

انصب نے اپنا بدلہ اتارا۔ اسے عانیہ کی زبانی پتا چلا تھا کہ شہرام زویا کے گھر اس کے لیے پھول بھی لے کر گیا تھا۔ خوش فہم زویا کی طرح، عانیہ نے بھی دور تک سوچ لیا تھا۔ شہرام اپنے سر پر ہاتھ مار کر رہ گیا۔

”یار تم تو سمجھ دار ہو۔ تمہیں تو کم از کم ایسا نہیں سوچنا چاہیے۔“ شہرام نے اسے ملامت کی۔

”محبت میں سمجھ داری کا کیا عمل دخل جناب۔“

صوفی کی بیک سے ٹیک لگاتے ہوئے انصب نے کہا۔ شہرام نے آج انھیں اپنے گھر ڈنر میں انوائٹ کیا تھا۔ کیونکہ عانیہ نے صاف کہہ دیا تھا کہ پہلے ہی وہ شادی اور پھر لانگ ہنی مون کی وجہ سے ہوٹلوں کے کھانے کھا کھا کر تنگ آگئی ہے۔ اگر شہرام نے دعوت دینی ہے تو پھر اپنے گھر دے۔ شہرام نے اس کی بات سر آنکھوں پر رکھی۔ عانیہ اور انصب کی فیملی کے ساتھ ساتھ اس نے کرنل ثقلین کیانی اور زویا کو بھی مدعو کیا تھا۔

”تم اچھی طرح جانتے ہو کہ میں محبت کر چکا ہوں۔“

شہرام کا لہجہ سنجیدہ تھا۔

”وہ ماضی کی بات ہے شہرام۔ اب نئے راستے تمہارے منتظر ہیں۔“

انصب نے بے پروائی سے کہا۔

”انصب میں محبت کی بات کر رہا ہوں۔ اپنی محبت کی جس میں مجھے سب کچھ ملا ہے۔ میں روز اخبار میں چھپنے والی کسی نئی یا پرانی ہو جانے والی ”خبر“ کی بات نہیں کر رہا۔“

شہرام نے چڑ کر کہا۔ اسی وقت ان دونوں کی نظر زویا پر پڑی۔ جس کے چہرے کا رنگ زرد ہو رہا تھا۔ لگتا تھا کہ جیسے وہ سب سن چکی ہو۔

ان کے متوجہ ہوتے ہی وہ تیزی سے واپس مڑ گئی۔

”اب خوش ہے تو۔ ہر نایاب چیز کو کھونا اور اس کے لیے رونا تیری عادت بن گئی ہے شہرام۔“

انصب نے غصے میں نہ جانے کیا کچھ کہہ دیا۔ شہرام کے چہرے کا رنگ ایک دم بدلا۔

”سوری یار! میں تجھے تکلیف دینا نہیں چاہتا، مگر شہرام تم خود سوچو، تمہاری وجہ سے کسی اور کا دل بھی ٹوٹ گیا ہے۔ محبت صرف تمہاری جاگیر نہیں ہے نا۔ تمہاری

طرح اور بھی بہت لوگ مبتلائے محبت ہوتے ہیں، مگر وہ خود پر زندگی کے دروازے بند نہیں کر لیتے۔

میری بات پر سوچنا ضرور۔ میں تمہیں تمہاری محبت سے مکرے کا نہیں کہہ رہا، میں دوسروں کی محبت کی قدر کرنے کا کہہ رہا ہوں۔ ”انصاف نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ شہرام اس کی بات پر سر جھکا کر رہ گیا۔

☆...☆...☆

”علی یار“!

موہنی نے دور سے علی یار کی جھلک دیکھتے ہی، اسے پکارا تھا۔ وہ کافی دیر سے اس کے انتظار میں احاطے کے چکر پر چکر لگا رہی تھی۔ اس کی حالت ایسی تھی جیسے بن پانی کے مچھلی۔ اس کی یہ حالت بہت سی نگاہوں میں آچکی تھی مگر اصل وجہ کسی کو نہیں معلوم تھی۔ آج موہنی نے پیو کو بھی بری طرح سے جھڑک دیا تھا۔ پیو نے بہ مشکل اس کا ایسا لہجہ برداشت کیا تھا۔ اگر اسے بات بگڑنے کا خطرہ نہ ہوتا، تو وہ موہنی کو بہت اچھی طرح سے جواب دیتی مگر بڑے مقصد کو حاصل کرنے کے لیے، چھوٹی چھوٹی شکست کھانے میں کوئی ہرج نہیں تھا۔ موہنی کے دام بھی

اس نے بہت زیادہ رکھے تھے۔ سونے کی اس چڑیا کو، اپنی بے وقوفی اور جلد بازی سے گنواں کہاں کی عقل مندی تھی۔

پیو نے یہاں کی بدلتی صورت حال اور نگرانی کی وجہ سے، بہت جلد یہاں سے کوچ کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ علی یار اور اس کے نگران بندے بہت چوکس ہو گئے تھے۔ ایسے جیسے انہیں کسی بات کی بھنک پڑ گئی ہو۔ عورتوں کے لیے بنایا گیا حصہ اب ایک ادارے کی شکل اختیار کرتا جا رہا تھا۔ بہت سے مخیر افراد اس کی سرپرستی کر رہے تھے۔ اسی لیے اس کے رقبے کو مزید بڑھایا جا رہا تھا اور عورتوں کو ان کی قابلیت کے مطابق تعلیم اور ہنر سکھانے کا بھی منصوبہ بن چکا تھا۔ ابھی فی الحال ادارے میں سے ہی تھوڑی بہت پڑھی لکھی خواتین کو منتظمین میں شامل کیا گیا تھا جن میں رضیہ بھی شامل تھی۔ موہنی نے کوئی بھی ذمہ داری سے انکار کر دیا تھا، مگر وہ سب کاموں میں پیش پیش ضرور ہوتی تھی۔

پیو جو بظاہر ان اقدامات پر خوشی کا اظہار کرتی تھی، مگر اندر سے بہت پریشان تھی۔ اسی لیے موہنی کی صورت میں جیک پاٹ اسے مل رہا تھا جسے وہ کسی صورت میں نہیں گنواں چاہتی تھی۔

”کیا ہوا موہنی! تو پریشان کیوں ہے؟“

علی یار نے اس کے چہرے کے اڑے ہوئے رنگ دیکھ لیے۔ اسی لیے کسی خدشے کے تحت پوچھا تھا۔

”علی یار! سائیں کہاں ہیں؟“

موہنی نے بے تاب سے پوچھا، تو علی یار نے گہری سانس لی۔

”کیوں تجھے کوئی کام ہے سائیں سے۔“

علی یار کا لہجہ سرسری سا تھا۔

”کیوں کیا کام کے بغیر ان کے بارے میں پوچھنا گناہ ہے؟“

موہنی نے تیکھے لہجے میں کہا۔ تو علی یار بے ساختہ ہنس پڑا تھا۔

”کیا بات ہے؟ آج تیرا مزاج کیوں اتنا تلخ ہے موہنی۔ فکر مت کر سائیں آجائیں

گے۔ ایک وعدہ کیا تھا کسی سے، وہ نبھانے گئے ہیں۔ میں نے منع بھی کیا تھا اپنی گھر

والی کو کہ کسی سے ذکر مت کرے سائیں کے جانے کا۔ لوگ بلاوجہ ہی سوال،

جواب کرنے لگ جاتے ہیں۔ فضول کی باتیں اور مفروضے قائم کر لیتے ہیں۔ چل تو

جا اب اور زیادہ ادھر، ادھر مت پھرا کر، عورتوں والے حصے میں رہا کر۔ مجھے اب

کام کرنے دے۔“

علی یار نے سنجیدگی سے کہا اور وہاں سے چلا گیا۔ موہنی گم صم اپنی جگہ کھڑی کی کھڑی رہ گئی۔

”جب جان جسم سے نکلنے لگتی ہے تو اس کی خبر باہر سے نہیں، اندر سے ملتی ہے۔

آنکھ بینائی رکھتے ہوئے بھی اگر کچھ نہ دیکھ پائے تو قصور نظر کا نہیں، نظر بن

جانے والوں کا ہوتا ہے۔“

موہنی کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔ ایسے ہی تو نہیں آج اسے فضا

خالی خالی اور اداس لگ رہی تھی۔ ہوائوں میں کسی کے ہونے کا احساس، اس کی

خوشبو نہیں تھی۔ کسی کے قدموں کی چاپ میں، اس کی موجودگی کا لمس نہیں تھا

آج۔

آج سب کچھ ہوتے ہوئے بھی، کچھ نہیں تھا کائنات میں۔ حتیٰ کہ اس کا اپنا وجود

بھی خلا میں کہیں معلق ہو کر رہ گیا تھا۔

”داورِ حشر! کچھ پتا تو چلے

وحشتوں کا حساب ہوتا ہے؟

اُس کو میرے ہر اُس سوال سے چڑ

جس کا ہاں میں جواب ہوتا ہے

وہ بھی الفاظ کا نہیں قائل

جیسے! اہل کتاب ہوتا ہے!"

☆...☆...☆

”مریم تم اماں رحیمہ کے ساتھ ہسپتال چلی جاؤ اور آمنہ کو گھر بھیج دینا۔ شام میں عائشہ کو ڈسپارچ کر دیں گے۔ میں اپنی بہو اور ننھے مہمانوں کے استقبال کی تیاری کر لوں۔ بہت سے کام کرنے والے ہیں۔ خوشی سے تو میرے ہاتھ پاؤں پھولے جا رہے ہیں۔ اتنی خوشیاں آگے پیچھے ملیں ہیں کہ دل سنبھلتا ہی نہیں۔“

نوربانو کے ہاتھ پاؤں خوشی سے پھولے ہوئے تھے۔ اللہ نے انہیں پوتے اور پوتی دونوں کی خوشی سے ایک ساتھ نوازا تھا۔ جڑواں بچوں کی آمد نے سب ہی کو بے پناہ خوشی اور مسرت عطا کی تھی۔ خان زادہ شمشیر بھی لوگوں کی مبارک باد وصول کرتے ہوئے، مختلف انتظامات میں لگے ہوئے تھے۔ آخر ان کی نسل آگے بڑھی تھی، کئی دن تک جشن منانا، تو ان کا حق تھا۔

”امی میں تیار ہوں۔ میرے دونوں بچے اور آمنہ کے تینوں بچے رانو اور میراں سنبھال لے گی۔ میں نے انہیں ہدایت کر دی ہے۔ آپ فکر مند مت ہوں۔“

مریم نے چادر اچھی طرح اوڑھتے ہوئے ماں سے کہا، تو وہ سر ہلا کر رہ گئی۔ اسی وقت اماں رحیمہ بھی خوشی سے چہکتی ان کے پاس پہنچ گئی۔

”نوربانو بی بی! میں نے اپنی نگرانی میں دلہن (عائشہ) کے لیے پرہیزی کھانا تیار کروا لیا تھا۔ اللہ نے خوشی ہی اتنی بڑی دی ہے کہ سمجھ میں نہیں آ رہا۔“

اماں رحیمہ نے پُر مسرت لہجے میں کہا۔ باتیں کرتے کرتے وہ لوگ پورچ میں پہنچ گئے۔ نوربانو مختلف ہدایتیں دینے کے باوجود بھی مطمئن نہیں ہو رہی تھیں۔ عائشہ کی ماں اور نوربانو کی بہن ارم بیگم، جو دوسرے شہر میں مقیم تھیں، خوش خبری سنتے ہی سب کے ساتھ پہنچ گئیں تھیں اور نوربانو ابھی اپنی بیٹی کے پاس ہسپتال میں ہی تھیں۔ نوربانو کو اس نے زبردستی گھر بھیجا تھا کہ

”ایک ماں کے ہوتے ہوئے، دوسری ماں، کو فکر نہیں کرنی چاہیے۔“

نوربانو مطمئن ہو کر لوٹ تو آئیں مگر چین سے نہیں بیٹھ رہی تھیں۔ مریم اور اماں رحیمہ خدا حافظ کہتے ہوئے کار میں بیٹھنے ہی لگی تھیں۔ جب گیٹ پر کسی کی ایک جھلک دیکھ کر نوربانو چونکی تھیں اور پھر سب نے حیران کن نظارہ دیکھا۔

نوربانو اتنی تیزی سے بھاگتی ہوئی گیٹ پر پہنچی اور بحث کرتے چوکی دار کو ہٹاتے ہوئے آگے بڑھی۔

”سائیں! تم آگئے۔“

تھکے ہارے، سفر سے نڈھال سائیں نے گردِ حلیے میں اٹے، سر اٹھا کر مسکراتے ہوئے ان کی طرف دیکھا۔

”آپ نے وعدے کی ڈور سے باندھ جو دیا تھا ماں جی۔ پھر کیسے نہ آتا۔“

سائیں نے کہا، تو نور بانو خوشی سے چور ہوتے، اس کا ہاتھ پکڑ کر اندر لے آئیں۔ چوکیدار کے ساتھ ساتھ آس پاس کرتے دوسرے لوگ بھی حیرت سے دیکھنے لگے۔

”یہ کون ہے؟ جس کا ہاتھ امی نے اتنی گرم جوشی سے تھام رکھا ہے؟“

مریم نے حیرت سے سوال کیا۔ اماں رحیمہ بھی اسے دیکھ کر خوش ہو کر بولیں تھیں۔

”ارے تمہیں بتایا تو تھا! اس سائیں کی دعا سے ہی اللہ کا کرم ہوا تھا اور چھوٹے خان زادہ ٹھیک ہو گئے تھے۔ نور بانو بی بی نے انہیں اپنا بیٹا بنا لیا تھا۔ اسی لیے وہ اتنی خوش ہو رہی ہیں۔“

اماں رحیمہ نے کہا، تو مریم حیرت سے سر ہلا کر رہ گئی۔ نور بانو نے پاس آکر مریم کا تعارف، اس سے کروایا، تو سائیں نے اس کی سر پر ہاتھ رکھ کر دعا دی۔

”سدا آباد و شاد رہو بہن۔“

نہ جانے سچ تھا یا وہم مگر مریم کو ایسا لگا جیسے یہ کہتے ہوئے سائیں کی آنکھیں نم ہو گئیں تھیں۔ پھر وہ دونوں کار میں بیٹھ کر وہاں سے چلیں گئیں۔

نور بانو سائیں کو اپنے گھر میں آنے والے ننھے مہمانوں کے بارے میں بتانے لگیں۔ شام کو جب خان زادہ شمشیر حویلی لوٹے تو ان کو بھی سائیں کی آمد کی خبر سنائی گئی تو وہ بھی حیران ہونے کے ساتھ ساتھ بہت خوش ہوئے۔

”بہت اچھا کیا برخودار! تم ہم سے ملنے آگئے۔“

انہوں نے سائیں سے گلے ملتے ہوئے گرم جوشی سے کہا۔ صاف ستھرے حلیے میں ملبوس سائیں بہت اچھا لگ رہا تھا جس کا اظہار انہوں نے برملا کر دیا۔ سائیں اپنی تعریف پر جھینپ کر رہ گیا اور نور بانو فخریہ مسکرائی تھیں۔

”یہ سب تو ماں جی نے بس ویسے ہی۔“

سائیں نے جھجکتے ہوئے کچھ کہنا چاہا۔ خان زادہ شمشیر نے اس کا کندھا تھپتھپایا۔

”مجھے خوشی ہے سائیں! تم نے ایک ماں کے دل کا خیال رکھا۔“

”ایک ماں کے دل کا خیال ہی تو مجھے یہاں تک لے آیا ہے۔ ورنہ میرے جیسے سیلانی آدمی کو رشتوں کی زنجیریں کب باندھ سکی ہیں۔“

سائیں نے نظریں جھکا کر کہا۔

”میں تمہیں جلدی واپس نہیں جانے دوں گی سائیں۔ جب تک میرے دل کی تسلی نہیں ہو گی۔“

نور بانو نے مان سے کہا۔ سائیں دھیرے سے مسکرا دیا۔

”ماں جی! آپ کی محبت سر آنکھوں پر مگر مجھے اس طرح پابند مت کیجیے۔ میرا سفر رک جائے گا۔“

سائیں کے لہجے میں خوف شامل تھا۔

”مگر سائیں!“ نور بانو نے کچھ کہنا چاہا لیکن خان زدہ شمشیر نے انہیں آنکھ کے اشارے سے منع کر دیا۔

”ٹھیک ہے سائیں۔ جیسے تمہاری مرضی مگر جب تک حویلی میں جشن رہے گا۔ تم

نہیں جاسکتے۔ اپنے باپ کی عمر کے شخص سے، اب تم منتیں تو نہیں کروا گے نا۔“

انہوں نے اس چالاکی سے اسے گھیرا تھا کہ وہ سر جھکانے کے سوا کچھ نہیں کر

سکا۔ نور بانو نے شکر بھری نگاہوں سے اپنے مجازی خدا کو دیکھا تھا۔

”اتنے سالوں بعد ہی سہی مگر آج انہوں نے ایک ماں کے دل کی خوشی کو مقدم

رکھا تھا۔“

☆...☆...☆

”آپ اور یہاں؟“

ملازم نے اسے کرنل ثقلین کیانی کا پیغام دیا تھا کہ وہ اسے ڈرائنگ روم میں بلا رہے

ہیں۔ زویا نے جیسے ہی اندر قدم رکھا۔ شہرام کو دیکھ کر حیران رہ گئی۔

”جی میں محترمہ! آپ نے خود ہی تو مدعو کیا تھا۔ فیملی تصاویر دکھانے کے لیے۔“

شہرام نے پچھلی ملاقات کا حوالہ دیا، تو زویا نے سنجیدگی سے سر اثبات میں ہلا دیا

۔ اسی دوران ملازم، کرنل صاحب کی ہدایت کے مطابق کچھ پرانے البم اٹھا کر لے

آیا۔ کرنل ثقلین کیانی جوش و خروش سے اسے اپنا شاندار ماضی دکھا رہے تھے۔

شہرام بھی دلچسپی سے سب دیکھ رہا تھا۔

”بس بھی میں تو تھک گیا ہوں۔ باقی تصویریں تمہیں زویا دکھائے گی۔“

کرنل ثقلین نے کہا، تو خاموش بیٹھی زویا نے چونک کر سر اٹھایا۔

”جی ضرور۔“

زویا کہتی ہوئی اپنی جگہ سے اٹھی۔ شہرام نے بھی اس کی تقلید کی۔ زویا نے اسے

دیوار او رفریم میں لگی بہت سی تصویریں دکھائیں۔ فیملی ممبرز کے بارے میں وہ

بہت محبت سے ذکر کر رہی تھی، ماں کے ذکر پر بار بار اس کی آنکھیں نم ہو رہی

تھیں۔ تصویروں کے ساتھ ساتھ شہرام نے سارا گھر بھی دیکھ لیا تھا۔ ٹیرس کا پُرسکون گوشہ اسے بہت پسند آیا۔ ٹھنڈی ٹھنڈی چلتی ہوائ نے ایک تازگی سی ماحول میں بھر دی تھی۔ زویا کسی سوچ میں گم ٹیرس کی ریلنگ پر ہاتھ رکھے، نیچے وسیع لان میں لگے رنگ برنگ پھول دیکھ رہی تھی۔

”زویا۔“

کچھ دیر تک اسے دیکھنے کے بعد شہرام نے پکارا، تو اس نے گردن موڑ کر سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔

”آئی ایم سوری میں تمہیں دکھ دینا نہیں چاہتا۔ بلاشبہ انکل اور تمہارا خلوص نایاب ہے۔ میرے لیے خوش نصیبی کی علامت ہے کہ تم جیسی انمول لڑکی میرے لیے کچھ بہت ہی خاص جذبات رکھتی ہے۔“

زویا کے چہرے پر ایک دم شرم کی لالی بکھری اور اس نے فوراً رخ پھیر لیا۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ اس کے جذبے کسی کے سامنے اس طرح عیاں بھی ہو سکتے ہیں۔ شہرام نے اس کا شرمانا محسوس کر لیا تھا۔

”زویا مجھے تمہارے انمول جذبے کی صداقت پر کوئی شک نہیں ہے، مگر اس محبت کا ذائقہ میں بہت پہلے چکھ چکا ہوں۔ میں اگر چاہوں بھی تو اپنی پہلی محبت کو کبھی نہیں بھول سکتا اور نہ ہی اس کی جگہ کسی اور کو دے سکتا ہوں۔“

شہرام نے اُداس لہجے میں کہا۔ کسی کا مسکراتا چہرہ اس کی نگاہوں کے سامنے پھرنے لگا۔ زویا نے اس کی کھوئی کھوئی حالت کو محسوس کیا۔

”محبت کو بھولنے یا اس کی جگہ کسی اور کو دینے کے لیے کس نے کہا ہے۔“

زویا نے نرمی سے پوچھا، تو شہرام نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ جیسے اس کی بات سمجھنے کی کوشش کر رہا ہو۔

”کیا تمہیں ایسا لگتا ہے کہ ہم کسی کی جگہ لینا چاہیں گے۔ نہیں شہرام پھر تم آج تک ہمیں جان ہی نہیں سکے۔ ہم اپنی جگہ خود بنانا بہت اچھی طرح سے جانتے ہیں۔ تم صرف عزت اور ساتھ دینے کا وعدہ کرو۔ محبت کو ہم پر چھوڑ دو۔“

زویا نے اپنے مخصوص پُر اعتماد لہجے میں کہا، تو شہرام کچھ دیر اسے دیکھتا ہی رہ گیا۔ جب خاموشی کا وقفہ بڑھا، تو زویا نے ہی اسے توڑا تھا۔

”شہرام! ہمیں بتائو گے نہیں وہ کون تھی؟ اور تمہیں کیوں نہیں مل سکی؟“

زویا کے لہجے میں اشتیاق چھپا ہوا تھا۔

”وہ لڑکی! بالکل تمہارے جیسی ہی تھی زویا۔ خوبصورت، پُر اعتماد، ذہین، پل میں دوسروں کو اپنا بنا لینے والی مگر وہ تمہاری طرح محبت کی پہچان نہیں کر پائی تھی۔ اپنی ضد اور نفرت میں اس نے سب کچھ خاک میں ملا دیا۔ سب کچھ زویا۔ اپنے میرے خواب بھی اور کسی کی ذات بھی۔“

شہرام کا لہجہ دکھ میں ڈوبا ہوا تھا۔

”ایسا کیا کیا تھا اس لڑکی نے۔“

زویا نے پوچھا، تو شہرام گہری سانس لیتا ہوا، اسے ماضی کی بھول بھلیوں میں لے گیا جہاں اس نے اپنی محبت اور اپنی دوستی کو ایک ساتھ کھویا تھا۔ یہ بات ہے اس وقت کی جب شہرام کا شادی سے دو دن پہلے شدید ایکسیڈنٹ ہوا تھا۔ زخمی ہونے کی وجہ سے اس کی شادی ملتوی کر دی گئی تھی اور پھر...

☆...☆...☆

”فارینہ تمہارے ساتھ آخر مسئلہ کیا ہے۔ کیوں تم اپنی بلاوجہ کی ضد اور چڑ میں احقانہ حرکتیں کرتی، سب کی نظروں میں آرہی ہو؟“

فارینہ کے گھر وہ پہنچا تو، پہلے تو اس نے شہرام سے ملنے سے منع کر دیا۔ اسے بہت غصہ تھا اس پر مگر شہرام نے بغیر ملاقات کیے واپس جانے سے انکار کر دیا تھا۔ غصے

میں بھری وہ تن کر اپنے کمرے سے باہر نکلی اور لاؤنچ میں بیٹھے ڈیڈ سے باتیں کرتے شہرام کے سر پر پہنچ کر بولی۔

”ہاں، بولو اب کیا تکلیف ہے تمہیں؟“

”فیری! یہ کیا طریقہ ہے بات کرنے کا؟“ مرتضیٰ ہاشم کی بھلے وہ لاڈلی اور دل عزیز بیٹی تھی، مگر وہ اصولوں کے معاملے میں سخت بھی تھے۔

”سوری ڈیڈ! مگر آپ نہیں جانتے، شہرام نے مجھے کتنا ہرٹ کیا ہے۔“

فارینہ نے باپ کے پاس صوفے پر بیٹھتے ہوئے کندھے پر لاڈ سے سر رکھا اور شہرام کو گھورتے ہوئے کہا۔

”جو بھی ہے فیری! میں شہرام سے ساری بات سن چکا ہوں۔ تمہارا رویہ نامناسب لگا ہے مجھے۔ ایڈم سے میں بھی مل چکا ہوں بہت بار۔ وہ مجھے ایسا نہیں لگتا اور بل فرض اگر تم نے کچھ ایسا ویسا محسوس کیا تھا یا تمہیں غلط لگا تھا تمہیں مجھ سے یا شہرام سے ذکر کرنا چاہیے تھا۔ ایسے کس طرح تم نے اس پر الزام لگا دیا۔ بغیر کسی ثبوت کے۔“

مرتضیٰ ہاشم نے سنجیدگی سے اسے سمجھایا۔ وہ ایک مشہور بزنس مین تھے جن کا زیادہ تر وقت ملک سے باہر گزرتا تھا۔ مرتضیٰ ہاشم کی دوسری بیوی اور تین بچے لندن

میں رہتے تھے۔ فارینہ کی ماں سے ان کی محبت کی شادی تھی اور فارینہ کی پیدائش کے پانچویں سال، ان کا انتقال ہو گیا تھا۔ مرتضیٰ ہاشم کے خاندان نے ان کی دوسری شادی تو کروا دی مگر وہ کبھی بھی اپنی محبت کو نہیں بھول سکے۔ اسی لیے فارینہ کی پرورش میں کبھی بھی غفلت نہیں برتی تھی انہوں نے اور یہ ہدایت سختی سے اپنی دوسری بیوی کو بھی کی تھی۔ سوتیلی ماں اور چھوٹے بہن بھائیوں کی وجہ سے اس کی نفسیات میں کوئی گڑبڑ پیدا نہ ہو، اسی لیے انہوں نے سمجھ داری سے کام لیا تھا۔

دوسری بیوی اور بچوں کو لندن سیٹ کر دیا تھا اور فارینہ بہت قریبی اور خاندانی ملازمہ کی زیر نگرانی بڑی ہونے لگی۔ کچھ سال پہلے اس کا بھی انتقال ہو گیا مگر تب تک فارینہ سمجھ دار ہو چکی تھی۔

فارینہ کی سوتیلی ماں شہلا اور اس کے تینوں چھوٹے بہن بھائی (دو بھائی اور ایک بہن) جب بھی پاکستان آتے، فارینہ کے ساتھ ان کا بہت اچھا وقت گزرتا۔ فارینہ کی اپنے بہن بھائیوں سے بہت دوستی بھی تھی اور فارینہ کی شادی پر آنے کے لیے وہ سب بہت پُرجوش تھے مگر شادی ملتوی ہونے سے سب پلان دھرے کے دھرے رہ گئے جس کا افسوس وہ بار بار کر رہے تھے۔ شہلا جو ایک مہینا پہلے پاکستان

آگئی تھیں، شادی ملتوی ہونے کا سن کر کچھ دن پہلے ہی واپس چلی گئیں تھیں۔ کچھ دنوں بعد مرتضیٰ ہاشم بھی لندن جانے سے پہلیفارینہ کو اچھی طرح سمجھا رہے تھے۔ زیادہ لاڈ پیار اور اکیلے رہنے کی وجہ سے فارینہ بہت خود سر اور ضدی ہو چکی تھی۔ اسی لیے آج تک جو دل میں آیا، وہ ہی کیا تھا اس نے۔

”مگر ڈیڈ!“ فارینہ نے کچھ کہنا چاہا انہوں نے ہاتھ کے اشارے سے روک دیا۔ ”بس! میں اس بارے میں کچھ اور نہیں سنوں گا فیری۔ ایڈم سے میں خود معذرت کر لوں گا۔“

مرتضیٰ ہاشم نے اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے کہا، تو فارینہ منہ بنا کر رہ گئی۔

”اب تم مت شروع ہو جانا۔ مجھے پہلے ہی بہت غصہ ہے تم پر۔“

شہرام نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا ہی تھا جب فارینہ نے اسے روک دیا۔

”وہ تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ۔۔۔“ شہرام نے ڈرتے ڈرتے کہنا شروع کیا۔

”تمہارے ڈیڈ بہت سیدھے سادھے ہیں فارینہ۔“

”وہ کیسے!“ فارینہ نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

”انکل تمہیں فیری یعنی ”پری“ کہتے ہیں۔ جب کہ تمہارے جارحانہ مزاج کو دیکھتے

ہوئے تمہیں ”پری“ کے بجائے چیڑیل کہنا زیادہ مناسب لگتا ہے۔ شہرام یہ کہتے

ہوئے فوراً صوفے سے اٹھ گیا کیوں کہ فارینہ نے کُشن اٹھا اٹھا کر اسے مارنا شروع کر دیے تھے۔

”شہرام کے بچے! آج تمہاری خیر نہیں۔“

فارینہ نے اس کی طرف بڑھتے ہوئے کہا، تو وہ ہنستے ہوئے ہاتھ اٹھا کر کہہ رہا تھا۔
”خیر، تو میری زندگی سے اسی دن ختم ہو گئی تھی، جب سے تم سے محبت کی ہے فارینہ۔“

اس کی بات سن کر فارینہ اپنی جگہ ٹھٹک کر رک گئی۔

”تم ساتھ ہو تو سب ”خیر“ ہی ”خیر“ ہے فارینہ۔“

”کیا ہوا؟“ شہرام نے اس کا ٹھٹکنا محسوس کر لیا تھا۔ وہ نفی میں سر ہلا کر رہ گئی۔
”اچھا کل شام ثمرہ نے تمہیں گھر بلایا ہے۔ وہ جانے سے پہلے تم سے ملنا چاہتی ہے اور...“

شہرام نے کچھ کہنا چاہا مگر فارینہ نے نخوت سے اس کی بات کاٹ دی۔

”میری اس سے بات ہو گئی ہے۔ تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ تم جاؤ اپنے اس ایڈی، میڈی کے پاس۔“

فارینہ نے اس طرح چڑ کر کہا کہ شہرام بے ساختہ ہنسنے پر مجبور ہو گیا۔

”تم اس طرح کہہ رہی ہو جیسے وہ میرا دوست نہیں، میری گرل فرینڈ ہے، حد ہے یار۔“

”شہرام! تم اس پر اندھا اعتماد کر کے ایک دن نقصان اٹھاؤ گے۔“

فارینہ نے سنجیدگی سے کہا۔

”اور فارینہ، اپنی بدگمانی اور نفرت پر تم ایک دن بہت پچھتاؤ گی۔“

شہرام نے بھی سنجیدگی سے جواب دیا اور اسے گڈ بائے کہتا ہوا چلا گیا۔ فارینہ سر جھٹک کر رہ گئی۔

”مائی فٹ!“ فارینہ نے نفرت سے کہا اور مڑ کر اپنے کمرے کی طرف چلی گئی۔ اگلی شام وہ بہت خوش گوار موڈ میں ثمرہ سے ملنے اکیلی گھر سے نکلی مگر جب رات گہری ہو جانے پر بھی وہ نہیں پہنچی تو شہرام نے جو اس کے نمبر پر کافی دیر سے کال کر رہا تھا، پریشان ہو کر اس کے گھر فون ملا دیا۔ جہاں سے اسے پتا چلا کہ وہ تو کب کی گھر سے جا چکی ہے۔ یہ سنتے ہی شہرام کی پریشانی بڑھ گئی۔ اس کا موبائل مسلسل آف جا رہا تھا۔ مجبوراً شہرام نے انکل مرتضیٰ کو کال کی۔ انہوں نے فوراً ہی اپنے خاص بندے بیٹی کی تلاش میں روانہ کر دیے۔ جنہوں نے کچھ ہی دیر بعد مکمل تفصیل سے انہیں آگاہ کر دیا جسے سنتے ہی انہیں ایسا لگا جیسے کسی نے ان کے جسم

سے جان نکال دی۔ یہ ہی حال شہرام کا تھا جب اسے پتا چلا کہ فارینہ کی کار ہائی وے سے ملی ہے اور پولیس کے اندازے کے مطابق اسے بہت چالاکی سے اغوا کیا گیا ہے۔ کار ہائی وے سے ملنا ایک اور سوالیہ نشان تھا کیوں کہ وہ بالکل الٹ راستہ تھا شہرام کے گھر سے۔ یا تو یہ پولیس کو چکمہ دینے کی کوشش تھی یا پھر فارینہ کو شہر سے باہر لے جایا گیا تھا جو بھی تھا فارینہ کے اغوا نے دونوں گھرانوں میں قیامت برپا کر دی۔ مرتضیٰ ہاشم اور شہرام نے اپنے تمام ذرائع بروئے کار لانے شروع کر دیے مگر تا حال اس کا کوئی سراغ نہیں مل رہا تھا۔

اور دن تھے کہ جیسے پر لگا کر اڑ رہے تھے۔

☆...☆...☆

”ہمارے پوتے کا نام، سائیں رکھے گا۔“ خان زادہ شمشیر نے جب اس بات کا اعلان کیا تو سب کے ساتھ ساتھ سائیں بھی حیران رہ گیا۔

”آپ نے پہلے ہی مجھ ناچیز کو بہت عزت دی ہے صاحب! خاک کو قدموں کی دھول ہی رہنے دیں۔ اپنی اوقات سے زیادہ اڑے گی، تو سب کی آنکھوں میں چھینے لگے گی۔“ سائیں نے سنجیدگی سے کہا۔

”تم ایسا کیوں سوچتے ہو سائیں! سب انسان برابر ہوتے ہیں۔ کوئی کم یا زیادہ یا کوئی بھی چھوٹا بڑا نہیں ہوتا۔“

خان زادہ شمشیر نے کہا، تو سائیں خاموشی سے ان کا چہرہ دیکھتا رہا۔

”صاحب! آپ کے نزدیک انسان اور انسانیت کی کیا تعریف ہے؟ کیا صرف اپنے پیانے پر اسے جانچتے اور پرکھتے ہیں یا پھر اس خدا کے بنائے پیانے پر۔“ سائیں کا انداز سرسری سا تھا مگر اس کے لہجے میں کاٹ تھی۔

”میں کچھ سمجھا نہیں بر خودار۔“ ان کا انداز الجھا ہوا سا تھا۔

”بہت سادہ سی بات ہے صاحب! انسانیت سمجھنے کی چیز نہیں ہے، محسوس کرنے کی بات ہے۔ وہ انسان اتنا ہی بلند اور عظیم ہو گا جو انسانیت کو زیادہ سے زیادہ محسوس کرے گا۔ سمجھنے والے کام دماغ کے لوگ کرتے ہیں۔ جب کہ انسانیت کا تعلق ”دل“ سے ہوتا ہے۔“

سائیں کی وضاحت نے خان زادہ شمشیر کو گم صم سا کر دیا۔

”اگر انسانیت کا یہ پیانہ ہے تو پھر ہم سے بڑا ظالم کون ہے سائیں۔ تم تو سب جانتے ہو نا۔“

ان کے لہجے میں پچھتاوے کی جلن تھی۔

”بس ایک میں ہی تو سب جان گیا ہوں صاحب! اسی ”جاننے“ نے تو اس نگر کا سفر پاؤں سے باندھا ہے۔ نہیں تو میں اپنے حال میں مطمئن، خلق خدا کی خدمت میں اپنے رب کی رضا تلاش کر رہا تھا۔ آپ جانتے ہیں ”وہ ذات“ بندے کو قدم قدم پر ایسے دل شکن امتحانوں میں ڈالتی ہے کہ ہر بار ٹوٹنا پڑتا ہے۔ وہ پھر جوڑتا ہے اور تب تک یہ عمل جاری رہتا ہے جب تک آزمائش کی بھٹی جلا جلا کر، اس کی رضا اور پسند کے مطابق خالص نہیں کر دیتی۔ کبھی کبھی سوچتا ہوں کہ شاید اسے کچھ لوگ محروم ہی سب سے زیادہ پسند آتے ہیں۔ اس لیے وہ انہیں ساری زندگی محروم ہی رکھتا ہے۔“ سائیں نے اُداسی سے کہا۔

”مجھے لگتا ہے میں نے آپ کی خوشی کے رنگ، اپنی بے سروپا باتوں سے پھیکے کر دیے جس کے لیے میں معذرت خواہ ہوں۔“

سائیں نے خود کو سنبھالتے ہوئے کہا، تو خان زادہ شمشیر نے نفی میں سر ہلایا تھا۔

”ایسی بات نہیں ہے سائیں! تمہاری باتوں کے آئینے میں اپنا آپ بہت واضح نظر آتا ہے۔“

انہوں نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ پھر سب کے بے حد اصرار پر سائیں نے بچے کا نام خان زادہ شاذل تجویز کیا جسے سبھی نے بہت پسند کیا تھا۔ بچی کا نام خان

زادہ شمشیر نے زینب رکھا۔ دونوں بچوں کا عقیقہ بہت شاندار ہوا۔ غریب و غربا میں گوشت کے ساتھ کھانا بھی تقسیم کیا گیا۔ حویلی کے بڑے سے ہال نما کمرے میں مہمان خواتین موجود تھیں۔ عائشہ خوشی سے بھرپور انداز میں بیٹھی سب سے باتیں کر رہی تھی۔ جب نور بانو نے سائیں کو بلایا۔ خواتین کا خیال کر کے سائیں پردے کے پیچھے ہی منتظر کھڑا ہو گیا۔ نور بانو نے اس کے قریب پہنچ کر ملازمہ کو اشارہ کیا۔

”سائیں! دونوں بچوں کو پیار تو دیا نہیں تم نے۔“ نور بانو نے کہتے ہوئے ملازمہ کی گود سے بچے کو تھاما اور ہاتھ بڑھا کر آگے کر دیا۔

سائیں نے پردے کے پیچھے سے اپنے دونوں ہاتھ آگے کیے۔ بچے کو پکڑاتے ہوئے نور بانو کی نظر اس کے ہاتھوں پر پڑی اور پھر پلٹنا ہی بھول گئی۔ سائیں کے دائیں ہاتھ کی شہادت کی انگلی کے نیچے بنا چاند جیسا نشان، انہیں کئی سال پہلے کی اس اندھیری اور ادھوری رات میں لے گیا۔

اتنے سال گزرنے کے باوجود بھی انہوں نے اس ادھورے وجود کی، اس نشانی کو یاد رکھا تھا۔ ان کی پیاسی ممتا کے لیے ایک وہ ہی نشان وجہ تسکین تھا اور آج ویسا ہی نشان اس کے ہاتھوں پر بھی تھا۔ وہ ساکت کھڑی رہ گئیں جب ملازمہ نے انہیں

آواز دے کر دوسرا بچہ تھمایا۔ سائیں سے پہلا بچہ واپس لیتے اور دوسرا بچہ پکڑاتے اور پھر لیتے ہوئے انہوں نے بار بار اس نشان کی طرف دیکھا تھا۔

ان کا دل بار بار کہہ رہا تھا کہ سائیں کی طرف ان کا جھکاؤ اور تڑپ بلاوجہ نہیں تھی مگر پھر وہ ٹھٹک جاتیں کہ وہ بچہ تو خواجہ سرا پیدا ہوا تھا جبکہ سائیں تو...

وہ جتنا سوچتیں، اتنا ہی الجھتی جا رہی تھیں مگر وہ تلاش کا کوئی سرا نہیں ملا تھا انھیں۔ سائیں وہاں سے واپس جا چکا تھا مگر نوربانو کو احساس ہی نہیں ہوا۔ انہوں نے لاکھ کوشش کی اپنی سوچوں کو اس خیال سے آزاد کرنے کی لیکن جتنی کوشش کرتیں اتنا ہی ان کا دل الجھتا جا رہا تھا۔ جب یہ گھٹن اور تکلیف برداشت سے باہر ہو گئی تو رات کے پچھلے پہر وہ خاموشی سے اپنے کمرے سے نکلی تھیں۔ کل صبح سائیں کی روانگی تھی۔ ان کے پاس صرف آج کی رات تھی، اپنے واسطے یا سچ کو جانچنے کی۔ وہ اپنے خیالوں میں اتنی مگن تھیں کہ انھیں احساس ہی نہیں ہو سکا کہ کوئی اور بھی رات کے آخری پہر، انہیں اس طرح دیکھ کر چونکا اور ان کے پیچھے پیچھے چل پڑا تھا۔

نوربانو کے قدم حویلی کے مہمان خانے میں موجود سائیں کے کمرے کے سامنے جا رکے تھے۔ ان کی دستک سے اپنی سوچوں میں گم سائیں نے حیرت سے دروازے پر ہوتی دستک سنی۔

”اس وقت کون آگیا؟“

سائیں نے دروازے کی طرف قدم بڑھاتے خودکلامی کی۔ دروازہ کھلتے ہی وہ چونک گیا۔

”ماں جی آپ!“ نوربانو کو دیکھ کر وہ حیران رہ گیا۔ نوربانو نے کوئی جواب نہیں دیا اور کمرے میں آگئیں۔ سائیں ان کے انداز پر اپنی بڑھتی حیرانی کو نہیں روک پا رہا تھا۔ نوربانو ایک دم پلٹیں اور اس کی طرف دیکھتے ہوئے بولیں۔

”کون ہو تم؟“ سائیں بری طرح چونکا۔

”کیا مطلب آپ کا؟“ سائیں نے الجھتے ہوئے سوال کیا۔ نوربانو چند قدم اس کی طرف چل کر آئیں۔

”میں نے پوچھا کون ہو تم؟ دنیا کے سامنے جو بہروپ تم نے اختیار کیا ہے وہ تمہارا اصل نہیں ہے۔ تمہارا اصل وہ ہے جس سے تم منہ چھپا کر بھاگتے پھر رہے ہو۔“ نوربانو نے سخت لہجے میں کہا۔ سائیں خوف سے چند قدم پیچھے ہٹا۔

”ک، کیا مطلب آپ کا۔“ اس کے منہ سے الفاظ بھی ٹوٹ کر نکل رہے تھے۔ نوربانو چند لمحے اس کے چہرے کے اڑے رنگ کو دیکھتی رہی۔

”اگر دنیا کو یہ پتا چل جائے کہ سائیں کے لبادے میں ایک خواجہ سرا چھپا ہوا ہے تو۔۔۔“

سائیں کو ایسا لگا جیسے اس کے قدموں تلے سے زمین کھسک گئی ہو۔ وہ بے اختیار نیچے بیٹھتا چلا گیا۔ کچھ سیج ایسے ہوتے ہیں جو جسم سے جان ہی نہیں، روح بھی کھینچ لیتے ہیں۔ سائیں گھٹنوں کے بل نیچے بیٹھا اور بلک بلک کر رونے لگا۔

آج پھر خدا نے اسے، وہاں بے پردہ کیا تھا جہاں سے اسے عزت اور محبت نام لینے، یاد رکھنے کی خواہش تھی۔

اس ہستی کے سامنے جسے اس نے سب سے محبوب جانا اور سمجھا تھا۔ آج پھر خدا نے اسے مٹی کے پتلے سے، خاک کے ذروں میں تقسیم کر دیا تھا۔ اس کی خاک اڑ رہی تھی، اڑ، اڑ کر دور دور تک پھیل رہی تھی۔

شاید دنیا میں خواجہ سرا بن کر جینا مشکل نہیں تھا، دنیا میں خواجہ سرا ہو کر نیک نامی اور عزت کی زندگی گزارنا گناہ تھا۔

خواجہ سراؤں کو یہ معاشرہ صرف ہر چوک، ہر سنگل پر تیز میک اپ اور گہرے رنگوں کے چمکیلے لباس میں ہاتھ پھیلا کر مانگتا ہوا دیکھنا چاہتا ہے۔ ایسے لوگوں سے ہمدردی بھی کر لیتا ہے اور بھیک بھی دے دیتا ہے مگر کبھی خواجہ سراؤں کو عزت کا مقام نہیں دیتا۔

خواجہ سراؤں کو یہ معاشرہ شادی بیاہ، بچوں کی پیدائش پر ناپچتے، خوشیاں بانٹتے تو دیکھ سکتا ہے مگر یہی معاشرہ انہیں درس گاہوں کا ماحول اور روٹی کمانے کے باعزت طریقے نہیں دیتا۔

یہ معاشرہ ان کی بددعا کے خوف سے، انہیں صدقہ، خیرات تو دے دیتا ہے مگر یہی معاشرہ ان کی دل آزاری کے خیال سے ان کی تضحیک کرنا نہیں بھولتا۔

یہ اصول کب اور کیسے رائج ہوئے؟ کس نے یہ بتایا کہ خواجہ سراؤں کا مقام انسانیت کے سب درجوں میں، سے سب سے آخر والے درجے پر آتا ہے؟ خدا نے تو اپنی کتاب میں یہ حکم نہیں نازل کیا۔

حضرت محمد ﷺ نے اپنے عمل مبارکہ اور حدیث میں ایسا کچھ نہیں فرمایا کہ جس کی مثال تاقیامت قائم رہے بلکہ آپ ﷺ کے ایک صحابہ بھی اسی جنس سے تعلق رکھتے تھے مگر وہ بھی اتنے ہی قابل احترام اور محترم تھے، جتنے کہ باقی صحابہ۔

پھر یہ عقل اور دانش کے بڑے بڑے دعوے کرنے والے، خدا کے فرمان اور نبی پاک ﷺ کے عمل کی راہبری کیوں نہیں کرتے۔

رب نے ساری کائنات تخلیق کی، اپنی سب مخلوق بنائی اور اپنی ذات کو، اپنی صفات کو، اپنی رضا کو ہر چیز میں بانٹ کر رکھ دیا۔ اس ذات نے کسی ایک مخلوق، کسی ایک جان دار کو اپنے لیے مخصوص نہیں کیا، ہاں مگر انسان کو اشرف مخلوقات کا درجہ اور زمین پر اپنا نمائندہ بنا کر ضرور بھیجا مگر انسان میں مرد و عورت کے ساتھ ساتھ خواجہ سرا بھی شامل ہوتے ہیں۔ انسان صرف مرد یا عورت کے وجود کا نام نہیں ہے۔ انسان کے لیبل اور انسان کے فرائض خواجہ سراؤں پر بھی اسی طرح لاگو ہوتے ہیں جیسے کہ ہر مرد و عورت پر! اس کی ذات کا جلوہ، اس کی ذات کا پرتو ہر ذرے ذرے میں چھپا ہوا ہے۔ اگر وہ ذات خواجہ سراؤں کو بنا کر شرمندہ نہیں، تو پھر خواجہ سرا یا دوسرے لوگ کیوں ان کے وجود پر شرمندگی محسوس کرتے ہیں۔

”یار کو ہم نے جا بجا دیکھا
کہیں ظاہر، کہیں چھپا دیکھا
کہیں ممکن ہوا، کہیں واجب

کہیں فانی، کہیں بقا دیکھا
کہیں وہ بادشاہ تخت نشین
کہیں کاسہ لیے گدا دیکھا۔

نور بانو نے اسے روتے ہوئے دیکھا اور آہستہ آہستہ چلتی اس کے پاس آئیں اور نیچے زمین پر بیٹھتے ہوئے، اس کے جھکے سر پر اپنا، سر رکھتے ہوئے بولیں:
”میرا دل کہتا تھا! تم سے میرا کوئی بہت گہرا تعلق اور رشتہ ہے، مگر کیا یہ کبھی نہیں سمجھ سکی۔ تمہیں یہ تلخ بات نہ کہتی تو مجھے کیسے پتا چلتا کہ تم میرے ہی وجود کا وہ گم شدہ حصہ ہو جس کی تڑپ نے مجھے کبھی چین سے جینے نہیں دیا۔“
نور بانو کی آنکھوں سے آنسو بہتے ہوئے اس کے بالوں میں گم ہو رہے تھے۔ سائیں نے اپنا جھکا ہوا سر اٹھایا۔ اس کی آنکھوں میں حیرت کا سمندر تھا۔
”آپ جانتی ہیں کہ میں آپ کا...“ اس نے بات ادھوری چھوڑ دی۔ کیوں کہ اب نور بانو ساکت نظروں سے اسے دیکھ رہی تھیں۔

”تو کیا تم یہ بات پہلے ہی سے جانتے تھے کہ تم اس حویلی کا حصہ ہو۔“ ان کے پوچھنے پر سائیں سیدھا ہو کر بیٹھا اور اپنے بھیگے چہرے کو ہاتھ کی پشت سے صاف کرتے ہوئے اثبات میں سر ہلانے لگا۔

”پہلے نہیں پتا تھا مگر جب آپ لوگ میرے پاس دعا کروانے آئے تھے اور پھر ایک دن، خان زادہ شمشیر نے باتوں ہی باتوں میں، کسی کمزور لمحے کی زد میں آکر اپنے سینے کا بوجھ، میرے سینے پر راز کی طرح منتقل کر دیا تھا۔ شاید اتنے سالوں سے وہ کسی کو اپنے دل کی بات، اپنے دل کا درد نہیں بتا سکے تھے اور اس ڈھلتی دوپہر ہی میں نے جانا کہ میں...”

سائیں کی نگاہوں کے سامنے اس دن کا سارا منظر گھوم رہا تھا۔ جب خان زادہ شمشیر نے اس کے ساتھ اپنا درد بانٹا تھا۔

”مگر تمہیں کیسے پتا چلا کہ ہم ہی تمہارے ظالم والدین ہیں جنہوں نے تمہیں مارنے کے لیے کسی کے ہاتھوں میں سوئپ دیا تھا۔“

نوربانو کے چہرے پر الجھن تھی۔ سائیں دھیرے سے مسکرا دیا۔ اس کی مسکراہٹ میں گزرے دنوں کا ہر پل، ہر لمحہ تھا۔ نوربانو دم بہ خود اسے سن رہی تھی۔ وہ زندگی میں پہلی بار ماں کے سامنے رو رہا تھا، اپنے سب دکھ، درد بتا رہا تھا، اپنے سفر کا حال سنا رہا تھا۔ نوربانو اس طلسم کدہ میں جا پہنچی تھیں، جہاں سائیں نے اپنی عمر کے اتنے سال گزارے تھے۔ جانے کتنا وقت بیت گیا۔ وہ دونوں تپوئے، جب

دروازے پر کھٹکا ہوا۔ نوربانو کے ساتھ ساتھ سائیں نے بھی دیکھا اور ساکت رہ گیا۔ دروازے پر مریم بھیگا چہرہ لیے کھڑی تھی۔ اتنی رات کو ماں کا پیچھا کرتے ہوئے وہ کبھی نہیں سوچ سکتی تھی کہ آج اس کے سامنے اتنے بڑے سچ نے عیاں ہونا تھا۔ ان سب نے یہی سنا ہوا تھا کہ سب سے پہلے ان کا ایک بھائی پیدا ہوا تھا جو پیدائش کے فوراً بعد وفات پا گیا تھا مگر آج اس نے جانا کہ اصل حقیقت کیا ہے۔ یہ سچ جاننے کے بعد اسے لگ رہا تھا کہ اب کچھ بھی باقی نہیں رہا۔ آج سب ختم ہو گیا ہے۔

”مریم!“ نوربانو اپنی جگہ اسے اٹھ کر اس کی طرف بڑھی تھیں۔ مریم نے ہاتھ سے انہیں پیچھے رہنے کا اشارہ کیا، تو نوربانو روتی ہوئی دیوار سے لگ گئیں۔ آج اپنی اولاد کے سامنے، وہ بہت چھوٹی بن گئی تھیں۔ مریم چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی، کمرے کے وسط میں کھڑے سائیں کے پاس پہنچی۔ سائیں نے سر اٹھا کر اس کے بھیگے چہرے کی طرف دیکھا پھر نظریں جھکا لیں۔ وہ ان نظروں کی تاب نہیں لا سکتا تھا۔

”آپ کیوں نظریں چرا رہے ہیں۔ یہ کام تو معاشرے کے ان ٹھیکیداروں کو کرنا چاہیے تھا جنہوں نے آپ جیسی زندگیوں کو ایک سوال بنا کر معاشرے میں در بدر کی ٹھوکریں کھانے کے لیے چھوڑ دیا ہے۔“

مریم کا دوپٹا سر سے اتر کر اس کے قدموں کے میں لٹک رہا تھا۔ وہ اپنے حال سے بے خبر دکھ سے چور ہوتی بولے جا رہی تھی۔

”شرمندہ آپ کیوں ہوتے ہیں۔ شرمندہ تو ہمیں ہونا چاہیے نا۔ آپ خدا کے بنائے ادھورے وجود کے ساتھ بھی مکمل ہیں اور ہم جیسے لوگ خدا کے بنائے مکمل وجود کے ساتھ بھی ادھورے۔ پھر بتائیں کہ محروم اور بد بخت کون ہوا۔ آپ جیسے لوگ یا ہم جیسے؟“

مریم بلک بلک روتی اس کے کندھے سے آگئی۔ سائیں نے ایک بازو اس کے گرد پھیلا کر اسے دلاسا دیا۔ مگر وہ کسی طرح بھی خود کو نہیں سنبھال پا رہی تھی۔ زندگی کے کچھ سچ اتنے بھیانک انداز میں سامنے آتے ہیں کہ سب خوب صورت لگنے والے چہروں سے بھی نفرت محسوس ہونے لگتی ہے۔ یہی حال مریم کا تھا۔

اسی وقت ایک زور دار دھماکا سا ہوا۔ سب بری طرح چونکے۔ سائیں نے پلٹ کر دروازے کی طرف دیکھنا چاہا۔ جب کوئی چیز بہت زور سے اس کے سر سے ٹکرائی اور درد کی شدید لہر کے ساتھ وہ اپنے سر کو تھام کر زمین پر گر گیا۔ سن ہوتے دماغ کے ساتھ اس نے مریم کی چیخ بھی سنی تھی۔

☆...☆...☆

”موہنی تو یہاں بیٹھی ہے۔ میں کب سے تجھے ڈھونڈ رہی ہوں۔“ موہنی درختوں کے اسی جھنڈ کی ٹوٹی سیڑھیوں پر گم صم بیٹھی تھی، جب بیٹو نے اس کے پاس آکر کہا۔ آج جمعرات تھی اور مزار پر آنے والوں کا ہجوم بڑھ رہا تھا۔ کچھ دیر میں محفل سماع شروع ہونے والی تھی۔ علی یار انتظامات کی نگرانی میں مصروف تھا۔ موہنی پچھلے ایک ہفتے سے ماہی بے آب کی طرح تڑپتی، ہر احتیاط اور پابندی بھولتی جا رہی تھی۔ اس کی حالت ایسی تھی کہ نہ اسے کھانے کی فکر تھی اور نہ کسی اور کام کی۔ جہاں بیٹھی ہوتی وہیں بیٹھی رہ جاتی۔ رضیہ اس کی حالت سے بہت فکر مند تھی اور بار بار اس سے پریشانی کی وجہ دریافت کرتی مگر موہنی کچھ نہیں بتاتی تھی۔ موہنی کو ایسا لگتا تھا کہ جیسے اس نے، اپنی غلطی اور حماقت سے سائیں کو کھو دیا ہے، اب دوبارہ اسے نہیں دیکھ سکے گی۔ دن میں جب بھی اس کا علی یار سے سامنا ہوتا وہ ایک ہی سوال کرتی۔

”سائیں کب آئے گا؟“ علی یار کبھی تو اسے ٹال دیتا اور کبھی یک دم ہی غصے میں آ جاتا۔

”کیوں تجھے کیا تکلیف ہے بی بی۔ جا، جا کر اپنا کام کر۔“

وہ ہر بار غصے میں وہاں سے پلٹ آتی اور دوبارہ نہ جانے کا عہد کرتی مگر اگلے دن سب بھول بھال کر وہ پھر اسی سوال کا کشکول پھیلا کر علی یار کے راستے میں کھڑی ہو جاتی۔ ایک دن علی یار نے اسے راستے میں کھڑا دیکھ کر پاس آکر کہا۔

”سائیں کے بہ قول ان کے مرشد کہا کرتے تھے کہ بندہ اتنی ضد خدا سے کرتا اچھا لگتا ہے۔ بندے مان اور ضد کا بوجھ اٹھانے میں اکثر چوک جاتے ہیں۔“

”چوک تو میں گئی تھی، اسی لیے آج تیری منت کرنی پڑ رہی ہے۔“ موہنی نے تیکھے لہجے میں کہا، تو علی یار تھک ہار کر خود سے بولا تھا۔

”سائیں نے ٹھیک کہا تھا۔ تیری عقل کا خانہ خالی ہے۔“

علی یار یہ کہتے ہوئے وہاں سے چلا گیا۔ جب کہ موہنی گم صم سی وہاں کھڑی رہی۔ ”کیا سائیں میرے بارے میں بات کرتا ہے، میری فکر کرتا ہے؟“ اس سوچ نے اسے یک دم ہی خوشی سے مالا مال کر دیا تھا۔ اتنے دنوں سے چھائی اُداسی آج ختم ہو گئی تھی مگر یہ تھوڑی دیر تک ہی رہا۔ پھر وہ اسی بے کلی اور بے چینی کا شکار ادھر ادھر پھرنے لگی۔ ان دنوں اسے اس بات کی سمجھ بہت اچھی طرح سے آئی تھی کہ محبت میں بے کلی اور بے چینی میں گزرا ہر لمحہ بہت بھاری اور جان لیوا

ہوتا ہے۔ کسی کو آپ کا انتظار رہے۔ یہ بہت عام سا لگتا ہے سننے میں مگر آپ کو کسی کا انتظار رہے یہ پل صراط پر چلنے کے مترادف ہوتا ہے۔

”کیا کام ہے تجھے پیو؟“

موہنی نے بے زار لہجے میں اس سے پوچھا، تو پیو اپنے چہرے پر تکلیف کے تاثرات طاری کرتے ہوئے بولی۔

”کل رات سے میری طبیعت بہت خراب ہے موہنی۔ ساری رات درد سے تڑپ کر گزاری ہے۔ کسی دوائی سے فرق نہیں پڑ رہا۔ مجھے وہ جیدے (جاوید) کی ماں نے بتایا ہے کہ وہ جو شہر میں بڑی سے دکان ہے دوائیوں کی وہاں ایک ڈاکٹر بیٹھتا ہے۔ اس کے ہاتھ میں بڑی شفا ہے، میں وہاں سے دوائی لے لوں جا کر مگر تجھے پتا ہے کہ میں اتنی دور اکیلی نہیں جاسکتی اور میرے ساتھ کوئی جانے پر بھی تیار نہیں ہے۔ اگر برا نہ مانے تو، تُو چلے گی میرے ساتھ۔ بس ہم آدھے گھنٹے میں واپس آ جائیں گے۔“

پیو نے اسے گھیرتے ہوئے کہا۔

”جیدے کی ماں نے کہا ہے تو تم اسی کے ساتھ چلی جاؤ۔ میرا دل نہیں کر رہا کہیں بھی جانے کو۔“

موہنی نے چڑ کر جواب دیا۔ دس سالہ جاوید اور اس کی بے سہارا ماں بھی یہاں رہتے تھے۔ اسی لیے موہنی ان سے اچھی طرح واقف تھی۔

”چل ٹھیک ہے تیری مرضی۔ میں کسی کی ترلے منتیں کیا کروں۔ میری تکلیف ہے میں جانو۔ رہ لوں گی ایسے ہی۔“

پینو نے اُداسی سے کہا اور واپس پلٹ گئی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر موہنی کو دکھ ہوا۔

”میں بھی کبھی کبھار کتنی کٹھور بن جاتی ہوں۔ اس دن پینو نے میری جان بھی بچائی تھی۔“ موہنی نے ہمدردی سے سوچا اور اپنی جگہ سے کھڑے ہوتے ہوئے اسے آواز دی جو آہستہ آہستہ قدموں سے چلتی اس کے پکارنے ہی کی منتظر تھی۔

”اچھا ٹھیک ہے میں چلتی ہوں مگر ٹھہر میں کسی کو بتا کر آتی ہوں۔“ موہنی نے اسے وہاں ہی رکنے کا کہا اور مزار کی طرف مڑ گئی۔

”ہائے ربا میں مر گئی۔“ پینو چیخ مار کر نیچے زمین پر گر گئی۔ موہنی فوراً اس کی طرف بھاگ کر آئی اور در دے سے تڑپتی پینو کو سنبھالتے ہوئے پریشانی سے پوچھنے لگی۔

”کیا ہوا پینو! تُو ٹھیک تو ہے نا!“

”میرے پیٹ میں بہت درد ہو رہا ہے۔ مجھے جلدی سے ڈاکٹر پر لے چل۔ کہیں میں یہاں مر ہی نہ جاؤں۔ جلدی کر موہنی۔“

پینو نے اس طرح شور ڈالا کہ موہنی کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ اسے سہارا دے کر وہ آہستہ آہستہ چلتی مزار کی پچھلی طرف آئی تو وہاں پہلے سے ایک رکشا موجود تھا۔ پینو فوراً اس میں بیٹھ گئی۔ موہنی نے بھی غور نہیں کیا کہ مزار کی پچھلی سڑک پر رکشے والے کا کیا کام ہے؟

پینو کے شور شرابے میں اس نے کسی طرف دھیان نہیں دیا تھا۔ چونکی تو تب جب رکشا ایک جھٹکے سے رکا۔ موہنی نے روڈ کی طرف دیکھا۔ کچھ آدمی جنہوں نے اپنے منہ چھپا رکھے تھے، فوراً ان کی طرف لپکے۔ اس سے پہلے کہ موہنی کچھ سمجھتی وہ اسے رکشے سے نکال کر کھینچتے ہوئے گاڑی کی طرف لے گئے۔ کار کی پچھلی سیٹ پر اسے دھکا دے کر دروازہ زور سے بند کیا۔ اس کھینچا تانی میں اس کا دوپٹا سر سے اتر گیا تھا۔ دوسری طرف کا دروازہ کھول کر ایک آدمی آ کر بیٹھ گیا۔ موہنی تڑپ کر اس سے دور ہوئی اور کار کے شیشے سے لگتے ہوئے مڑ کر مدد طلب نظروں سے باہر دیکھا۔ اسی وقت اس کی نظر پینو پر پڑی، وہ پینو کو آواز دے کر پکارنے لگی مگر وہ سامنے کا منظر دیکھ کر ساکت رہ گئی۔

کچھ دیر پہلے ، درد سے تڑپتی، پینو اب بہت آرام سے کھڑی کا روالے آدمی سے باتیں کر رہی تھی۔ اس لمبے تڑنگے آدمی نے نوٹوں کی ایک گڈی پینو کو پکڑائی جو اس نے فوراً اپنی چادر میں چھپالی۔ وہ خوشی سے کھلتے چہرے کے ساتھ ، اسی رکشے میں بیٹھنے لگی جب اس کی نظر بت بنی موہنی پر پڑی۔ اس کی آنکھوں میں یک دم نفرت پھیلی تھی جسے دیکھ کر موہنی دنگ رہ گئی۔ پھر اس نے طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ اسے دیکھا اور ہاتھ ہلاتے ہوئے رکشے میں بیٹھ کر چلی گئی۔ موہنی کو یاد آیا کہ علی یار نے بہت بار اسے پینو سے دور رہنے کی ہدایت کی تھی۔ سائیں نے ٹھیک کہا تھا اس کے بارے میں کہ اس کی عقل کا خانہ خالی ہے۔ اپنی حماقت اور نادانی سے وہ غلط باتوں میں پہنچ گئی تھی۔ اسے ہمیشہ خود پر بہت مان رہا تھا اور ہر بار ہی اسی طرح منہ کی کھانی پڑتی تھی۔ باقی دونوں آدمی بھی تیزی سے گاڑی کی طرف آئے۔ دونوں فرنٹ سیٹ پر بیٹھے تھے۔ پچھلی سیٹ پر بیٹھا آدمی اس پر سے نظریں ہٹانے کی کوشش کرنے کے باوجود کامیاب نہیں ہو پا رہا تھا۔ اس کی آنکھوں کی ہوس اور ہونٹوں پر شیطانی مسکراہٹ دیکھ کر موہنی خوف سے خود میں سمٹ کر رہ گئی۔ اس کا دوپٹا پتا نہیں کہاں رہ گیا تھا۔ اسے آج کسی اپنے کی بات شدت سے یاد آئی تھی کہ

”عورت تب تک ہی محفوظ اور بہادر ہے ، جب تک اپنوں کی پناہ میں ہے۔ باہر کی دنیا میں اس سے زیادہ کمزور اور بے بس کوئی اور نہیں ہوتا۔“

اپنی خود سری میں اس نے اس بات کی نفی کی تھی اور آج اسی بات نے اسے اس کی اوقات یاد دلا دی تھی۔

”اوائے راکٹ ، اپنی گندی نظریں ہٹا لڑکی پر سے۔ یہ صرف میرا مال ہے۔“

ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے شخص نے غراتے ہوئے کہا۔

”کیا ہو گیا ہے تجھے دلاور۔ ایک لڑکی کے لیے یار سے لڑ رہا ہے۔ آخر اس خزانے سے کچھ ہمیں بھی تو عنایت ہو گا نا۔ اتنی محنت کس لیے کی ہے ہم نے۔“

راکٹ کی رال ٹپک رہی تھی، مگر اس کا لہجہ بھی تلخ ہو چکا تھا۔

”بکواس بند کر اپنی۔“ دلاور نے اسے غلیظ گالیاں دی تھیں جسے سنتے ہی راکٹ کا چہرہ بھی تن گیا۔

”دلاور اپنی حد میں رہ۔ نہیں تو...“ اس کا ہاتھ ریگتے ہوئے اپنی کمر میں اڑسی پستول کی طرف گیا جسے دیکھتے ہی دلاور نے فوراً اپنی پستول نکال لی۔

”نہیں تو کیا کم ذات ، کتے ، کینے۔“

ایک عورت کے بے تحاشا حسن نے دونوں کا پاگل کر دیا تھا کہ وہ وقت اور حالات کو دیکھے بغیر لڑ رہے تھے۔ جب کہ تیسرا ساتھی جو ان سے عمر میں کافی کم لگ رہا تھا۔ مسلسل منمناتے ہوئے انہیں ٹھنڈا کرنا چاہ رہا تھا۔ موہنی نے موقع غنیمت جانا اور فوراً گاڑی کا دروازہ کھول کر سڑک پر چھلانگ لگا دی۔ اسے شدید چوٹیں لگیں مگر وہ کسی چیز کی پروا کیے بغیر اٹھ کر سڑک پر اندھا دھند بھاگنے لگی۔ وہ لوگ بھی گاڑی سے نکل کر اسے کے پیچھے بھاگے۔ موہنی نے جب انہیں اپنے بہت پاس آتے دیکھا تو اس کی سانسیں رکنے لگیں۔ اسی وقت اس نے ان میں سے کسی ایک کو پستول سے فائرنگ کرتے دیکھا۔

ساری فضا زوردار دھماکے سے گونج اٹھی۔ موہنی نے خوف سے چیخ ماری اور وہ منہ کے بل زمین پر گر پڑی۔

☆...☆...☆

وہ کون سی جگہ تھی؟ وہ کب سے وہاں تھی۔ اسے کچھ پتا نہیں تھا۔ ایک گندے سے کمرے میں اسے پھینک کر وہ دوبارہ خبر لینا بھول گئے تھے۔ کھانے کی ٹرے تینوں وقت باقاعدگی سے کمرے کے اندر کھسکا دی جاتی مگر کوئی اس کے سامنے نہیں آتا تھا۔ وہ تو گھر سے بہت اچھے اور خوشگوار موڈ میں نکلی تھی۔ کار ڈرائیو کرتے ہوئے

، اونچی آواز میں میوزک سنتے اسے پتا ہی نہیں چلا جب کوئی اچانک اس کی گاڑی کے سامنے آیا۔ گھبرا کر اس نے بریک لگائی اور غصے میں گاڑی کا دروازہ کھول کر نیچے اتری۔ سڑک پر اوندھے گرے شخص کی طرف بولتے ہوئے وہ بڑھی تھی۔ ”اندھے ہو، کیا نظر نہیں آتا؟“ اسی وقت اسے کچھ عجیب سا لگا جیسے اس کے پیچھے کوئی ہے۔ اس سے پہلے کہ وہ مڑتی کسی نے پیچھے سے ہاتھ بڑھا کر بھیگا رومال اس کی ناک پر رکھ دیا۔ بس تھوڑی دیر لگی اور وہ ہوش و حواس سے بیگانہ ہو گئی اور جب اسے ہوش آیا تو وہ اس نیم اندھیرے، کاٹھ کباڑ سے بھرے ہوئے کمرے میں موجود تھی۔ کچھ دیر لگی اسے سمجھنے میں کہ وہ کہاں ہے پھر اس نے چیخ چیخ کر آسمان سر پر اٹھا لیا مگر اس کی سننے والا کوئی بھی وہاں موجود نہیں تھا۔ یہ اس کا عالیشان گھر نہیں تھا جہاں اس کی ایک آواز پر نوکروں کی فوج اکٹھی ہو جاتی تھی۔ یہاں اس کے رونے، دھونے، چیخنے، چلانے پر کوئی نہیں آیا تھا۔ اس کی ہمت بھی جواب دے گئی تو وہ بے بسی سے روتے ہوئے کمرے کے ایک کونے میں پڑی سوچتی رہتی کہ اب اس کے ساتھ آگے کیا ہو گا مگر ایسے کسی بھی سوال کا جواب نہیں تھا اس کے پاس۔

جن گندے مندے برتنوں میں اسے کھانا دیا جاتا انہیں دیکھ کر پہلے دن اسے شدید کراہت کا احساس ہوا اور اس نے کسی چیز کو ہاتھ نہیں لگایا مگر آخر کب تک۔ جب بھوک حد سے باہر ہو گئی تو اسے مجبوراً ان ہی برتنوں میں کھانا پڑا۔ تب اسے احساس ہوا کہ بنیادی ضرورتوں سے آگے کچھ نہیں ہوتا۔ پتا نہیں وہ کون سا وقت تھا، جب اس نے اچانک کچھ دوڑتے، بھاگتے قدموں کی آوازیں سنی تھیں۔ کچھ شور جو اس کی سمجھ سے باہر تھا۔ پھر بہت سے لوگوں کی آوازیں گونجی تھیں۔ فارینہ ڈر کر ایک کونے سے لگ گئی۔ پھر کچھ دیر بعد، کچھ بھاری قدموں اور ان کے درمیان چھن چھن کی آوازیں جیسے گھنگھرو کی ہوں، اس کے دروازے کے سامنے آ کر رک گئیں۔ کسی نے دروازہ کھولنے کی کوشش کی پھر تھوڑی دیر بعد دروازہ پورے جھٹکے سے کھلا۔ اندر کچھ لوگ داخل ہوئے جن میں سے کچھ سادہ حلیے میں تھے اور کچھ کا حلیہ اور لباس فقیروں اور ملنگوں جیسا تھا۔ فارینہ کی دھندلی ہوتی آنکھوں نے ان میں سے کسی کو پہچانا چاہا۔ پھر اتنے چہروں میں ایک چہرہ اسے جانا پہچانا نظر آ ہی گیا۔ اس کے سوئے ہوئے اعصاب ایک دم سے جاگے تھے۔ اتنے دنوں سے بے دم اور نڈھال پڑی فارینہ میں، کوئی طاقت سی بھر گئی اور وہ بجلی کی تیزی سے اپنی جگہ سے اٹھی اور سامنے کھڑے شخص کا گریبان پکڑ کر چلانے لگی۔

”تم ذلیل، کمینے گھٹیا، بیخ ذات کے شخص۔ تمہاری جرأت کیسے ہوئی مجھے اغوا کرنے کی۔“

وہ پاگلوں کی طرح اس پر چیختی، چلاتی، تھپڑ برساتی جا رہی تھی۔ ساکت کھڑے ایڈم نے اس کے ہاتھ پکڑ کر اسے روکنا چاہا۔ اس کے ساتھ آئے باقی لوگ حیرت سے یہ تماشا دیکھ رہے تھے۔ فارینہ کے ناخنوں کے نشان ایڈم کے ہاتھوں اور گردن پر صاف نظر آرہے تھے۔ وہ اتنے دنوں کی فرسٹریشن، اس پر نکال رہی تھی۔ نہ کچھ سن رہی تھی اور نہ سمجھ رہی تھی۔

”فارینہ!“ ایڈم نے سختی سے اس کا بازو پکڑ کر اسے زور سے جھٹکا دیا۔ فارینہ ٹھٹک کر رک گئی اور اس کی سرخ آنکھوں میں دیکھنے لگی۔ نہ جانے کیسا عجیب سا احساس تھا ان آنکھوں میں کہ فارینہ ایک لمحے کے لیے خوف زدہ سی ہو گئی۔

”کسی کو اتنا مجبور مت کرو کہ وہ تم سے نفرت کرنے پر مجبور ہو جائے۔“ ایڈم نے کہتے ہوئے اسے زور سے جھٹکا دے کر پیچھے کیا۔ فارینہ لڑکھڑا کر سنبھل گئی۔ اسی وقت لوگوں کے ہجوم کو چیرتے ہوئے شہرام اور مرتضیٰ ہاشم اس تک پہنچے۔ فارینہ انہیں دیکھتے ہی چیخیں مارتے ہوئے باپ سے لپٹ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ ایڈم وہاں سے جا چکا تھا۔ بہت سے پولیس کے سپاہی بھی اندر آ گئے۔

فارینہ کی حالت اتنی خراب تھی کہ وہ کچھ نہیں بول پا رہی تھی۔ باپ کے سینے سے لگی وہ وہاں سے باہر آئی۔ کسی نے اس کے اوپر چادر بھی دی تھی مگر فارینہ کو کوئی ہوش نہیں تھا۔

”انکل آپ فارینہ کو لے کر گھر جائیں۔ باقی کا معاملہ میں خود ہینڈل کر لوں گا۔“ شہرام نے ان کے پاس آ کر کہا، تو مرتضیٰ ہاشم سر ہلاتے ہوئے کار کی طرف بڑھ گئے۔ فارینہ کو پچھلی سیٹ پر بیٹھا کر وہ اپنے قریبی دوست کی طرف متوجہ ہوئے جو پولیس میں اعلیٰ عہدے پر فائز تھا۔

”یار تم مجھے شرمندہ کر رہے ہو۔ فارینہ میری بھی بیٹی جیسی ہی ہے۔ شکر کرو کہ وہ اتنی جلد بازیاب ہو گئی۔ اس لڑکے ایڈم کی بروقت اطلاع کی وجہ سے۔ خیر تم فکر مت کرو۔ میں اس معاملے کی تہ تک پہنچوں گا اور اصل ملزموں کو کیفرِ کردار تک پہنچا کر ہی دم لوں گا۔“

ڈی ایس پی گلزار ملک نے کہا، تو وہ اس کا شکریہ ادا کرتے ہوئے، گھر کی طرف روانہ ہو گئے۔ فارینہ کے گھر پہنچنے تک، فیملی ڈاکٹر بھی پہنچ گئے تھے۔ فارینہ کی حالت کی پیش نظر اسے نیند کا انجکشن لگا دیا گیا۔

”ان کا آرام کرنا بہت ضروری ہے۔ زیادہ مینٹل اسٹریس ان کا زروس بریک ڈائون ہونے کی وجہ بھی بن سکتا ہے۔“

ڈاکٹر نے سختی سے ہدایت کی تھی کہ فارینہ سے اس واقعے کے بارے میں فی الحال کوئی بات نہ کی جائے۔ اس کی ذہنی حالت ابھی ایسی نہیں ہے کہ وہ زیادہ بوجھ برداشت کر سکے۔ مرتضیٰ ہاشم سب کچھ بھول بھال کر بیٹی کے سرہانے سے لگ کر بیٹھ گئے۔ فارینہ اس طوطے کی طرح تھی جس میں جادوگر کی جان ہوتی ہے۔ فارینہ کے اغوا کا یہ ایک ہفتہ قیامت بن کر ان پر گزرا تھا۔ دن رات ایک کرنے کے باوجود وہ اس کا کوئی سراغ نہیں پاسکے تھے۔ فارینہ کے فون ریکارڈ سے ایک نمبر سے بار بار آنے والی کالز نے پولیس کے ساتھ ساتھ، انہیں بھی حیرت میں ڈال دیا تھا کہ یہ نمبر نہ اس کی فرینڈ لسٹ میں تھا اور نہ کسی جاننے والے کا۔ پھر کون اسے بار بار فون کر کے تنگ کرتا تھا۔ اس نمبر کا ایڈریس بھی علاقہ غیر کا تھا۔ پھر فارینہ کی ایک قریبی دوست نشاء نے بتایا کہ پچھلے کچھ عرصے سے اسے مسلسل ایک نمبر سے خطرناک نتائج کی دھمکیاں بھی مل رہی تھیں مگر اصل معاملہ کیا تھا وہ اسے بھی ٹھیک سے نہیں پتا تھا اور نہ فارینہ نے کبھی تفصیل سے کچھ بتایا تھا

یہ بھی اگر اس کے سامنے ، اس دن اتفاق سے اس بلیک میلر کا فون نہ آتا تو نشاء کو اتنا بھی پتا نہ چلتا۔

مرتضیٰ ہاشم یہ بات جان کر شکد رہ گئے تھے۔، خود کو بار بار ملامت کرتے کہ فارینہ کو آزادی دے کر اس کی طرف سے آنکھیں کیوں بند کر لیں تھیں۔ فارینہ جتنی ضدی اور خود سر تھی ، اس کا اندازہ انہیں تھا۔ وہ ہر بات اور مسئلے کو چٹکیوں میں اڑانے والی تھی اور شاید اسی بات کا خمیازہ اس نے ، اپنے اغوا کی صورت میں بھگتا تھا۔ فارینہ کے اغوا کی خبر اخباروں میں آتے آتے رک گئی تھی۔ نہیں تو یہ اخباروں کی فرنٹ نیوز بنتی۔ آخر وہ ایک مشہور ماڈل اور ایکٹریس ہونے کے ساتھ ساتھ ملک کے مشہور بزنس مین کی بیٹی بھی تھی۔ اس کے لیے مرتضیٰ ہاشم نے روپیہ ، پیسہ پانی کی طرح بہا دیا تھا۔ کچھ شہرام اور ایڈم کے تعلقات بھی اس اہم موقع پر کام آئے تھے۔

مرتضیٰ ہاشم کو پہلے ندامت اور پھر پچھتاوا ہونے لگا تھا کہ انہیں فارینہ کی سکیورٹی کا پورا پورا بندوبست رکھنا چاہیے تھا۔ تاکہ ایسے حادثے کی نوبت ہی پیش نہ آتی، مگر اب کیا ہو سکتا تھا۔ سوائے اس کے کہ وہ آئندہ کے لیے محتاط ہو جاتے۔ فارینہ کو سنبھلتے سنبھلتے کئی دن لگے۔ اس کا بیان بھی ریکارڈ کیا گیا۔ جس میں ایسی کوئی کام کی

بات نہیں تھی۔ فارینہ نے کسی سے بھی ملنے سے صاف انکار کر دیا تھا۔ وہ شہرام کی کوئی فون کال اٹینڈ نہیں کرتی تھی اور نہ اس سے ملتی تھی۔ بس اپنے گھر اور کمرے تک محدود ہو کر رہ گئی تھی۔ فارینہ کو بعد میں باپ کی زبانی پتا چلا تھا کہ ”فارینہ کو جس جگہ رکھا گیا اس کے ساتھ ہی فقیروں کی ایک کچی بستی بھی تھی۔ یہ لوگ علاقے کے ہر گھر سے واقف تھے اور اس گھر کے مکینوں کی مشکوک حرکتیں پہلے ہی سب کی نظروں میں تھیں۔ فقیروں میں سے ایک شخص ، ایڈم کا واقف کار تھا۔ جن خفیہ ذرائع سے ہم تینوں ، پولیس کے ساتھ مل کر تمہاری تلاش کر رہے تھے ، ان میں سے ہی کسی نے ایڈم تک یہ اطلاع پہنچائی کہ اس گھر میں ایک لڑکی کچھ دن پہلے لائی گئی تھی۔ یہ اطلاع ملتے ہی ، ایڈم اپنے ان خیر خواہ دوستوں اور بستی کے لوگوں کے ساتھ ، اس مکان کی تلاشی لینے پہنچ گیا۔ وہاں صرف ایک شخص نگرانی پر مامور تھا جو اتنے لوگوں کو دیکھ کر گھبرا گیا۔ اس سے پہلے کہ وہ بھاگتا ، لوگوں نے اسے پکڑ کر مارا پیٹا ، تو اس نے سب اگل دیا کہ کچھ دن پہلے اس کے صاحب لوگ ایک لڑکی کو یہاں بند کر گئے تھے۔ اس کا کام صرف کھانا دینا اور رکھوالی کرنا تھا۔ اس دن اگر ایڈم تمہیں بچانے نہ آتا، تو اگلے دن ، اس شخص کے کہنے کے مطابق ، تمہیں وہاں سے آگے منتقل کر دیا جانا تھا، جہاں

سے تمہارا بچ کر آنا تقریباً ناممکن ہوتا۔ ایڈم نے ہمیں بھی اطلاع کر دی تھی۔ ہم جب تک پولیس کے ساتھ وہاں پہنچے تمہیں بازیاب کروا لیا گیا تھا۔“

فارینہ باپ کی زبانی یہ سب سن کر کچھ دیر کے لیے ہی سہی ندامت کا شکار ہوئی۔ اسے لگا تھا کہ اس نے ایڈم کے ساتھ زیادتی کی ہے مگر پھر اس پر منفی سوچوں کا غلبہ طاری ہو جاتا اور وہ نفرت سے سر جھٹکتی سوچتی کہ یہ سب بھی اس کی چال ہو گی۔ اسے بدنام کرنے کی، اس کے سامنے اچھا بننے کی، اسے حاصل کرنے کی۔ مگر وہ نہیں جانتا کہ اس زندگی میں تو میں اسے کبھی نہیں مل سکتی۔ وہ ساری زندگی محروم ہی رہا ہے اور رہے گا۔“

فارینہ انہی سوچوں میں الجھی جلتی کڑھتی رہتی تھی۔ مرتضیٰ ہاشم نے اسے بہت بار ملک سے باہر جانے اور کچھ عرصہ وہاں ریٹ کرنے کا کہا تھا مگر وہ نہیں مانی اور نارمل ہوتے ہی دوبارہ تیزی سے روزمرہ کی روٹین میں مصروف ہو گئی۔ شہرام سے اس کے تعلقات سرد مہری کا شکار ہو چکے تھے۔ شہرام کو لگتا تھا کہ فارینہ اس سے کئی کترا رہی ہے، جبکہ فارینہ کو لگتا تھا کہ شہرام اس کے ساتھ ہوئے حادثے کی وجہ سے بہت بدل گیا ہے۔ دونوں اسی غلط فہمی کا شکار ہوتے ہوتے ایک دوسرے سے دور ہوتے گئے۔ ان دنوں شہرام نے کچھ نئے پروجیکٹ شروع کر دیے تھے۔

ایڈم فارینہ کے ساتھ ہونے والے واقعے کے بعد کہیں نظر نہیں آیا۔ اس کا بھی زیادہ تر وقت امریکا میں گزر رہا تھا۔ اس نے شہرام کو بہت جلد یہاں سے واپس چلے جانے کا عندیہ سنا دیا۔ زندگی اپنے معمول پر آچکی تھی فارینہ کے کیس پر مزید پیش و رفت نہیں ہوئی تھی۔ یہ اس واقعہ کے ٹھیک دو مہینے بعد کی بات ہے، جب فارینہ نشاء کے بہت اصرار کرنے پر ان کے مشترکہ دوست کی پارٹی میں شہر سے دور فارم ہاؤس پر گئی۔ فارینہ کے ساتھ ہمہ وقت گارڈز موجود ہوتے تھے، اس لیے مرتضیٰ ہاشم اب مطمئن تھے۔ فارینہ پارٹی کی موج مستی اور رنگ میں پوری طرح کھوئی ہوئی تھی۔ ویٹر نے اسے اس کا پسندیدہ مشروب پیش کیا۔ نشاء اپنے بوائے فرینڈ کے ساتھ ڈانس فلور پر بانہوں میں بانہیں ڈالے رقص کر رہی تھی۔ فارینہ اسے دیکھنے میں مگن تھی جب کسی نے اس کے پاس آکر ہیلو کہا۔ فارینہ نے گردن موڑ کر دیکھا فیصل آفندی ہاتھ میں گلاس پکڑے، مسکراتے ہوئے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

”تم!“ فارینہ نے ناگواری سے اسے دیکھا۔ کچھ عرصہ پہلے اس نے، نیو وژن پروڈکشن ہاؤس کے ساتھ کام کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ یہ وہی فیصل آفندی تھا جس کے ساتھ کام کرنے سے ایڈم نے شہرام کے ذریعے فارینہ کو منع کیا تھا اور

ضد میں فارینہ نے کام کرنے کی حامی بھر لی تھی مگر جب اس نے اسکرپٹ پڑھا اور اسے بتایا گیا کہ اسے کافی بولڈ کام کرنا پڑے گا، تو فارینہ نے سختی سے منع کر دیا، مگر ان کے بار بار اصرار کرنے پر فارینہ نے یہ معاہدہ ہی توڑ دیا اور ایڈوانس کی رقم انہیں واپس کر دی جس پر اسے فیصل آفندی کا سخت رد عمل دیکھنا پڑا تھا اور اس کے بعد ہی اسے ایک نمبر سے دھمکی آمیز فون کالز ملنے لگی تھیں جسے اس نے کبھی خاطر میں نہیں لیا تھا۔ اب فیصل آفندی کو یہاں دیکھ کر، اس کا چہرہ تن گیا۔

”ہم تو آپ کے پرستاروں میں شامل ہیں مگر نہ جانے آپ ہی کیوں ہم سے دور دور رہتی ہیں۔“

فیصل آفندی کی نظریں سر سے پاؤں تک اس کا جائزہ لے رہی تھیں۔ فارینہ نے ناگواری کی شدید لہر اٹھتی محسوس کی اور منہ ہی منہ میں بڑبڑاتی وہاں سے آگے بڑھی۔ جب اچانک فیصل تیزی سے آگے بڑھا اور فارینہ کے ہاتھ میں پکڑا جو اس کے کپڑوں پر گر گیا۔

”او۔ آئی ایم ریلی سوری!“ فیصل نے فوراً معذرت کی اور وہاں سے چلا گیا۔ فارینہ اسے دل ہی دل میں کوستی رہ گئی۔ اسی وقت نشاء بھی اس کے پاس چلی آئی۔

”او ہو فارینہ! تمہارا سارا، ڈریس خراب ہو گیا ہے۔ آئی تھک، تم ڈریس تبدیل کر لو۔ میں اریخ اریخ کرواتی ہوں۔“ نشاء نے کہا اور اپنی ایک دوست سے بات کرنے کے لیے مڑنے لگی جب فارینہ نے اسے روکا۔

”اس کی ضرورت نہیں ہے! میں اسے واش کر کے آتی ہوں۔“

فارینہ نے کہا تو نشاء سر ہلاتی اسے گیٹ روم کی طرف لے آئی جو اس شور ہنگامے سے ذرا ہٹ کر تھا۔ ایک کمرے کا دروازہ کھول کر نشاء بولی۔

”تم آرام سے فارغ ہو کر آ جانا اور اگر کسی چیز کی ضرورت ہو تو مجھے موبائل سے کال کر دینا، میں آ جاؤں گی۔“

نشاء نے اسے کمرے میں چھوڑا اور دروازہ بند کرتی چلی گئی۔ فارینہ سر ہلاتی واش روم کی طرف بڑھ گئی۔ کچھ دیر بعد وہ واش روم سے باہر نکلی تو بری طرح چونک گئی۔ بیڈ پر فیصل آفندی لیٹا ہوا، سیٹی بجا رہا تھا۔

”تم اور یہاں؟ تمہاری جرأت کیسے ہوئی، اس طرح کمرے میں آنے کی! میں ابھی سکیورٹی کو کال کرتی ہوں۔“

فارینہ غصے سے کہتی ہوئے فون کی طرف بڑھی۔

”ایک منٹ ڈارلنگ! کسی کو بھی بلانے سے پہلے، کچھ دیکھ تو لو... پھر نہ کہنا کہ میں نے بتایا نہیں تھا۔“

فیصل نے خباثت سے کہتے ہوئے ہاتھ میں پکڑے موبائل کی اسکرین روشن کی تھی۔ فارینہ غصے سے چلتی پاس آئی اور جیسے ہی اس کی موبائل اسکرین پر نظر پڑی، اسے ایسا لگا جیسے زمین و آسمان اس پر آگرے ہیں۔ فیصل نے موقع کا فائدہ اٹھاتے ہوئے نہ جانے کس طرح، اس کی کچھ تصاویر کھینچ لی تھیں، جب وہ واش روم میں گئی تھی۔ فارینہ کا رنگ فق ہو گیا۔ جب کہ فیصل اس کی حالت دیکھ کر اب قہقہے لگا رہا تھا۔

”تمہیں کیا لگا تھا کہ تم ہر بار مجھ سے بچ جاؤ گی۔“ فیصل اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے، اس کے پاس آیا تھا۔ فارینہ پتھر کے بت کی طرح کھڑی تھی۔ فیصل اس کے گر د چکر لگاتے ہوئے، اپنی جیت کے نشے میں کہہ رہا تھا۔

”تم نے میرے ساتھ کام کرنے سے منع کرتے ہوئے، میری رقم منہ پر ماری تھی۔ تمہیں کیا لگتا تھا کہ میں اتنی آسانی سے تمہارا پیچھا چھوڑ دیتا۔ جب کہ میں تمہاری وجہ سے دوسری کمپنی سے بات کر چکا تھا اور وہ اسی شرط پر مانے تھے کہ اگر تم اس فلم میں کام کرو گی تو ہی وہ اشتراک کریں گے مگر تم نے معاہدہ کر کے

توڑ دیا۔ تمہاری وجہ سے میرے ہاتھ سے اتنا مہنگا پروجیکٹ نکل گیا اور جو نقصان مجھے اٹھانا پڑا، وہ الگ تھا۔ پھر میں نے بھی دل میں ٹھان لی کہ تمہیں بھی چین سے نہیں رہنے دوں گا اور اسی لیے میرے خریدے گئے آدمی تمہیں فون پر دھمکاتے رہے مگر تم بے وقوف لڑکی، کچھ سمجھ ہی نہیں سکی اور چلی تھیں شہرام سے شادی کرنے۔“

فیصل نے حقارت سے کہا۔ فارینہ کی آنکھوں کے سامنے سے آج سارے پردے ہٹ گئی تھے۔

”میں نے شہرام کی گاڑی کا ایکسیڈنٹ کروایا، مگر اس کی قسمت کے وہ بچ گیا۔ اگر مر جاتا، تو مجھے دہری کامیابی ملتی مگر اس کی قسمت نے ساتھ دیا۔ البتہ اس حادثے سے یہ ہوا کہ تمہاری شادی ملتوی ہو گئی۔ پھر میں نے ایک بڑا منصوبہ بنایا، تمہارے حسن کو ایکسپوز کر کے پیسہ حاصل کرنے کا۔ اس کے لیے تمہیں بہت چالاکی سے اغوا کروایا مگر تمہارے امیر باپ اور دونوں عاشقوں نے ساری پولیس کو ہائی الرٹ کر دیا تھا۔ مجبوراً تمہیں کچھ دنوں کے لیے اس گندی بستی میں چھپا کر رکھنا پڑا اور اگر ایک دن اور گزر جاتا، تو اگلے دن ایک پرائیویٹ جہاز کے ذریعے تمہیں دبئی کی ایک پارٹی تک پہنچا بھی دینا تھا مگر اس سالے فرنگی کی اولاد، ایڈم نے آکر

سارا کام خراب کر دیا۔ مجبوراً مجھے خاموشی سے پیچھے ہٹنا پڑا کیوں کہ پولیس تمہارے اغوا کے کیس کو لے کر بہت تیزی سے کام کر رہی تھی مگر آج تمہاری بد قسمتی اور میری خوش نصیبی نے مجھے بالآخر یہ موقع فراہم کر ہی دیا۔ میرے ہاتھوں میں تمہاری ڈور آگئی ہے۔ اب تم کھ پتلی کی طرح میرے اشاروں پر ناچو گی۔ نہیں تو سوچو تمہاری یہ تصاویر اگر سب کے سامنے آگئیں۔ تمہارے باپ نے شرم اور غیرت کی مارے ہی خود کشی کر لینی ہے۔

”کیا چاہتے ہو تم؟“ فارینہ کو اپنی آواز گہری کھائی سے آتی محسوس ہوئی۔
”یہ کی نا تم نے عقل مندوں والی بات۔“ فیصل کی آنکھوں میں شیطانی چمک ابھری تھی۔

”باقی تو میں تمہیں سب کچھ بعد میں سمجھائوں گا۔ آخر ابھی ہمارا تعلق بہت دور تک جانا ہے... مگر“

فیصل نے اس کے بہت پاس آتے ہوئے کہا۔

”آج کی رات تم میرے ساتھ گزارو۔ اس فارم ہاؤس میں۔“

فیصل نے مخمور لہجے میں کہتے ہوئے اس کے گال کو انگلی سے چھوا۔ فارینہ بدک کر فوراً پیچھے ہٹی۔

”یہ نہیں ہو سکتا۔“ فارینہ غصے سے بولی۔

”سوچ لو! اگر میری بات نہیں مانو گی تو تمہارے حسن کے جلوے ہر طرف ہوں گے۔ ویسے سچ میں تم سر سے پاؤں تک قیامت ہو۔“

فیصل نے اسے آنکھ مارتے ہوئے کہا۔ فارینہ کو اس کے مکروہ چہرے سے شدید گھن آرہی تھی۔ اسی وقت فیصل نے ہاتھ بڑھا کر اسے اپنے بازوؤں میں جکڑ لیا۔ فارینہ خود کو چھڑانے کے لیے زور لگانے لگی۔ اسی وقت ایک بجلی سی کوندی، فیصل کے منہ پر ایک زور دار مکا پڑا اور وہ الٹ کر پیچھے کی طرف جاگرا۔ اس کے منہ اور ناک سے خون بہ نکلا تھا۔ فارینہ نے اپنی چیخ کو روکتے ہوئے منہ پر ہاتھ رکھ لیا اور ایڈم کو فیصل پر وحشیانہ تشدد کرتے ہوئے دیکھنے لگی۔ وہ اسے مار رہا تھا۔ ہاتھوں سے ، پاؤں سے ، فیصل بچنے کی کوشش میں زمین پر لڑھک رہا تھا، مگر ایڈم پر کوئی جنون سوار تھا۔

”اس انگلی سے تم نے، اس کے گال کو چھوا تھا نا۔“ ایڈم نے جنونی انداز میں کہتے ہوئے اس کی انگلی توڑ دی۔ فیصل کے منہ سے درد ناک چیخ نکلی تھی۔

”یہ ہاتھ اٹھے تھے ، اس کی پاک دامنی کی طرف۔“ ایڈم نے اس کے دونوں ہاتھوں پر ضربیں ماریں۔ فیصل چیختے ہوئے اس سے معافی مانگ رہا تھا مگر وہ کچھ نہیں سن رہا تھا۔

”ان آنکھوں سے تو نے اسے بے پردہ دیکھا تھا نا۔“

ایڈم نے میز پر رکھا کر سٹل کا گلہ ان زور سے اپنے ہاتھ پر مارا اور اس کے نوکیلے سرے اس کی دونوں آنکھوں میں کھبو دیے۔ خود اس کے ہاتھ سے بھی خون بہ رہا تھا مگر اس پر ایک جنون سوار تھا۔

اسی وقت ، نشاء نے کمرے کا دروازہ کھولا اور اندر کا منظر دیکھ کر چیختے لگی۔ وہ اتنی دیر تک ، فارینہ کے واپس نہ آنے پر اسے بلانے کے لیے یہاں آئی تو اس کے ہوش اڑ گئے۔ وہ فوراً واپس بھاگی اور سیکیورٹی کو آوازیں دینے لگی۔ کچھ دیر میں وہاں لوگوں کا ہجوم جمع ہو گیا تھا۔ فارینہ کی سیکیورٹی پر مامور لوگ بھی بھاگے آئے۔ سب صورت حال کو سمجھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ فارینہ ڈری سبھی ایک کونے میں کھڑی تھی اور ایڈم سے مار کھا کھا کر فیصل بے حال ہو چکا تھا۔ ایڈم نے اس کی وہ انگلی ہی توڑ دی تھی جس سے اس نے فارینہ کے گال کو چھوا تھا، فارینہ اس کا جنوں دیکھ رہی تھی، اسے بہت سال پہلے کا ایک واقعہ یاد آرہا تھا۔ تب بھی کسی

نے اسی طرح، اپنے سامنے والے کو پیٹا تھا اور اس دن بھی وجہ فارینہ ہی بنی تھی۔ فارینہ گم صم کھڑی تھی۔ اس سے لوگ سوال پوچھ رہے تھے مگر اسے کچھ سمجھ نہیں آرہی تھی۔ بہ مشکل ایڈم کو کئی لوگوں نے پکڑ کر فیصل سے الگ کیا۔ نہیں تو آج وہ اس کی جان ہی لے لیتا۔ کسی نے پولیس کو اطلاع بھی کر دی تھی۔ پولیس نے آتے ہی ایڈم کو حراست میں لیا، فیصل کی حالت بہت خراب تھی۔ اسے فوراً ایمبولینس کے ذریعے ہسپتال پہنچایا گیا۔ پولیس فارینہ اور نشاء کو بھی چشم دید گواہ کے طور پر ساتھ لے گئی۔

پولیس اسٹیشن میں ان کے پہنچنے تک ، مرتضیٰ ہاشم اور شہرام بھی پہنچ چکے تھے۔ مرتضیٰ ہاشم کے سیکیورٹی آفیسر نے اسے فون کر کے سارے واقعے کی اطلاع دی تھی۔ وہ فوراً شہرام کو لے کر وہاں پہنچے۔ ایڈم کا بیان ریکارڈ کیا جا رہا تھا۔ وہاں فارینہ اور نشاء بھی تھیں۔

ایڈم نے ایک چھوٹا سا وائس ریکارڈ نکال کر میز پر رکھا اور اسے آن کر دیا۔ فیصل کی آواز میں اعترافِ جرم تھا۔ جو وہ فارینہ سے کہہ رہا تھا۔ فارینہ کا رنگ اڑ گیا۔ اس کی عزت سب کے سامنے مٹی میں ملنے والی تھی۔ کبھی ایسے ہی اس نے سب کے سامنے ایڈم کو ذلیل کیا تھا۔ تھپڑ مارا تھا، ناخنوں سے اسے زخمی کر دیا تھا اور

آج اس کی باری تھی۔ آج بازی ایڈم کے ہاتھ میں تھی جس کے سامنے وہ ایسے عیاں ہوئی تھی کہ نظریں ملانے کے قابل بھی نہیں رہی تھی۔ اب باپ اور شہرام کے سامنے بھی اس کی عزت دو کوڑی کی ہونے والی تھی۔

”کاش یہ زمین پھٹے اور میں اس میں سما جاؤں۔“

فارینہ نے آنکھیں بند کرتے ہوئے دل میں دعا کی۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ قیامت کا لمحہ قریب تھا، مگر اسی وقت آواز آنا رک گئی۔ فارینہ نے چونک کر سر اٹھایا۔ فیصل کے اعترافِ جرم کے علاوہ اور کچھ نہیں تھا اس وائس ریکارڈنگ میں۔ فارینہ نے حیرت سے ایڈم کی طرف دیکھا جو بے نیازی سے کھڑا، پولیس کی باقی کارروائی دیکھ رہا تھا۔

”فیصل کے ساتھ میرے ذاتی اختلافات تھے۔ اسی لیے ہم دونوں ایک دوسرے کی تاک میں لگے رہتے تھے اور قسمت سے میرے ہاتھ یہ ثبوت لگ گیا۔ اسی لیے ہم میں ہاتھ پائی ہوئی تھی۔“

ایڈم نے فوراً اگلی بات کر دی۔ فارینہ چونکی۔ اس نے فیصل کے گھنائونے فعل کے بارے میں کوئی ذکر نہیں کیا اور سارا الزام اپنے سر لے لیا تھا۔ پولیس نے فارینہ اور نشاء کا بیان بھی لیا۔ مرتضیٰ ہاشم اور شہرام کا خون کھول اٹھا تھا۔

”اس کی اتنی جرأت، میری بیٹی پر بری نگاہ رکھنے کی۔ میں اسے چھوڑوں گا نہیں۔“

مرتضیٰ ہاشم نے غصے سے بے قابو ہوتے ہوئے کہا۔

”اب وہ آپ کی بیٹی تو کیا، کسی پر بھی بری نگاہ نہیں رکھ سکے گا۔ اس شخص نے اسے مار مار کر اندھا کر دیا ہے۔“

پولیس والے نے رپورٹ لکھتے ہوئے کہا۔ ایڈم ایسے کھڑا سن رہا تھا جیسے اسے ان سب سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔

”تم لوگوں نے اچھی طرح دیکھ لیا تھا نا۔ فیصل کا موبائل ہر حال میں ملنا چاہیے۔ بہت کچھ مزید ہاتھ لگ سکتا ہے۔“

انسپکٹر نے اپنے سپاہیوں سے دوبارہ پوچھا تھا۔

”سر ہم نے کمرے کا کونہ کونہ چھان مارا ہے مگر وہاں سے کچھ نہیں ملا۔“

سپاہی نے کہا تو انسپکٹر سر ہلا کر رہ گیا۔ فارینہ کی نظریں ایڈم پر مرکوز تھیں جو سر جھکا کر کھڑا تھا۔

”آپ اپنی بیٹی اور ان کی دوست کو لے جاسکتے ہیں۔! ہمیں دوبارہ ضرورت پڑی، تو آپ سے رابطہ کر لیں گے۔“ انسپکٹر نے مرتضیٰ ہاشم سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔

”اور ایڈم!“ انہوں نے فوراً پوچھا تھا۔

”یہ ابھی نہیں جا سکتا۔ اس نے بہت بری طرح سے مارپیٹ کی ہے۔ اسے چھوڑنا آسان نہیں ہے۔“

انسپکٹر نے کہا تو مرتضیٰ ہاشم نے کہا۔

”مگر میں اسے یہاں سے لیے بغیر نہیں جاؤں گا۔ اب یہ کیسے ہو گا، یہ آپ کو سوچنا ہے۔“

ان کا قطعی انداز دیکھ کر انسپکٹر شش و پنج میں پڑ گیا۔

”مگر سر! میرے لیے مسئلہ پیدا ہو جائے گا۔“

انسپکٹر نے پریشانی سے کہا۔

”اگر ایڈم بھی زخمی ہو کر ہسپتال میں رات گزار لے تو پھر۔ کل صبح ہوتے ہی ہم اس کی ضمانت کروالیں گے۔“

شہرام نے آگے ہو کر کہا، تو انسپکٹر نے سوچتے ہوئے اثبات میں سر ہلا دیا۔ ایڈم کا بازو شدید زخمی تو تھا ہی اور اس کی مرہم پٹی ہونا بھی ضروری تھی۔

”ٹھیک ہے۔ میں اتنا تعاون کرنے پر تیار ہوں مگر پلیز صبح ہوتے ہی قانونی کارروائی کر لیجیے گا۔ نہیں تو میرے لیے مسئلہ بن جائے گا۔“ انسپکٹر نے یاد دہانی کروائی۔ وہ سب وہاں سے نکلے۔ فارینہ اور نشاء مرتضیٰ ہاشم کے ساتھ کار میں بیٹھ گئیں۔ جب

کہ شہرام ایڈم کو سہارا دیے اپنی کار کی طرف بڑھ گیا۔ اس کے بازو سے بہت خون بہ چکا تھا۔ ایڈم نے فرنٹ سیٹ پر بیٹھتے ہی، سیٹ سے ٹیک لگا کر آنکھیں موند لیں۔ اس کے چہرے پر تھکن اور تکلیف کے آثار واضح تھے۔ فارینہ نے اپنی آنکھوں میں نم پھیلتا محسوس کیا تھا۔ آج پہلی بار وہ اس شخص کے لیے روئی تھی جس سے ہمیشہ اس نے شدید نفرت کی تھی اور یہ تب کی بات ہے جب وہ بارہ سال کی بچی تھی۔

اور اس وقت کا وہ تیرہ سال کا آدم آج کا ایڈم تھا۔

☆...☆...☆

”آدم! آج تمہاری سالگرہ ہے نا؟“

ساری کلاس بریک میں باہر گئی تھی، مگر وہ اپنی کلاس ہی میں موجود تھا۔ آج بھی اسے لنچ میں سب کا بچا ہوا ناشتا نصیب ہوا تھا جو اس نے خاموشی سے اپنے پرانے لنچ باکس میں رکھ لیا تھا۔ کیوں کہ روز کی طرح آج بھی اپنے ناشتے کے انتظار میں وہ لیٹ ہو چکا تھا۔ ابا اسی اسکول میں چہر اسی تھا۔ خدا بخش کے باقی چار بچے سرکاری اسکول میں پڑھتے تھے۔ آدم کو وہ اس انگلش میڈیم اسکول میں اس لیے لے کر آیا تھا کیوں کہ سرکاری اسکول میں اسے داخلہ دینے سے منع کر دیا گیا تھا۔ جب کہ

جس اسکول میں خدا بخش کام کرتا تھا، اس میں بہت سے عیسائی کمیونٹی کے بچے اور اساتذہ بھی شامل تھے۔ اس لیے اس ادارے کا ماحول ملا جلا اور کچھ آزاد قسم کا تھا۔ کچھ خدا بخش نے، سفارش کے لیے بہت سی ٹیچرز کی منتیں بھی کی تھیں جو خدا ترسی اور دوسروں کی مدد کرنے میں مشہور تھیں۔ ان میں ایک مسز مارتھا بھی تھیں جو خدا بخش کو اس کی ایمان داری اور اچھی فطرت کی وجہ سے بہت پسند کرتی تھیں اور آدم کو اس اسکول میں داخلہ دلانے میں ان کا خاص کردار تھا۔

آدم یہاں آکر پہلے تو بہت خوش ہوا تھا۔ ابا کے دوسرے بچوں سے اس کی جان چاہے کچھ دیر کے لیے ہی سہی مگر چھوٹ گئی تھی۔ یہاں اس نے کچھ دوست بنانے کی کوشش کی جو پہلے پہل تو کامیاب ہوئی، پھر اس کے بارے میں سچ جانتے ہی سب پیچھے ہٹ جاتے۔ یہ سچ بھی اس کے چال چلن سے زیادہ، ابا کی بیوی کلثوم نے سب کو بتا یا تھا۔ وہ اتنے بڑے اسکول میں اس کا پڑھنا برداشت نہیں کر سکی۔ اس لیے ایک دن اسکول فنکشن پر ضد کر کے اپنے بچوں کے ساتھ آئی اور جاتے جاتے وہ لوگ اس کی راہ میں کانٹے بچھا گئے۔ یہ بات بہت تیزی سے سارے اسکول میں پھیلی۔ سب آدم سے دور دور بھاگتے اور جہاں جہاں سے وہ گزرتا، وہ اس کی طرف ایسے دیکھتے جیسے وہ کوئی عجوبہ ہو۔ آدم یہ صورت حال دیکھ کر سب سے الگ

تھلگ رہنے لگا۔ کلاس میں سب سے آخری قطار میں بیٹھتا اور بریک ٹائم میں بھی کلاس سے باہر نہیں نکلتا تھا۔

انہی دنوں ان کی کلاس میں ایک نئی لڑکی کا داخلہ ہوا۔ جو بہت زیادہ شرارتی اور نک چڑھی تھی۔ کلاس میں اس کی بہت کم لوگوں سے بنتی تھی۔ سنا تھا کہ بہت امیر باپ کی انتہائی لاڈلی بیٹی ہے جس کا باپ اس اسکول کی ٹرسٹی میں بھی شامل تھا۔ اس کے سب دوست بھی اس کی طرح اونچے گھرانوں کے چشم و چراغ تھے۔ ایک دن کلاس کی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے، وہ بہ مشکل اپنا بھاری بیگ اٹھا کر آرہی تھی، جب آدم نے اسے مدد کی آفر کی۔ تب وہ لڑکی آدم کے بارے میں کچھ نہیں جانتی تھی۔ اس دن گرمی بھی بہت تھی۔ اس لڑکی نے اپنا بیگ آدم کو پکڑا دیا جو بہت مشکل سے اپنا اور اس کا بیگ اٹھا کر کلاس روم تک پہنچا۔ اس دن پہلی بار اس لڑکی نے کسی سے مسکرا کر بات کی اور اس کا شکریہ ادا کیا۔ کچھ دن ان کے درمیان دوستی چلی پھر وہ بھی بہت سی نظروں میں چھپنے لگی۔ اس کے دوستوں نے کچھ اس طرح آدم کے بارے میں اس کی برین واشنگ کی کہ وہ آدم کو دیکھتے ہی اس سے بدکنے لگیا اور یہاں تک کہ آدم کی موجودگی سے بھی اسے سخت چڑھنے لگی۔ وہ نازک مزاج، شہزادیوں کی طرح پلی بڑھی لڑکی، اپنے آس پاس بھی ہر چیز بہترین

سے بہترین چاہتی تھی۔ اس کے سب دوست، اسی کی طرح مکمل اور بہترین تھے۔ جب کہ آدم اپنے ادھورے وجود کا بوجھ لیے، نہ صرف اپنے لیے بلکہ معاشرے میں بھی بوجھ تھا۔ آدم سے اس کی چڑ بڑھتے بڑھتے نفرت میں بدل گئی۔ اب وہ اپنے دوستوں کے ساتھ مل کر ہر طرح سے اسے تکلیف اور اذیت پہنچانا اپنا فرض سمجھتی تھی۔ آدم کے لیے اس کی لہجے میں اتنی حقارت اور نفرت ہوتی تھی کہ آدم خود گھبرا جاتا تھا۔

مگر یہ بھی سچ تھا کہ پریوں جیسی وہ لڑکی اسے پہلی نظر ہی میں بہت اچھی لگی تھی۔ اسی لیے آدم نے اسے پہلے دن اس کا بیگ اٹھانے کی پیش کش کی تھی۔ وہ اپنا بیگ بھی مشکل سے اٹھا پاتا تھا۔ اس نے خواہش کی تھی کہ ”کاش وہ اس سے دوستی کر لے۔“ اس کی یہ خواہش پوری ضرور ہوئی مگر بہت تھوڑے وقت کے لیے۔

آج اس کی سالگرہ تھی۔ یہ وہ دن تھا جو اس کے لیے تو کیا، اسے مرنے کے لیے چھوڑ دینے والے والدین کے لیے بھی قابلِ شرم تھا، مگر خدا بخش نہ جانے کس مٹی کا بنا ہوا تھا۔ وہ اس کمزور جان سے اتنی محبت کرتا تھا جیسے یہ اس کی اپنی اولاد ہو اور یہ محبت بھی اس لمحے اس کے دل میں جاگی تھی جب خان زادہ شمشیر نے

نوزائیدہ بچے کو اس کی گود میں دیتے ہوئے، یہاں سے کہیں دور لے جانے کا حکم دیا تھا۔

”چاہے تو کسی یتیم خانے کے دروازے کے سامنے رکھ دینا یا کوڑے دان میں پھینک دینا۔ اگر اس کی قسمت میں جینا ہو گا تو یہ کسی آوارہ جانور کے نوکیلے دانتوں اور پنچوں سے بچ جائے گا۔“ ساتھ ہی انہوں نے نوٹوں کی ایک گڈی اسے دیتے ہوئے کہا تھا کہ دوبارہ پلٹ کر یہاں مت آنا۔ اسے وہاں کام کرتے ہوئے ایک سال ہی ہوا تھا۔ وہ اپنے کام سے کام رکھنے والا سیدھا سادھا بندہ تھا۔

خدا بخش حکم کی تعمیل کرنے وہاں سے نکلا تو تھا مگر کچھ دیر میں ہی اس ننھے وجود کی گرمی اور حرکت نے اسے اپنا ارادہ بدلنے پر مجبور کر دیا۔ وہ خود چار بچوں کا باپ تھا اور روزگار کے سلسلے میں در در کی ٹھوکریں کھاتا یہاں تک پہنچا تھا۔ اسے اپنے بچوں سے جنونی محبت تھی۔ اس کی بیوی کلثوم ایک سخت مزاج عورت تھی۔ وہ جتنی زبان کی کرخت تھی، اس کا دل بھی اتنا ہی سخت تھا۔ خدا بخش جب ایک بچے کو اپنی گود میں اٹھائے، چھپتا، چھپاتا اپنے شہر، اپنے گھر پہنچا، تو اس کی بیوی نے کہرام اٹھا دیا۔

”خدا بخش! کچھ عقل کر اگر کسی کو مفت کی کھلانے کا اتنا شوق ہو رہا تھا تو کم از کم یہ تو دیکھ لیتا کہ کل وہ تجھے کچھ دے بھی سکے گا یا نہیں۔ تو ایک بچہ، وہ بھی جو اپنے وجود میں ادھورا ہے، اس کی ذمہ داری اٹھانے چلا ہے۔ یہ جس کا گند ہے اسے ہی واپس دے آ نہیں تو اس کی نسل کے بہت لوگ ہر جگہ موجود ہوتے ہیں۔ انہیں سوئپ دے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ خوش ہو کر تجھے کچھ پیسے بھی دے دیں۔“

”خبردار دوبارہ اگر ایسی کوئی بات کی تو۔ دیکھ کلثوم میں نے ہمیشہ تیری مانی اور سنی ہے مگر اس بچے کی بار ہر گز نہیں اور اگر تُو نے کوئی ایسا ویسا قدم اٹھانے کا سوچا، تو میں اپنے چاروں بچوں کی قسم کھاتا ہوں، تجھے طلاق دے دوں گا اور تُو اچھی طرح جانتی ہے کہ میرے بچے میری کمزوری ہیں۔ میں ان کی جھوٹی قسم کبھی نہیں کھاؤں گا۔“

خدا بخش نے سختی سے کہا تو کلثوم دنگ رہ گئی۔ اس وقت تو وہ چپ کر گئی مگر اُس کے دل میں اس ننھے سے بچے کے خلاف پلٹی نفرت میں روز بہ روز اضافہ ہوتا گیا۔ خدا بخش نے اس بچے کے مختلف نام رکھے مگر ہر بار کلثوم اس کا مذاق اڑاتی، تضحیک کا نشانہ بناتی۔ تنگ آ کر خدا بخش نے اس کا نام آدم رکھ دیا۔

”نسل انسانی کی ابتدا حضرت آدم اور اماں حوا سے ہوئی تھی۔ اس کی اصل شناخت کیا ہے میں نہیں جانتا مگر اسی نسبت سے میں نے اس کا نام آدم رکھ دیا ہے جو بھی ہے، ہے تو اسی رب کی تخلیق نا۔

خدا بخش نے جو بات اپنی چھوٹی سوچ وہ سمجھ کے مطابق کہی تھی، وہ عقل رکھنے والے کے منہ پر طمانچہ تھا۔ آدم کو ایک چھت تو میسر ہو گئی مگر اس کی زندگی جانوروں سے بھی بدتر تھی۔ چھوٹا تھا تو بھوک کی شدت سے روتا رہتا، مگر کلثوم اسے کچھ بھی دینے کے بجائے، آتے جاتے مارنا نہیں بھولتی تھی۔ وہ خدا بخش کی بات کا زہر دل میں رکھتے ہوئے، انسان سے ناگن بن گئی تھی۔ اتنی زہریلی کہ خود اپنا وجود بھی نیلا پڑ گیا مگر اس ننھے سے بچے سے اس کی نفرت کم نہیں ہوتی تھی۔ باقی بچے سامنے بیٹھے کھاتے، پیتے اور وہ بھوک سے روتا رہتا۔ خدا بخش نے ایک بار یہ دیکھ لیا، تو اس کا دل کانپ اٹھا۔ اس دن وہ دو سال کے آدم کو گود میں لے کر پھوٹ پھوٹ کر رویا۔ جس کی حالت گھر میں رکھے پالتو جانور سے بھی بدتر تھی۔ خدا بخش نے کلثوم سے کوئی شکوہ یا گلا کرنے کے بجائے، آدم کو اپنے ساتھ کام پر لے جانا شروع کر دیا۔ ان دنوں وہ ایک درمیانے درجے کے ڈھابے پر بیرے کا کام کرتا تھا۔ آدم، کو ایک کونے میں بٹھا کر وہ کوئی بھی چیز زمین سے اٹھا کر اسے

پکڑا دیتا۔ کیوں کہ وہ اس کے لیے فی الحال کوئی بھی کھلونا خرید نہیں سکتا تھا۔ آدم کو بیٹھا کر وہ اس کے ارد گرد ٹوٹی کرسی یا کوئی فالتو میز رکھ دیتا تاکہ وہ کہیں چلا نہ جائے یا کسی کی اس پر نظر نہ پڑے۔ آدم نہایت معصوم اور خوبصورت تھا مگر کمزور بہت تھا۔ اکثر خدا بخش کے ساتھ کام کرنے والے لوگ بھی اسے پیار کرتے اور اس کا خیال رکھتے تھے۔ ہوٹل کا مالک ریاض بھی آدم کی آمد سے بے خبر نہیں تھا، مگر اس نے کچھ بھی کہنے سے گریز کیا۔ کئی بار ایسا ہوا کہ خدا بخش کسی بیماری یا تکلیف کی وجہ سے کام پر نہیں جاسکا یا کسی وجہ سے آدم کو اپنے ساتھ نہیں لاسکا۔ تب ایک دن اس کے مالک ریاض نے اسے اپنے پاس بلا کر کہا کہ

”کل سے آدم کو اپنے ساتھ ضرور لے کر آنا۔“

”کیا ہوا صاحب! کیا اس سے کوئی غلطی ہو گئی ہے۔“ خدا بخش ڈر گیا کہ شاید اس کی روزی روٹی کا یہ ذریعہ بھی بند ہونے لگا ہے۔

”تمہارا بچہ بہت سعد ہے خدا بخش۔ میں نے کئی بار نوٹ کیا ہے۔ جب وہ موجود ہوتا ہے، تو اس دن آنے والے گاہکوں کی تعداد، عام دنوں کے مقابلے میں دگنی ہوتی ہے۔ ایسا پہلے کبھی سال میں بہ مشکل ایک یا دو بار ہوتا تھا، مگر اب تو اکثر

ایسا ہونے لگا ہے اور جس دن وہ نہیں آتا، سب معمول کے مطابق ہوتا ہے۔ اب یہ اتفاق ہے یا کچھ اور میں نہیں جانتا۔“

خدا بخش یہ سن کر حیران رہ گیا، مگر اس نے کچھ کہا نہیں۔ اگر آدم کو اس وجہ سے محبت اور تحفظ ملتا ہے، تو اسے کچھ اور نہیں چاہیے تھا۔ اس طرح دن گزرتے رہے اور آدم چھ سال کا ہو گیا۔ جب خدا بخش نے اسے قریب کے ایک سرکاری اسکول میں داخل کر دیا۔

اس ڈھابے کے مالک نے اس وقت تک ترقی کر کے اپنے دو ہوٹل تعمیر کر لیے تھے، مگر اس کے باوجود وہ آدم سے بہت محبت کرتا تھا اور اس کے اسکول کی فیس سے لے کر سب خرچہ وہ دیتا تھا۔ یہ بات جہاں خدا بخش کے لیے تسلی بخش تھی، کلثوم کو انگاروں پر چلاتی تھی۔ اس کے بچے اس انعام سے کیوں محروم رہیں، یہ سوچ سوچ کر ہی وہ جلتی رہتی تھی۔ بچپن میں آدم نے دوسرے بچوں کی دیکھا دیکھی اسے ”امی“ کہہ کر مخاطب کیا، تو کلثوم نے ایک ٹانگ اس کے پیٹ پر اتنے زور سے رسید کی کہ وہ دور جا گرا۔

”خبردار جو آئندہ مجھے امی کہا۔ تیرے جیسا ناسور میری کوکھ سے پیدا نہیں ہو سکتا ہے۔“

اس وقت آدم کو اس بات کی سمجھ نہیں آئی مگر وہ خدا بخش سے گلے لگ کر بہت رویا تھا۔

”ابا! اماں مجھے پیار نہیں کرتی ہیں۔ کیا میں ان کا بچہ نہیں ہوں؟“

پانچ سالہ آدم نے معصومیت سے سوال کیا۔ خدا بخش نے اس کا بھیگا چہرہ صاف کیا اور اس کی پیشانی چومتے ہوئے کہا۔

”نہیں میرے بچے۔ وہ سچ میں تمہاری ماں نہیں ہے۔ اس لیے تم اسے امی مت کہا کرو۔ وہ صرف اپنے بچوں کی ماں ہے۔ تمہارا ہر رشتہ صرف مجھ سے بنتا ہے۔ اس لیے وعدہ کرو آئندہ کسی سے ایسی امید نہیں رکھو گے اور نہ اداس ہو گے۔“

خدا بخش نے اپنا ہاتھ پھیلایا تو آدم نے فوراً اس پر اپنا چھوٹا سا ہاتھ رکھ دیا۔ پھر دل میں ہزار سوال رکھنے کے باوجود بھی اسے نے دوبارہ کسی سے شکوہ نہیں کیا۔ وہ صبح ابا کے ساتھ اسکول جاتا اور دوپہر گھر آ کر ابا کا انتظار کرتا رہتا۔ کھانے کو اسے کبھی ملتا تھا اور کبھی نہیں۔ کلثوم اب اسے مارتی تو نہیں تھی مگر وہ اس سے بات بھی نہیں کرتی تھی۔ شاید اتنے سالوں میں اس نے بالآخر اسے گھر کے فالتو سامان کی طرح قبول کر ہی لیا تھا۔ اس لیے اپنے بچوں کا بچا کچھا اس کے آگے ایسے رکھتی تھی جیسے وہ جانور ہو۔ آدم خاموشی سے کبھی کھا لیتا اور کبھی واپس رکھ آتا۔ خدا بخش

کے دوسرے بچے اس سے عمر میں بڑے تھے اور ماں کی طرح ہی اس سے چڑھ رکھتے تھے۔ اس لیے اس کے بارے میں سب کو بدگمان کرتے رہتے تھے۔ اسی وجہ سے آدم کو تین بار مختلف اسکولوں سے نکال دیا گیا۔ جہاں خدا بخش کے بچے اس کے ساتھ پڑھتے تھے۔ وجہ ایک ہی ہوتی۔

”اس کو یہاں سے لے جائیں۔ یہ سارا ماحول خراب کر دے گا۔ ہم بچوں کو تعلیم دیتے ہیں۔ خواجہ سرائوں کو نہیں!“

کہیں بہت نرمی سے اور کہیں بہت حقارت اور تحقیر سے جواب دیا جاتا تھا۔ ”مگر یہ بھی تو بچہ ہی ہے نا۔ کیا اس کے منہ پر لکھا ہوا ہے کہ خواجہ سرائے۔“ خدا بخش منت کرتا، مگر سامنے والوں کے پاس سو بہانے ہوتے۔ خدا بخش اکثر جب مختلف خواجہ سرائوں کو، مانگتے یا ناچتے ہوئے دیکھتا تو سوچتا کہ کیا خواجہ سرائوں کی اس حالت کا اصل ذمہ دار ہمارا معاشرہ ہے؟ جو کسی بھی طرح، انہیں اپنے درمیان جگہ نہیں دیتا۔ ایک اچھوت کی طرح ان سے برتاؤ کرتا ہے۔ ان لوگوں کو عزت سے جینے کا حق کیوں نہیں ملتا؟ اگر سب یہ مانتے ہیں کہ انہیں بھی پیدا کرنے والا خدا ہے، تو پھر انہیں تضحیک کا نشانہ کیوں بنایا جاتا ہے؟ کیوں ان سے ملنا، ان سے کوئی بھی تعلق رکھنا، عام لوگ تو کیا، ان کے اپنے خون کے رشتے بھی نہیں

رکھتے؟ پھر خدا نے انہیں زمین پر کیوں بھیجا ہے؟ اگر وہ ایک انسان کا درجہ بھی نہیں پاسکتے ہیں۔ ان کی پیدائش کا مقصد کیا ہے؟ یہ کیوں ہیں اور کس لیے ہیں؟ خدا بخش جتنا سوچتا، الجھتا ہی جاتا، مگر کبھی کسی حل تک نہیں پہنچ پاتا تھا۔

ان دنوں خدا بخش کو ایک مشہور اسکول میں جاب مل گئی اور اس نے یہ ہی بہتر سمجھا کہ آدم کو اپنے پاس ہی داخل کروالے تاکہ اس کے بچے، آدم کا سچ بتا کر اسے سب کے سامنے ذلیل و رسوا نہ کر سکیں۔ آدم یہاں آکر پہلے سے کچھ بہتر صورت حال میں تھا، مگر بہت جلد وہ سب کی نظروں میں آنے لگا۔ اس کے بولنے کا تھوڑا سا مختلف انداز، نسوانیت لیا چہرہ، اس کی چال، سب کچھ اس کے راز کھولنے لگا تھا۔ باقی کسر خدا بخش کی بیوی نے پوری کر دی۔ اس نے یہ بات، خدا بخش کے ساتھ اسکول میں کام کرنے والی آیا کو رازدارانہ طور پر بھی بتا دی کیوں کہ اس دن فنکشن پر یہ راز صرف اسکول کے بچوں تک ہی رہا۔ وہ چاہتی تھی کہ یہ بات اسکول کی ٹیچرز کے کان تک بھی جائے تاکہ آدم کو یہاں سے بھی نکال دیا جائے اور پھر اس آیا نے نیچے سے لے کر اوپر تک یہ بات پھیلا دی۔ اس سے پہلے کہ اس بات پر کوئی ایکشن لیا جاتا۔ مسز مارتھا نے اس پر اسٹینڈ لے لیا۔ اس نے آدم کے اصلیت جانتے ہوئے ہی اپنی سفارش پر داخلہ کروایا تھا۔ وہ پرنسپل کے سامنے

دلیل لے کر پہنچ گئی اور انہیں قائل کر کے ہی لوٹی تھی۔ مسز مارتھا نے ایک عمر، اس اسکول میں کام کرتے ہوئے گزاری تھی۔ اس لیے ان کی بات کا رد کرنا آسان نہیں تھا۔ پھر جس عیسائی کمیونٹی سے اس اسکول کو فنڈز ملتے تھے، مسز مارتھا سے بگاڑنے کے بعد، وہ بھی ملنا ممکن نہیں رہتا۔ مسز مارتھا کی سروس کا صرف ایک سال رہ گیا تھا۔ پھر وہ اپنے ملک واپس جانے والی تھیں۔ اس لیے پرنسپل نے وقتی خاموشی اختیار کر لی اور اس طرح آدم اس اسکول میں تعلیم حاصل کرنے لگا، مگر اسکول کے بچوں کا رویہ اس کے ساتھ ویسا ہی ہتک آمیز ہی رہا۔ وہ بڑا ہونے کے ساتھ ساتھ، بہت سنجیدہ اور خود میں گم رہنے لگا تھا۔ اس نے اپنے بولنے، اٹھنے، بیٹھنے اور چلنے کے انداز میں خدا بخش کے کہنے اور دوسرے بچوں کو دیکھنے کے بعد تبدیلی لانی شروع کر دی جس میں وہ کافی حد تک کامیاب بھی ہو گیا، مگر پھر بھی اس کا سچ، اس کا پیچھا نہیں چھوڑتا تھا۔ ان دنوں خدا بخش اسے، محلے کی ایک بوڑھی اماں کے پاس قرآن کی تعلیم حاصل کرنے کے لیے بھی بھیجے لگا۔ آدم، اس کی بات بلا کسی چوں چرا کے مانتا تھا۔ سارے دن کی محنت اور مشقت کے بعد، رات کو خدا بخش جب سونے کے لیے چارپائی پر لیٹتا، تو آدم خاموشی سے اس کے پاؤں

کی طرف بیٹھ کر اپنے ننھے ننھے ہاتھوں سے دبانے لگتا۔ خدا بخش اسے منع کرتا، اپنے پاؤں سمیٹ لیتا، مگر وہ اپنے کام میں لگا رہتا۔

”ابا! مجھے منع مت کیا کریں۔ مجھے آپ کی خدمت کر کے سکون ملتا ہے۔“

وہ معصوم چہرے پر سنجیدگی طاری کر کے کہتا، تو خدا بخش کی آنکھیں نم ہو جاتیں۔

اسے لگتا تھا کہ اس نے ساری زندگی میں بس یہ ہی ”کمایا“ ہے۔ باقی سب مایا ہے

۔ اس کی بیوی کی طرح، اس کے بچے بھی باپ سے بدگماں اور چڑے ہوئے رہتے

تھے۔ وقت چاہے جیسا بھی ہو تیز رفتاری کے ساتھ گزر ہی جاتا ہے۔ آدم جو پہلے

پہلے اسکول میں عجوبہ کے طور پر جانا جاتا تھا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس

کے وجود پر سے سب کی توجہ ہٹتی جا رہی تھی۔ ہاں وہ تب سب کی نظروں میں

چھتا تھا، جب کلاس میں سب سے خاموش اور پیچھے بیٹھنے والا بچہ، امتحان میں اوّل

پوزیشن لیتا تھا۔ یہ بات سب کے لیے بہت حیران کن تھی۔ نہ تو اس پر کسی ٹیچر کی

خاص نظر کرم تھی اور نہ ہی وہ دوسرے بچوں کی طرح مہنگی مہنگی ٹیوشن لیتا تھا۔

وہ بس دھیان سے کلاس میں پڑھایا، سنتا اور سمجھتا تھا۔ پہلے پہل اس پر نقل کرنے

کا بھی شک کیا گیا مگر سخت سے سخت نگرانی کے باوجود اس کے پاس سے کبھی کوئی

نقل شدہ مواد نہیں ملا۔ اگر اس کے وجود میں قدرت نے کوئی کمی رکھی تھی تو،

اسے ذہانت سے بھی نوازا گیا تھا مگر ایک خواجہ سرا کی پہلی پوزیشن کا اعلان کرتے

ہوئے، اسے اسٹیج پر بلانا بہت عجیب سا لگتا تھا۔ اس کا حل یہ نکالا گیا کہ اس کی

پوزیشن تو برقرار رکھی جاتی مگر اسٹیج پر ٹرائی اور رزلٹ لینے کے لیے خدا بخش کو

بلایا جاتا۔ خدا بخش کانپتے ہاتھ پاؤں کے ساتھ اسٹیج پر جاتا۔ یہ بھی صرف ایک سے

دو بار ہوا تھا، پھر اس کے ساتھ اکثر پہلی پوزیشن پر ایک بچہ اور بھی ہوتا جسے

اسٹیج پر بلایا جاتا اور آدم کو رزلٹ کارڈ اور شیلڈ بعد میں دی جاتی تھی۔ خدا بخش،

آدم کا اترا چہرہ دیکھتا، تو اسے تسلی دیتا۔

”تمہاری کامیابی، کسی بھی ٹرائی یا شیلڈ کی محتاج نہیں ہے آدم۔ تمہیں ایک جنگ

لڑنی ہے، اپنے بقا کی جنگ۔ اس معاشرے سے اپنا حق وصول کرنا ہے اور اس کے

لیے تمہیں اپنا دل بہت بڑا کرنا پڑے گا۔“

مسز مارٹھا نے ایک بار اسے منہ بسورتے اور خدا بخش سے سوال کرتے سنا، تو اس

کے پاس آکر کر نرمی سے بولی تھیں۔

”آپ ٹھیک کہتی ہیں میڈم صاحبہ! مگر ابھی یہ بچہ ہے نا، نادان کچھ سمجھتا نہیں،

اسی لیے ضد کر بیٹھتا ہے۔“

خدا بخش فوراً اس کے سامنے ڈھال بن کر کھڑا ہو جاتا۔

”یہی تو افسوس کی بات ہے خدا بخش! یہ بچہ ہو کر بھی رویے پڑھنے اور پرکھنے میں کسی بوڑھے شخص کی طرح ماہر ہو گیا ہے۔ اس نے بھلا بچپن کب دیکھا اور محسوس کیا ہے۔“ مسز مارتھا دکھی لہجے میں کہتی تھیں۔ مسز مارتھا آدم کو اسکول میں مختلف ہونے والی ایکٹیویٹیز میں شامل کرتی رہتی تھیں۔ اسپورٹس سے زیادہ آدم کو اسٹیج پر مختلف کرداروں میں ڈھلانا اور پرفارم کرنا زیادہ پسند تھا، مگر وہ مسز مارتھا کی ہدایت پر ہر مقابلے میں حصہ ضرور لیتا تھا۔ یہ دراصل اس کی تربیت کرنے اور اسے مضبوط بنانے کا ایک طریقہ تھا۔ اس نے مختلف ٹیلو اور ڈراموں میں جو جو کردار بھی کیے ، وہ بہت سراہے گئے۔ اس طرح نہ چاہتے ہوئے بھی آدم کو ایسے رول میں کاسٹ کرنا پڑتا ، جو کسی اور کے بس کی بات نہیں ہوتا تھا۔ اس طرح آدم اپنی خدا داد صلاحیتوں کی بنا پر تھوڑی بہت جگہ بنانے میں کامیاب ہو جاتا، مگر پھر بھی اسے آج تک کسی کی اچھی دوستی نہیں ملی تھی۔ فارینہ کو دیکھ کر اس کے دل نے پہلی بار شدت سے یہ خواہش کی تھی کہ یہ نک چڑھی سی لڑکی اس کی دوست بن جائے۔ کچھ دن اسے یہ سعادت ملی بھی مگر پھر وہ بھی سب کی باتوں میں آکر اس سے دور ہوتی گئی بلکہ اب اکثر اسے تنگ کرنے، چھیڑنے اور مذاق اڑانے والے بچوں میں وہ بھی شامل ہوتی۔

یہ بھی اس دن کی بات ہے جب خدا بخش نے چھٹی کے وقت اس سے وعدہ کیا کہ کل اس کی ساگرہ والے دن ، وہ اسے پارک لے کر جائے گا اور آئس کریم بھی لے کر دے گا۔ یہ بات پاس کھڑے اس کی کلاس کے کچھ بچوں نے سن لی اور انہوں نے فوراً ہی ایک منصوبہ بنا لیا۔ اگلے دن وہ خاموشی سے بریک ٹائم میں اپنے ساتھ لایا لٹچ کھا رہا تھا۔ جب فارینہ اس کی پاس آئی۔ آدم اسے دیکھ کر پہلے تو حیران ہوا، پھر ایک دم ہی خوشی سے بھرپور لہجے میں بولا۔

”فارینہ تم!“ آدم نے اپنے تھوڑے سے بچے لٹچ باکس کی طرف دیکھا۔ سوکھی روٹی اور تھوڑا سا اچار... اس کے پاس کچھ بھی ایسا نہیں تھا، جو فارینہ کو پیش کرتا۔ اس نے بے دلی سے اپنا لٹچ باکس بند کیا۔ آج اسے شدت سے احساس ہوا کہ اس کی جیب میں ایک روپیہ بھی موجود نہیں ہوتا مگر خدا بخش کے مالی حالات اس کے سامنے تھے۔ اس لیے اس نے کبھی ضد بھی نہیں کی تھی۔ وہ افسردگی سے سر جھکا کر رہ گیا۔ فارینہ مسکراتے ہوئے آگے بڑھی۔ اس کے دونوں ہاتھ پیچھے کی طرف تھے۔ جیسے وہ کچھ چھپا رہی ہو۔

”آدم! آج تمہاری ساگرہ ہے نا۔“ فارینہ نے معصومیت سے پوچھا، تو حیرت سے دیکھتے آدم نے سر اثبات میں ہلا دیا۔

”اسے کیسے پتا چلا؟“ وہ دل ہی دل میں بہت حیران ہوا اور بے تحاشا خوش بھی کہ اس کے خاص دن پر، کوئی بہت خاص اسے وش کرے گا۔

”پپی برتھ ڈے ٹو یو، پپی برتھ ڈے ڈیر آدم۔“ فارینہ نے ہلکی سی آواز میں گلناتے ہوئے، ایک گفٹ پیکٹ اس کی طرف بڑھایا تھا۔ آدم خوشی اور حیرت سے گنگ اسے دیکھتا ہی رہ گیا۔ کبھی کوئی اسے اتنے پیار سے بھی وش کر سکتا ہے یہ اس نے خواب میں بھی نہیں سوچا تھا۔ اس نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے، گفٹ پیکٹ پکڑ لیا۔

”تھینک یو فارینہ! یہ میری زندگی کی سب سے یادگار اور پیاری سالگرہ ہے۔“ آدم نے خوشی سے معمور لہجے میں کہا۔

”تھینک یو بعد میں کہہ لینا! پہلے اپنا گفٹ تو دیکھ لو۔ پتا نہیں تمہیں پسند بھی آتا ہے یا نہیں۔“ فارینہ کی آنکھوں میں چمک تھی اور ہونٹوں پر مسکراہٹ۔

”تم لائی ہو، تو اچھا ہی ہو گا، مگر میرے پاس ایسا کچھ بھی نہیں ہے جو میں تمہیں اس موقع پر پیش کر سکوں، لیکن وعدہ میں کل تمہارے لیے کینڈی ضرور لائوں گا۔“ آدم نے سوچ لیا تھا کہ وہ ابا سے کہے گا کہ اسے سیر نہیں کرنی اور نہ ہی آئس کریم کھانی ہے۔ بس ابا اسے ایک اچھی سی کینڈی لے دے جو وہ کل فارینہ

کو دے گا۔ فارینہ کے بے حد اصرار کرنے پر آدم مسکراتے ہوئے، کانپتے ہاتھوں سے اپنا گفٹ کھولنے لگا۔ چمکیلا گفٹ پیپر اتارتے ہی ایک مناسب سائز کا ڈبا نکلا۔ آدم نے تجسس سے اسے الٹ پلٹ کر دیکھا اور پھر اس پر لگی ٹیپ کھولنے لگا۔ ڈبا کھولتے ہی وہ چونکا اور ہاتھ بڑھا کر اندر موجود چیزیں ایک ایک کر کے باہر نکالنے لگا۔

لال رنگ کا پرانا گھساپٹا سوٹ جس پر گولڈن کام ہوا تھا، کانچ کی چوڑیاں اور جھمکے آدم کا رنگ فق ہو گیا۔ جب کہ فارینہ نے فوراً ڈبے میں رکھا لال دوپٹا نکالا اور اس کے اوپر دے دیا۔

”پپی برتھ ڈے ٹو یو۔“ اچانک ہی بہت سے آوازیں، قہقہے، کھکھلاہٹیں اس کی آس پاس گوجنے لگیں۔ سب بچے تالیاں بجاتے، شور مچاتے اندر آگئے۔ اس کا مطلب کہ وہ یہ سب چھپ کر دیکھ رہے تھے۔ آدم کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ اس نے غصے سے دوپٹا اتار کر نیچے زمین پر پھیکا۔ ایک لڑکے نے اپنے کمرے سے اس کی تصاویر بھی لیں تھیں۔ آدم نے اس کے ہاتھ پر جھپٹا مارا اور کیمرا چھین کر نیچے زمین پر زور سے مارا۔ وہ کئی ٹکڑوں میں بٹ گیا۔ اس لڑکے کو شدید غصہ آیا اور وہ آدم کو مارنے لگا۔ آدم نے بھی اپنے ہاتھ پاؤں چلائے اور اس پر حاوی ہو

گیا۔ اس پر کوئی جنون سوار ہو گیا تھا۔ وہ اپنے اندر کا سارا غصہ، نفرت اور چڑ اس پر نکال رہا تھا۔ فارینہ خوف زدہ ہو کر پیچھے ہٹ گئی۔ اس وقت اسے آدم سے خوف کے ساتھ ساتھ شدید نفرت بھی محسوس ہوئی تھی۔ اس لڑکے کے کچھ ساتھی فوراً آگے بڑھے اور اسے چھڑاتے ہوئے آدم کو پیٹنے لگے۔ وہ چاروں مل کر اسے مار رہے تھے۔ اسی وقت شور شرابے کی آواز سن کر اسکول کا اسٹاف دوڑا آیا اور انہیں ایک دوسرے سے بہ مشکل الگ کیا۔ آدم کی حالت بھی خراب تھی مگر جس لڑکے کو اس نے مارا تھا، اس کی حالت بہت بری تھی۔

اسے فوراً ہسپتال پہنچایا گیا۔ اس کے والدین بھی پہنچ گئے۔ سب سے پوچھا گیا، تو سب نے آدم ہی کو قصور وار ٹھہرایا۔ وہ سب طاقت اور پیسے میں اس سے کہیں آگے اور مضبوط تھے۔ پرنسپل کو مجبوراً آدم کے خلاف ایکشن لینا پڑا۔ خدا بخش کے لاکھ منتیں، ترلے اور اگلی بار ایسی غلطی نہ کرنے کا وعدہ کرنے کے باوجود، آدم کو اسکول سے نکال دیا گیا۔ یوں آدم کی زندگی میں کھلنے والا روشن در پیچہ ہمیشہ کے لیے بند ہو گیا اور اس کی وجہ وہ لڑکی بنی تھی جس سے دوستی کی وہ شدید خواہش رکھتا تھا۔

”آدم تم نے ایسا کیوں کیا؟“ خدا بخش نے اس سے پوچھا، تو روتے ہوئے اُس نے کہا۔

”ابا میں نے ہمیشہ سب کی باتیں سنیں اور برداشت کیں مگر اس لڑکی نے جب سب کے ساتھ مل کر میرا مذاق اڑایا اور مجھے بے وقوف بنایا، تو میں برداشت نہیں کر سکا۔ ابا وہ مجھے بہت اچھی لگتی ہے اور میں اس سے دوستی کرنا چاہتا ہوں۔ میں کیسے اس کے سامنے یہ برداشت کرتا کہ میں کسی سے کمتر ہوں، اگر وہ دوسرے لڑکوں سے دوستی کر سکتی ہے، تو مجھ سے کیوں نہیں۔“

آدم کے لہجے میں ضد تھی اور غصہ بھی۔

خدا بخش اس کی باتوں پر چونک گیا۔ وہ اب بڑا ہو رہا تھا۔ اس میں تبدیلی آر ہی تھی۔ چودہ سال لڑکپن کی عمر ہوتی ہے جس میں بہت سی باتوں کو سمجھنا اور بتانا ضروری ہو جاتا ہے۔ اسے آگاہی دینا خدا بخش کا کام تھا۔

”اس لیے کہ تم دوسروں کی طرح نہیں ہو۔ تم ان سے مختلف ہو آدم۔“ خدا بخش نے اسے نرمی سے سمجھانا چاہا۔

”مگر کیوں ابا؟ میں سب سے الگ کیوں ہوں؟“ آدم نے تڑپتے ہوئے پوچھا۔

خدا بخش نے اسے اپنے سینے سے لگا لیا۔

”میرے بچے! یہ اللہ کی مرضی ہے۔ ہم کچھ نہیں کر سکتے ہیں۔“ خدا بخش نے اس کا سر تھپکتے ہوئے کہا، تو آدم فوراً ان کی آغوش سے نکلا۔

”اللہ نے مجھے ایسا کیوں بنایا ہے ابا کہ میں جسے دل سے پسند کرتا ہوں، اس سے دوستی نہیں کر سکتا، اسے اپنی زندگی میں شامل نہیں کر سکتا۔

ابا۔ بتا دیں اپنے اللہ میاں کو کہ آدم ان سے سخت ناراض ہے۔“

آدم نے منہ پھلاتے ہوئے کہا۔ فارینہ کی وجہ سے آج پہلی بار وہ اپنے رب سے دور اور شکوہ کننا ہوا تھا۔

”نہ میرے بچے! ایسا نہیں بولتے۔ اللہ تو بہت مہربان ہے اپنے بندوں پر۔“ خدا بخش کا دل خوف سے کانپ اٹھا۔

”تو کیا میں اس کا بندہ نہیں ہوں ابا۔ جو وہ مجھے کچھ بھی نہیں دیتا ہے۔ مجھ سے سب چھین لیتا ہے۔ آخر کیوں؟ میں ہی کیوں ابا، میں ہی کیوں۔“

آدم بلک بلک کر رو رہا تھا۔ خدا بخش کے لیے اسے سنبھالنا بہت مشکل ہو گیا تھا۔

پھر اس دن کے بعد سے آدم کو چپ لگ گئی۔ وہ سارا دن خاموش، چپ چاپ

ایک کونے میں بیٹھا رہتا۔ اس کی سوچیں عجیب و غریب ہوتی جا رہی تھیں۔ وہ جتنا

غور کرتا، اتنا ہی الجھتا جاتا۔ روزمرہ کے معمولات میں اس کی دلچسپی ختم ہو کر رہ

گئی تھی۔ خدا بخش نے پرنسپل سے درخواست کی تھی کہ اس سال آدم کو امتحان میں بیٹھنے کی اجازت دے دی جائے جسے رد کر دیا گیا۔ اس طرح آدم کا وہ سال بھی ضائع ہو گیا جس کا خدا بخش کو بہت افسوس اور دکھ تھا۔

”ابا! یہاں کسی کی زندگی ضائع ہو جاتی ہے اور کسی کو پتا بھی نہیں چلتا اور آپ

ایک امتحان کا دکھ لیے بیٹھے ہیں۔“ آدم کا لہجہ روز بہ روز تلخ ہوتا جا رہا تھا۔ سارا

دن وہ کتابوں کو ہاتھ نہیں لگاتا تھا جب کہ اسے پڑھنے کا بہت شوق تھا۔ قرآن

پاک پڑھنے بھی وہ بہ مشکل جاتا رہا۔ کچھ دنوں میں اس کا قرآن بھی مکمل ہو جانا

تھا۔ اسی لیے وہ خاموش تھا کہ ابا کو کسی طرف سے تو خوشی ملے۔ آدم کافی دنوں

سے محسوس کر رہا تھا کہ ابا کھویا کھویا اور گم صم رہنے لگا ہے۔ گھر آ کر کھانا کھاتے

ہی وہ لیٹ جاتا۔ اب وہ پہلے کی طرح، آدم سے باتیں بھی نہیں کرتا تھا۔ کسی گہری

سوچ میں ڈوبا اپنے ارد گرد سے لا تعلق رہنے لگا تھا۔ کلثوم کے کلیجے کو ٹھنڈ پڑ گئی،

جب آدم کو اسکول سے بے عزت کر کے نکالا۔ وہ اپنے مجازی خدا کی طرف طنزیہ

نظروں سے دیکھتی تھی۔

”اب بول! کیا کرے گا اس کا۔ آخر اس کا انجام تو یہی ہونا ہے۔ اپنی جنس کے

لوگوں کے پاس اسے ہر حال میں جانا ہی پڑے گا۔ تو کب تک اسے بچائے گا۔“

کلثوم اکثر طنزیہ لہجے میں کہتی۔ خدا بخش خاموشی سے اسے دیکھتا رہ جاتا۔ وہ اسے کیسے بتاتا کہ یہ ڈر ہی تو اسے راتوں کو سونے نہیں دیتا۔ اس معاشرے میں آدم جیسے بچوں کا صرف ایک ہی مستقبل تھا، لیکن اس کا دل نہیں مانتا تھا کہ وہ اُسے اس حال میں دیکھے۔ وہ آدم کو اپنے باقی بچوں کی طرح، ہی دیکھنا، چاہتا تھا، مگر قسمت کی ستم ظریفی کے آگے وہ بے بس تھا اور اسی بے بسی میں ایک دن وہ مسز مار تھا کے سامنے پھوٹ کر رو دیا۔ تبھی امید کی ایک کرن مسز مار تھانے اس کی خالی جھولی میں ڈالی تھی مگر اس کے لیے اسے قربانی دینی تھی۔ اپنی سب سے پیاری اور عزیز چیز کی۔

”موہنی تو یہاں بیٹھی ہے۔ میں کب سے تجھے ڈھونڈ رہی ہوں۔“ موہنی درختوں کے اسی جھنڈ کی ٹوٹی سیڑھیوں پر گم صم بیٹھی تھی، جب پیونے اس کے پاس آکر کہا۔ آج جمعرات تھی اور مزار پر آنے والوں کا ہجوم بڑھ رہا تھا۔ کچھ دیر میں محفل سماع شروع ہونے والی تھی۔ علی یار انتظامات کی نگرانی میں مصروف تھا۔ موہنی پچھلے ایک ہفتے سے ماہی بے آب کی طرح تڑپتی، ہر احتیاط اور پابندی بھولتی جا رہی تھی۔ اس کی حالت ایسی تھی کہ نہ اسے کھانے کی فکر تھی اور نہ کسی اور کام کی۔ جہاں بیٹھی ہوتی وہیں بیٹھی رہ جاتی۔ رضیہ اس کی حالت سے بہت فکر مند تھی

اور بار بار اس سے پریشانی کی وجہ دریافت کرتی مگر موہنی کچھ نہیں بتاتی تھی۔ موہنی کو ایسا لگتا تھا کہ جیسے اس نے، اپنی غلطی اور حماقت سے سائیں کو کھو دیا ہے، اب دوبارہ اسے نہیں دیکھ سکے گی۔ دن میں جب بھی اس کا علی یار سے سامنا ہوتا وہ ایک ہی سوال کرتی۔

”سائیں کب آئے گا؟“ علی یار کبھی تو اسے ٹال دیتا اور کبھی یک دم ہی غصے میں آ جاتا۔

”کیوں تجھے کیا تکلیف ہے بی بی۔ جا، جا کر اپنا کام کر۔“

وہ ہر بار غصے میں وہاں سے پلٹ آتی اور دوبارہ نہ جانے کا عہد کرتی مگر اگلے دن سب بھول بھال کر وہ پھر اسی سوال کا کشکول پھیلا کر علی یار کے راستے میں کھڑی ہو جاتی۔ ایک دن علی یار نے اسے راستے میں کھڑا دیکھ کر پاس آکر کہا۔

”سائیں کے بہ قول ان کے مرشد کہا کرتے تھے کہ بندہ اتنی ضد خدا سے کرتا اچھا لگتا ہے۔ بندے مان اور ضد کا بوجھ اٹھانے میں اکثر چوک جاتے ہیں۔“

”چوک تو میں گئی تھی، اسی لیے آج تیری منت کرنی پڑ رہی ہے۔“ موہنی نے تیکھے لہجے میں کہا، تو علی یار تھک ہار کر خود سے بولا تھا۔

”سائیں نے ٹھیک کہا تھا۔ تیری عقل کا خانہ خالی ہے۔“

علی یار یہ کہتے ہوئے وہاں سے چلا گیا۔ جب کہ موہنی گم صم سی وہاں کھڑی رہی۔
”کیا سائیں میرے بارے میں بات کرتا ہے، میری فکر کرتا ہے؟“ اس سوچ نے
اسے یک دم ہی خوشی سے مالا مال کر دیا تھا۔ اتنے دنوں سے چھائی اُداسی آج ختم
ہو گئی تھی مگر یہ تھوڑی دیر تک ہی رہا۔ پھر وہ اسی بے کلی اور بے چینی کا شکار
ادھر ادھر پھرنے لگی۔ ان دنوں اسے اس بات کی سمجھ بہت اچھی طرح سے آئی
تھی کہ محبت میں بے کلی اور بے چینی میں گزرا ہر لمحہ بہت بھاری اور جان لیوا
ہوتا ہے۔ کسی کو آپ کا انتظار رہے۔ یہ بہت عام سا لگتا ہے سننے میں مگر آپ کو
کسی کا انتظار رہے یہ پل صراط پر چلنے کے مترادف ہوتا ہے۔
”کیا کام ہے تجھے پیو؟“

موہنی نے بے زار لہجے میں اس سے پوچھا، تو پیو اپنے چہرے پر تکلیف کے تاثرات
ت طاری کرتے ہوئے بولی۔

”کل رات سے میری طبیعت بہت خراب ہے موہنی۔ ساری رات درد سے تڑپ
کر گزاری ہے۔ کسی دوائی سے فرق نہیں پڑ رہا۔ مجھے وہ جیدے (جاوید) کی ماں نے
بتایا ہے کہ وہ جو شہر میں بڑی سے دکان ہے دوائیوں کی وہاں ایک ڈاکٹر بیٹھتا ہے
۔ اس کے ہاتھ میں بڑی شفا ہے، میں وہاں سے دوائی لے لوں جا کر مگر تجھے پتا

ہے کہ میں اتنی دور اکیلی نہیں جاسکتی اور میرے ساتھ کوئی جانے پر بھی تیار نہیں
ہے۔ اگر برا نہ مانے تو، تُو چلے گی میرے ساتھ۔ بس ہم آدھے گھنٹے میں واپس آ
جائیں گے۔“

پیو نے اسے گھیرتے ہوئے کہا۔

”جیدے کی ماں نے کہا ہے تو تم اسی کے ساتھ چلی جاؤ۔ میرا دل نہیں کر رہا کہیں
بھی جانے کو۔“

موہنی نے چڑ کر جواب دیا۔ دس سالہ جاوید اور اس کی بے سہارا ماں بھی یہاں
رہتے تھے۔ اسی لیے موہنی ان سے اچھی طرح واقف تھی۔

”چل ٹھیک ہے تیری مرضی۔ میں کسی کی ترلے منتیں کیا کروں۔ میری تکلیف ہے
میں جانو۔ رہ لوں گی ایسے ہی۔“

پیو نے اُداسی سے کہا اور واپس پلٹ گئی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر موہنی
کو دکھ ہوا۔

”میں بھی کبھی کبھار کتنی کٹھور بن جاتی ہوں۔ اس دن پیو نے میری جان بھی بچائی
تھی۔“ موہنی نے ہمدردی سے سوچا اور اپنی جگہ سے کھڑے ہوتے ہوئے اسے
آواز دی جو آہستہ آہستہ قدموں سے چلتی اس کے پکارنے ہی کی منتظر تھی۔

”اچھا ٹھیک ہے میں چلتی ہوں مگر ٹھہر میں کسی کو بتا کر آتی ہوں۔“ موہنی نے اسے وہاں ہی رکنے کا کہا اور مزار کی طرف مڑ گئی۔

”ہائے ربا میں مر گئی۔“ پینو چیچ مار کر نیچے زمین پر گر گئی۔ موہنی فوراً اس کی طرف بھاگ کر آئی اور درد سے تڑپتی پینو کو سنبھالتے ہوئے پریشانی سے پوچھنے لگی۔

”کیا ہوا پینو! تو ٹھیک تو ہے نا!“

”میرے پیٹ میں بہت درد ہو رہا ہے۔ مجھے جلدی سے ڈاکٹر پر لے چل۔ کہیں میں یہاں مر ہی نہ جاؤں۔ جلدی کر موہنی۔“

پینو نے اس طرح شور ڈالا کہ موہنی کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ اسے سہارا دے کر وہ آہستہ آہستہ چلتی مزار کی پچھلی طرف آئی تو وہاں پہلے سے ایک رکشا موجود تھا۔ پینو فوراً اس میں بیٹھ گئی۔ موہنی نے بھی غور نہیں کیا کہ مزار کی پچھلی سڑک پر رکشے والے کا کیا کام ہے؟

پینو کے شور شرابے میں اس نے کسی طرف دھیان نہیں دیا تھا۔ چونکی تو تب جب رکشا ایک جھٹکے سے رکا۔ موہنی نے روڈ کی طرف دیکھا۔ کچھ آدمی جنہوں نے اپنے منہ چھپا رکھے تھے، فوراً ان کی طرف لپکے۔ اس سے پہلے کہ موہنی کچھ سمجھتی وہ اسے رکشے سے نکال کر کھینچتے ہوئے گاڑی کی طرف لے گئے۔ کار کی پچھلی سیٹ

پر اسے دھکا دے کر دروازہ زور سے بند کیا۔ اس کھینچا تانی میں اس کا دوپٹا سر سے اتر گیا تھا۔ دوسری طرف کا دروازہ کھول کر ایک آدمی آ کر بیٹھ گیا۔ موہنی تڑپ کر اس سے دور ہوئی اور کار کے شیشے سے لگتے ہوئے مڑ کر مدد طلب نظروں سے باہر دیکھا۔ اسی وقت اس کی نظر پینو پر پڑی، وہ پینو کو آواز دے کر پکارنے لگی مگر وہ سامنے کا منظر دیکھ کر ساکت رہ گئی۔

کچھ دیر پہلے، درد سے تڑپتی، پینو اب بہت آرام سے کھڑی کا روالے آدمی سے باتیں کر رہی تھی۔ اس لمبے تڑنگے آدمی نے نوٹوں کی ایک گڈی پینو کو پکڑائی جو اس نے فوراً اپنی چادر میں چھپا لی۔ وہ خوشی سے کھلتے چہرے کے ساتھ، اسی رکشے میں بیٹھنے لگی جب اس کی نظر بت بنی موہنی پر پڑی۔ اس کی آنکھوں میں یک دم نفرت پھیلی تھی جسے دیکھ کر موہنی دنگ رہ گئی۔ پھر اس نے طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ اسے دیکھا اور ہاتھ ہلاتے ہوئے رکشے میں بیٹھ کر چلی گئی۔ موہنی کو یاد آیا کہ علی یار نے بہت بار اسے پینو سے دور رہنے کی ہدایت کی تھی۔ سائیں نے ٹھیک کہا تھا اس کے بارے میں کہ اس کی عقل کا خانہ خالی ہے۔ اپنی حماقت اور نادانی سے وہ غلط باتوں میں پہنچ گئی تھی۔ اسے ہمیشہ خود پر بہت مان رہا تھا اور ہر بار ہی اسی طرح منہ کی کھانی پڑتی تھی۔ باقی دونوں آدمی بھی تیزی سے گاڑی کی طرف آئے

دونوں فرنٹ سیٹ پر بیٹھے تھے۔ پچھلی سیٹ پر بیٹھا آدمی اس پر سے نظریں ہٹانے کی کوشش کرنے کے باوجود کامیاب نہیں ہو پا رہا تھا۔ اس کی آنکھوں کی ہوس اور ہونٹوں پر شیطانی مسکراہٹ دیکھ کر موہنی خوف سے خود میں سمٹ کر رہ گئی۔ اس کا دوپٹا پتا نہیں کہاں رہ گیا تھا۔ اسے آج کسی اپنے کی بات شدت سے یاد آئی تھی کہ

”عورت تب تک ہی محفوظ اور بہادر ہے، جب تک اپنوں کی پناہ میں ہے۔ باہر کی دنیا میں اس سے زیادہ کمزور اور بے بس کوئی اور نہیں ہوتا۔“

اپنی خود سری میں اس نے اس بات کی نفی کی تھی اور آج اسی بات نے اسے اس کی اوقات یاد دلا دی تھی۔

”اوئے راکٹ، اپنی گندی نظریں ہٹا لڑکی پر سے۔ یہ صرف میرا مال ہے۔“

ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے شخص نے غراتے ہوئے کہا۔

”کیا ہو گیا ہے تجھے دلاور۔ ایک لڑکی کے لیے یار سے لڑ رہا ہے۔ آخر اس خزانے سے کچھ ہمیں بھی تو عنایت ہو گا نا۔ اتنی محنت کس لیے کی ہے ہم نے۔“

راکٹ کی رال ٹپک رہی تھی، مگر اس کا لہجہ بھی تلخ ہو چکا تھا۔

”بکواس بند کر اپنی۔“ دلاور نے اسے غلیظ گالیاں دی تھیں جسے سنتے ہی راکٹ کا چہرہ بھی تن گیا۔

”دلاور اپنی حد میں رہ۔ نہیں تو...“ اس کا ہاتھ رینگتے ہوئے اپنی کمر میں اڑسی پستول کی طرف گیا جسے دیکھتے ہی دلاور نے فوراً اپنی پستول نکال لی۔

”نہیں تو کیا کم ذات، کتے، کینے۔“

ایک عورت کے بے تحاشا حسن نے دونوں کا پاگل کر دیا تھا کہ وہ وقت اور حالات کو دیکھے بغیر لڑ رہے تھے۔ جب کہ تیسرا ساتھی جو ان سے عمر میں کافی کم لگ رہا تھا۔ مسلسل منمناتے ہوئے انہیں ٹھنڈا کرنا چاہ رہا تھا۔ موہنی نے موقع غنیمت جانا اور فوراً گاڑی کا دروازہ کھول کر سڑک پر چھلانگ لگا دی۔ اسے شدید چوٹیں لگیں مگر وہ کسی چیز کی پروا کیے بغیر اٹھ کر سڑک پر اندھا دھند بھاگنے لگی۔ وہ لوگ بھی گاڑی سے نکل کر اسے کے پیچھے بھاگے۔ موہنی نے جب انہیں اپنے بہت پاس آتے دیکھا تو اس کی سانسیں رکنے لگیں۔ اسی وقت اس نے ان میں سے کسی ایک کو پستول سے فائرنگ کرتے دیکھا۔

ساری فضا زوردار دھماکے سے گونج اٹھی۔ موہنی نے خوف سے چیخ ماری اور وہ منہ کے بل زمین پر گر پڑی۔

☆...☆...☆

وہ کون سی جگہ تھی؟ وہ کب سے وہاں تھی۔ اسے کچھ پتا نہیں تھا۔ ایک گندے سے کمرے میں اسے پھینک کر وہ دوبارہ خبر لینا بھول گئے تھے۔ کھانے کی ٹرے تینوں وقت باقاعدگی سے کمرے کے اندر کھسکا دی جاتی مگر کوئی اس کے سامنے نہیں آتا تھا۔ وہ تو گھر سے بہت اچھے اور خوشگوار موڈ میں نکلی تھی۔ کار ڈرائیو کرتے ہوئے، اونچی آواز میں میوزک سنتے اسے پتا ہی نہیں چلا جب کوئی اچانک اس کی گاڑی کے سامنے آیا۔ گھبرا کر اس نے بریک لگائی اور غصے میں گاڑی کا دروازہ کھول کر نیچے اتری۔ سڑک پر اوندھے گرے شخص کی طرف بولتے ہوئے وہ بڑھی تھی۔

”اندھے ہو، کیا نظر نہیں آتا؟“ اسی وقت اسے کچھ عجیب سا لگا جیسے اس کے پیچھے کوئی ہے۔ اس سے پہلے کہ وہ مڑتی کسی نے پیچھے سے ہاتھ بڑھا کر بھیگا رومال اس کی ناک پر رکھ دیا۔ بس تھوڑی دیر لگی اور وہ ہوش و حواس سے بیگانہ ہو گئی اور جب اسے ہوش آیا تو وہ اس نیم اندھیرے، کاٹھ کباڑ سے بھرے ہوئے کمرے میں موجود تھی۔ کچھ دیر لگی اسے سمجھنے میں کہ وہ کہاں ہے پھر اس نے چیخ چیخ کر آسمان سر پر اٹھا لیا مگر اس کی سننے والا کوئی بھی وہاں موجود نہیں تھا۔ یہ اس کا عالیشان گھر نہیں تھا جہاں اس کی ایک آواز پر نوکروں کی فوج اکٹھی ہو جاتی

تھی۔ یہاں اس کے رونے، دھونے، چیخنے، چلانے پر کوئی نہیں آیا تھا۔ اس کی ہمت بھی جواب دے گئی تو وہ بے بسی سے روتے ہوئے کمرے کے ایک کونے میں پڑی سوچتی رہتی کہ اب اس کے ساتھ آگے کیا ہو گا مگر ایسے کسی بھی سوال کا جواب نہیں تھا اس کے پاس۔

جن گندے مندے برتنوں میں اسے کھانا دیا جاتا انہیں دیکھ کر پہلے دن اسے شدید کراہت کا احساس ہوا اور اس نے کسی چیز کو ہاتھ نہیں لگایا مگر آخر کب تک۔ جب بھوک حد سے باہر ہو گئی تو اسے مجبوراً ان ہی برتنوں میں کھانا پڑا۔ تب اسے احساس ہوا کہ بنیادی ضرورتوں سے آگے کچھ نہیں ہوتا۔ پتا نہیں وہ کون سا وقت تھا، جب اس نے اچانک کچھ دوڑتے، بھاگتے قدموں کی آوازیں سنی تھیں۔ کچھ شور جو اس کی سمجھ سے باہر تھا۔ پھر بہت سے لوگوں کی آوازیں گونجی تھیں۔ فارینہ ڈر کر ایک کونے سے لگ گئی۔ پھر کچھ دیر بعد، کچھ بھاری قدموں اور ان کے درمیان چھن چھن کی آوازیں جیسے گھنگھرو کی ہوں، اس کے دروازے کے سامنے آ کر رک گئیں۔ کسی نے دروازہ کھولنے کی کوشش کی پھر تھوڑی دیر بعد دروازہ پورے جھٹکے سے کھلا۔ اندر کچھ لوگ داخل ہوئے جن میں سے کچھ سادہ حلیے میں تھے اور کچھ کا حلیہ اور لباس فقیروں اور ملنگوں جیسا تھا۔ فارینہ کی دھندلی ہوتی آنکھوں نے ان

میں سے کسی کو پہچانا چاہا۔ پھر اتنے چہروں میں ایک چہرہ اسے جانا پہچانا نظر آ ہی گیا۔ اس کے سوائے ہوئے اعصاب ایک دم سے جاگے تھے۔ اتنے دنوں سے بے دم اور نڈھال پڑی فارینہ میں، کوئی طاقت سی بھر گئی اور وہ بجلی کی تیزی سے اپنی جگہ سے اٹھی اور سامنے کھڑے شخص کا گریبان پکڑ کر چلانے لگی۔

”تم ذلیل، کمینے گھٹیا، بیخ ذات کے شخص۔ تمہاری جرأت کیسے ہوئی مجھے اغوا کرنے کی۔“

وہ پاگلوں کی طرح اس پر چیختی، چلاتی، تھپڑ برساتی جا رہی تھی۔ ساکت کھڑے ایڈم نے اس کے ہاتھ پکڑ کر اسے روکنا چاہا۔ اس کے ساتھ آئے باقی لوگ حیرت سے یہ تماشا دیکھ رہے تھے۔ فارینہ کے ناخنوں کے نشان ایڈم کے ہاتھوں اور گردن پر صاف نظر آرہے تھے۔ وہ اتنے دنوں کی فرسٹریشن، اس پر نکال رہی تھی۔ نہ کچھ سن رہی تھی اور نہ سمجھ رہی تھی۔

”فارینہ!“ ایڈم نے سختی سے اس کا بازو پکڑ کر اسے زور سے جھٹکا دیا۔ فارینہ ٹھٹک کر رک گئی اور اس کی سرخ آنکھوں میں دیکھنے لگی۔ نہ جانے کیسا عجیب سا احساس تھا ان آنکھوں میں کہ فارینہ ایک لمحے کے لیے خوف زدہ سی ہو گئی۔

”کسی کو اتنا مجبور مت کرو کہ وہ تم سے نفرت کرنے پر مجبور ہو جائے۔“

ایڈم نے کہتے ہوئے اسے زور سے جھٹکا دے کر پیچھے کیا۔ فارینہ لڑکھڑا کر سنبھل گئی۔ اسی وقت لوگوں کے ہجوم کو چیرتے ہوئے شہرام اور مرتضیٰ ہاشم اس تک پہنچے۔ فارینہ انہیں دیکھتے ہی چیخیں مارتے ہوئے باپ سے لپٹ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ ایڈم وہاں سے جا چکا تھا۔ بہت سے پولیس کے سپاہی بھی اندر آ گئے۔ فارینہ کی حالت اتنی خراب تھی کہ وہ کچھ نہیں بول پا رہی تھی۔ باپ کے سینے سے لگی وہ وہاں سے باہر آئی۔ کسی نے اس کے اوپر چادر بھی دی تھی مگر فارینہ کو کوئی ہوش نہیں تھا۔

”انکل آپ فارینہ کو لے کر گھر جائیں۔ باقی کا معاملہ میں خود ہینڈل کر لوں گا۔“ شہرام نے ان کے پاس آ کر کہا، تو مرتضیٰ ہاشم سر ہلاتے ہوئے کار کی طرف بڑھ گئے۔ فارینہ کو پچھلی سیٹ پر بیٹھا کر وہ اپنے قریبی دوست کی طرف متوجہ ہوئے جو پولیس میں اعلیٰ عہدے پر فائز تھا۔

”یار تم مجھے شرمندہ کر رہے ہو۔ فارینہ میری بھی بیٹی جیسی ہی ہے۔ شکر کرو کہ وہ اتنی جلد بازیاب ہو گئی۔ اس لڑکے ایڈم کی بروقت اطلاع کی وجہ سے۔ خیر تم فکر مت کرو۔ میں اس معاملے کی تہ تک پہنچوں گا اور اصل ملزموں کو کیفرِ کردار تک پہنچا کر ہی دم لوں گا۔“

ڈی ایس پی گلزار ملک نے کہا، تو وہ اس کا شکریہ ادا کرتے ہوئے، گھر کی طرف روانہ ہو گئے۔ فارینہ کے گھر پہنچنے تک، فیملی ڈاکٹر بھی پہنچ گئے تھے۔ فارینہ کی حالت کی پیش نظر اسے نیند کا انجکشن لگا دیا گیا۔

”ان کا آرام کرنا بہت ضروری ہے۔ زیادہ مینٹل اسٹریس ان کا نروس بریک ڈائون ہونے کی وجہ بھی بن سکتا ہے۔“

ڈاکٹر نے سختی سے ہدایت کی تھی کہ فارینہ سے اس واقعے کے بارے میں فی الحال کوئی بات نہ کی جائے۔ اس کی ذہنی حالت ابھی ایسی نہیں ہے کہ وہ زیادہ بوجھ برداشت کر سکے۔ مرتضیٰ ہاشم سب کچھ بھول بھال کر بیٹی کے سرہانے سے لگ کر بیٹھ گئے۔ فارینہ اس طوطے کی طرح تھی جس میں جادوگر کی جان ہوتی ہے۔ فارینہ کے اغوا کا یہ ایک ہفتہ قیامت بن کر ان پر گزرا تھا۔ دن رات ایک کرنے کے باوجود وہ اس کا کوئی سراغ نہیں پاسکے تھے۔ فارینہ کے فون ریکارڈ سے ایک نمبر سے بار بار آنے والی کالز نے پولیس کے ساتھ ساتھ، انہیں بھی حیرت میں ڈال دیا تھا کہ یہ نمبر نہ اس کی فریڈ لسٹ میں تھا اور نہ کسی جاننے والے کا۔ پھر کون اسے بار بار فون کر کے تنگ کرتا تھا۔ اس نمبر کا ایڈریس بھی علاقہ غیر کا تھا۔ پھر فارینہ کی ایک قریبی دوست نشاء نے بتایا کہ پچھلے کچھ عرصے سے اسے مسلسل

ایک نمبر سے خطرناک نتائج کی دھمکیاں بھی مل رہی تھیں مگر اصل معاملہ کیا تھا وہ اسے بھی ٹھیک سے نہیں پتا تھا اور نہ فارینہ نے کبھی تفصیل سے کچھ بتایا تھا۔ یہ بھی اگر اس کے سامنے، اس دن اتفاق سے اس بلیک میلر کا فون نہ آتا تو نشاء کو اتنا بھی پتا نہ چلتا۔

مرتضیٰ ہاشم یہ بات جان کر شاکڈ رہ گئے تھے۔ خود کو بار بار ملامت کرتے کہ فارینہ کو آزادی دے کر اس کی طرف سے آنکھیں کیوں بند کر لیں تھیں۔ فارینہ جتنی ضدی اور خود سر تھی، اس کا اندازہ انہیں تھا۔ وہ ہر بات اور مسئلے کو چٹکیوں میں اڑانے والی تھی اور شاید اسی بات کا خمیازہ اس نے، اپنے اغوا کی صورت میں بھگتا تھا۔ فارینہ کے اغوا کی خبر اخباروں میں آتے آتے رک گئی تھی۔ نہیں تو یہ اخباروں کی فرنٹ نیوز بنی۔ آخر وہ ایک مشہور ماڈل اور ایکٹریس ہونے کے ساتھ ساتھ ملک کے مشہور بزنس مین کی بیٹی بھی تھی۔ اس کے لیے مرتضیٰ ہاشم نے روپیہ، پیسہ پانی کی طرح بہا دیا تھا۔ کچھ شہرام اور ایڈم کے تعلقات بھی اس اہم موقع پر کام آئے تھے۔

مرتضیٰ ہاشم کو پہلے ندامت اور پھر پچھتاوا ہونے لگا تھا کہ انہیں فارینہ کی سکیورٹی کا پورا پورا بندوبست رکھنا چاہیے تھا۔ تاکہ ایسے حادثے کی نوبت ہی پیش نہ آتی، مگر

اب کیا ہو سکتا تھا۔ سوائے اس کے کہ وہ آئندہ کے لیے محتاط ہو جاتے۔ فارینہ کو سنبھلتے سنبھلتے کئی دن لگے۔ اس کا بیان بھی ریکارڈ کیا گیا۔ جس میں ایسی کوئی کام کی بات نہیں تھی۔ فارینہ نے کسی سے بھی ملنے سے صاف انکار کر دیا تھا۔ وہ شہرام کی کوئی فون کال اٹینڈ نہیں کرتی تھی اور نہ اس سے ملتی تھی۔ بس اپنے گھر اور کمرے تک محدود ہو کر رہ گئی تھی۔ فارینہ کو بعد میں باپ کی زبانی پتا چلا تھا کہ

”فارینہ کو جس جگہ رکھا گیا اس کے ساتھ ہی فقیروں کی ایک کچی بستی بھی تھی۔ یہ لوگ علاقے کے ہر گھر سے واقف تھے اور اس گھر کے مکینوں کی مشکوک حرکتیں پہلے ہی سب کی نظروں میں تھیں۔ فقیروں میں سے ایک شخص، ایڈم کا واقف کار تھا۔ جن خفیہ ذرائع سے ہم تینوں، پولیس کے ساتھ مل کر تمہاری تلاش کر رہے تھے، ان میں سے ہی کسی نے ایڈم تک یہ اطلاع پہنچائی کہ اس گھر میں ایک لڑکی کچھ دن پہلے لائی گئی تھی۔ یہ اطلاع ملتے ہی، ایڈم اپنے ان خیر خواہ دوستوں اور بستی کے لوگوں کے ساتھ، اس مکان کی تلاشی لینے پہنچ گیا۔ وہاں صرف ایک شخص نگرانی پر مامور تھا جو اتنے لوگوں کو دیکھ کر گھبرا گیا۔ اس سے پہلے کہ وہ بھاگتا، لوگوں نے اسے پکڑ کر مارا پیٹا، تو اس نے سب اگل دیا کہ کچھ دن پہلے اس کے صاحب لوگ ایک لڑکی کو یہاں بند کر گئے تھے۔ اس کا کام صرف

کھانا دینا اور رکھوالی کرنا تھا۔ اس دن اگر ایڈم تمہیں بچانے نہ آتا، تو اگلے دن، اس شخص کے کہنے کے مطابق، تمہیں وہاں سے آگے منتقل کر دیا جانا تھا، جہاں سے تمہارا بچ کر آنا تقریباً ناممکن ہوتا۔ ایڈم نے ہمیں بھی اطلاع کر دی تھی۔ ہم جب تک پولیس کے ساتھ وہاں پہنچے تمہیں بازیاب کروا لیا گیا تھا۔

فارینہ باپ کی زبانی یہ سب سن کر کچھ دیر کے لیے ہی سہی ندامت کا شکار ہوئی۔ اسے لگا تھا کہ اس نے ایڈم کے ساتھ زیادتی کی ہے مگر پھر اس پر منفی سوچوں کا غلبہ طاری ہو جاتا اور وہ نفرت سے سر جھٹکتی سوچتی کہ یہ سب بھی اس کی چال ہو گی۔ اسے بدنام کرنے کی، اس کے سامنے اچھا بننے کی، اسے حاصل کرنے کی۔ مگر وہ نہیں جانتا کہ اس زندگی میں تو میں اسے کبھی نہیں مل سکتی۔ وہ ساری زندگی محروم ہی رہا ہے اور رہے گا۔

فارینہ انہی سوچوں میں الجھی جلتی کڑھتی رہتی تھی۔ مرتضیٰ ہاشم نے اسے بہت بار ملک سے باہر جانے اور کچھ عرصہ وہاں ریست کرنے کا کہا تھا مگر وہ نہیں مانی اور نارمل ہوتے ہی دوبارہ تیزی سے روزمرہ کی روٹین میں مصروف ہو گئی۔ شہرام سے اس کے تعلقات سرد مہری کا شکار ہو چکے تھے۔ شہرام کو لگتا تھا کہ فارینہ اس سے کئی کترا رہی ہے، جبکہ فارینہ کو لگتا تھا کہ شہرام اس کے ساتھ ہوئے حادثے کی

وجہ سے بہت بدل گیا ہے۔ دونوں اسی غلط فہمی کا شکار ہوتے ہوتے ایک دوسرے سے دور ہوتے گئے۔ ان دنوں شہرام نے کچھ نئے پروجیکٹ شروع کر دیے تھے۔ ایڈم فارینہ کے ساتھ ہونے والے واقعے کے بعد کہیں نظر نہیں آیا۔ اس کا بھی زیادہ تر وقت امریکا میں گزر رہا تھا۔ اس نے شہرام کو بہت جلد یہاں سے واپس چلے جانے کا عندیہ سنا دیا۔ زندگی اپنے معمول پر آچکی تھی فارینہ کے کیس پر مزید پیش و رفت نہیں ہوئی تھی۔ یہ اس واقعہ کے ٹھیک دو مہینے بعد کی بات ہے، جب فارینہ نشاء کے بہت اصرار کرنے پر ان کے مشترکہ دوست کی پارٹی میں شہرام سے دور فارم ہائوس پر گئی۔ فارینہ کے ساتھ ہمہ وقت گارڈز موجود ہوتے تھے، اس لیے مرتضیٰ ہاشم اب مطمئن تھے۔ فارینہ پارٹی کی موج مستی اور رنگ میں پوری طرح کھوئی ہوئی تھی۔ ویٹر نے اسے اس کا پسندیدہ مشروب پیش کیا۔ نشاء اپنے بوائے فرینڈ کے ساتھ ڈانس فلور پر بانہوں میں بانہیں ڈالے رقص کر رہی تھی۔ فارینہ اسے دیکھنے میں مگن تھی جب کسی نے اس کے پاس آکر ہیلو کہا۔ فارینہ نے گردن موڑ کر دیکھا فیصل آفندی ہاتھ میں گلاس پکڑے، مسکراتے ہوئے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

”تم!“ فارینہ نے ناگواری سے اسے دیکھا۔ کچھ عرصہ پہلے اس نے، نیو وژن پروڈکشن ہائوس کے ساتھ کام کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ یہ وہی فیصل آفندی تھا جس کے ساتھ کام کرنے سے ایڈم نے شہرام کے ذریعے فارینہ کو منع کیا تھا اور ضد میں فارینہ نے کام کرنے کی حامی بھر لی تھی مگر جب اس نے اسکرپٹ پڑھا اور اسے بتایا گیا کہ اسے کافی بولڈ کام کرنا پڑے گا، تو فارینہ نے سختی سے منع کر دیا، مگر ان کے بار بار اصرار کرنے پر فارینہ نے یہ معاہدہ ہی توڑ دیا اور ایڈوانس کی رقم انہیں واپس کر دی جس پر اسے فیصل آفندی کا سخت رد عمل دیکھنا پڑا تھا اور اس کے بعد ہی اسے ایک نمبر سے دھمکی آمیز فون کالز ملنے لگی تھیں جسے اس نے کبھی خاطر میں نہیں لیا تھا۔ اب فیصل آفندی کو یہاں دیکھ کر، اس کا چہرہ تن گیا۔

”ہم تو آپ کے پرستاروں میں شامل ہیں مگر نہ جانے آپ ہی کیوں ہم سے دور دور رہتی ہیں۔“

فیصل آفندی کی نظریں سر سے پاؤں تک اس کا جائزہ لے رہی تھیں۔ فارینہ نے ناگواری کی شدید لہر اٹھتی محسوس کی اور منہ ہی منہ میں بڑبڑاتی وہاں سے آگے

بڑھی۔ جب اچانک فیصل تیزی سے آگے بڑھا اور فارینہ کے ہاتھ میں پکڑا جو اس کے کپڑوں پر گر گیا۔

”او۔ آئی ایم ریلی سوری!“ فیصل نے فوراً معذرت کی اور وہاں سے چلا گیا۔ فارینہ اسے دل ہی دل میں کوستی رہ گئی۔ اسی وقت نشاء بھی اس کے پاس چلی آئی۔

”او ہو فارینہ! تمہارا سارا، ڈریس خراب ہو گیا ہے۔ آئی تھنک، تم ڈریس تبدیل کر لو۔ میں اریخ اریخ کرواتا ہوں۔“ نشاء نے کہا اور اپنی ایک دوست سے بات کرنے کے لیے مڑنے لگی جب فارینہ نے اسے روکا۔

”اس کی ضرورت نہیں ہے! میں اسے واش کر کے آتی ہوں۔“

فارینہ نے کہا تو نشاء سر ہلاتی اسے گیٹ روم کی طرف لے آئی جو اس شور ہنگامے سے ذرا ہٹ کر تھا۔ ایک کمرے کا دروازہ کھول کر نشاء بولی۔

”تم آرام سے فارغ ہو کر آ جانا اور اگر کسی چیز کی ضرورت ہو تو مجھے موبائل سے کال کر دینا، میں آ جاؤں گی۔“

نشاء نے اسے کمرے میں چھوڑا اور دروازہ بند کرتی چلی گئی۔ فارینہ سر ہلاتی واش روم کی طرف بڑھ گئی۔ کچھ دیر بعد وہ واش روم سے باہر نکلی تو بری طرح چونک گئی۔ بیڈ پر فیصل آفندی لیٹا ہوا، سیٹی بجا رہا تھا۔

”تم اور یہاں؟ تمہاری جرأت کیسے ہوئی، اس طرح کمرے میں آنے کی! میں ابھی سکیورٹی کو کال کرتی ہوں۔“

فارینہ غصے سے کہتی ہوئے فون کی طرف بڑھی۔

”ایک منٹ ڈارلنگ! کسی کو بھی بلانے سے پہلے، کچھ دیکھ تو لو... پھر نہ کہنا کہ میں نے بتایا نہیں تھا۔“

فیصل نے خباثت سے کہتے ہوئے ہاتھ میں پکڑے موبائل کی اسکرین روشن کی تھی۔ فارینہ غصے سے چلتی پاس آئی اور جیسے ہی اس کی موبائل اسکرین پر نظر پڑی، اسے ایسا لگا جیسے زمین و آسمان اس پر آگرے ہیں۔ فیصل نے موقع کا فائدہ اٹھاتے ہوئے نہ جانے کس طرح، اس کی کچھ تصاویر کھینچ لی تھیں، جب وہ واش روم میں گئی تھی۔ فارینہ کا رنگ فق ہو گیا۔ جب کہ فیصل اس کی حالت دیکھ کر اب قہقہے لگا رہا تھا۔

”تمہیں کیا لگا تھا کہ تم ہر بار مجھ سے بچ جاؤ گی۔“ فیصل اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے، اس کے پاس آیا تھا۔ فارینہ پتھر کے بت کی طرح کھڑی تھی۔ فیصل اس کے گر د چکر لگاتے ہوئے، اپنی جیت کے نشے میں کہہ رہا تھا۔

”تم نے میرے ساتھ کام کرنے سے منع کرتے ہوئے، میری رقم منہ پر ماری تھی۔ تمہیں کیا لگتا تھا کہ میں اتنی آسانی سے تمہارا پیچھا چھوڑ دیتا۔ جب کہ میں تمہاری وجہ سے دوسری کمپنی سے بات کر چکا تھا اور وہ اسی شرط پر مانے تھے کہ اگر تم اس فلم میں کام کرو گی تو ہی وہ اشتراک کریں گے مگر تم نے معاہدہ کر کے توڑ دیا۔ تمہاری وجہ سے میرے ہاتھ سے اتنا مہنگا پروجیکٹ نکل گیا اور جو نقصان مجھے اٹھانا پڑا، وہ الگ تھا۔ پھر میں نے بھی دل میں ٹھان لی کہ تمہیں بھی چین سے نہیں رہنے دوں گا اور اسی لیے میرے خریدے گئے آدمی تمہیں فون پر دھمکاتے رہے مگر تم بے وقوف لڑکی، کچھ سمجھ ہی نہیں سکی اور چلی تھیں شہرام سے شادی کرنے۔“

فیصل نے حقارت سے کہا۔ فارینہ کی آنکھوں کے سامنے سے آج سارے پردے ہٹ گئی تھے۔

”میں نے شہرام کی گاڑی کا ایکسیڈنٹ کروایا، مگر اس کی قسمت کے وہ بچ گیا۔ اگر مر جاتا، تو مجھے دہری کامیابی ملتی مگر اس کی قسمت نے ساتھ دیا۔ البتہ اس حادثے سے یہ ہوا کہ تمہاری شادی ملتوی ہو گئی۔ پھر میں نے ایک بڑا منصوبہ بنایا، تمہارے حسن کو ایکسپوز کر کے پیسہ حاصل کرنے کا۔ اس کے لیے تمہیں بہت چالاکی سے

اغوا کروایا مگر تمہارے امیر باپ اور دونوں عاشقوں نے ساری پولیس کو ہائی الرٹ کر دیا تھا۔ مجبوراً تمہیں کچھ دنوں کے لیے اس گندی بستی میں چھپا کر رکھنا پڑا اور اگر ایک دن اور گزر جاتا، تو اگلے دن ایک پرائیویٹ جہاز کے ذریعے تمہیں دبئی کی ایک پارٹی تک پہنچا بھی دینا تھا مگر اس سالے فرنگی کی اولاد، ایڈم نے آکر سارا کام خراب کر دیا۔ مجبوراً مجھے خاموشی سے پیچھے ہٹنا پڑا کیوں کہ پولیس تمہارے اغوا کے کیس کو لے کر بہت تیزی سے کام کر رہی تھی مگر آج تمہاری بد قسمتی اور میری خوش نصیبی نے مجھے بالآخر یہ موقع فراہم کر ہی دیا۔ میرے ہاتھوں میں تمہاری ڈور آگئی ہے۔ اب تم کٹھ پتلی کی طرح میرے اشاروں پر ناپوگی۔ نہیں تو سوچو تمہاری یہ تصاویر اگر سب کے سامنے آگئیں۔ تمہارے باپ نے شرم اور غیرت کی مارے ہی خود کشی کر لینی ہے۔“

”کیا چاہتے ہو تم؟“ فارینہ کو اپنی آواز گہری کھائی سے آتی محسوس ہوئی۔
”یہ کی نا تم نے عقل مندوں والی بات۔“ فیصل کی آنکھوں میں شیطانی چمک ابھری تھی۔

”باقی تو میں تمہیں سب کچھ بعد میں سمجھائوں گا۔ آخر ابھی ہمارا تعلق بہت دور تک جانا ہے۔۔۔ مگر“

فیصل نے اس کے بہت پاس آتے ہوئے کہا۔

”آج کی رات تم میرے ساتھ گزارو۔ اس فارم ہاؤس میں۔“

فیصل نے مخمور لہجے میں کہتے ہوئے اس کے گال کو انگلی سے چھوا۔ فارینہ بدک کر فوراً پیچھے ہٹی۔

”یہ نہیں ہو سکتا۔“ فارینہ غصے سے بولی۔

”سوچ لو! اگر میری بات نہیں مانو گی تو تمہارے حسن کے جلوے ہر طرف ہوں گے۔ ویسے سچ میں تم سر سے پائوں تک قیامت ہو۔“

فیصل نے اسے آنکھ مارتے ہوئے کہا۔ فارینہ کو اس کے مکروہ چہرے سے شدید گھن آرہی تھی۔ اسی وقت فیصل نے ہاتھ بڑھا کر اسے اپنے بازوؤں میں جکڑ لیا۔ فارینہ خود کو چھڑانے کے لیے زور لگانے لگی۔ اسی وقت ایک بجلی سی کوندی، فیصل کے منہ پر ایک زور دار مکا پڑا اور وہ الٹ کر پیچھے کی طرف جاگرا۔ اس کے منہ اور ناک سے خون بہ نکلا تھا۔ فارینہ نے اپنی چیخ کو روکتے ہوئے منہ پر ہاتھ رکھ لیا اور ایڈم کو فیصل پر وحشیانہ تشدد کرتے ہوئے دیکھنے لگی۔ وہ اسے مار رہا تھا۔ ہاتھوں سے، پائوں سے، فیصل بچنے کی کوشش میں زمین پر لڑھک رہا تھا، مگر ایڈم پر کوئی جنون سوار تھا۔

”اس انگلی سے تم نے، اس کے گال کو چھوا تھا نا۔“ ایڈم نے جنونی انداز میں کہتے ہوئے اس کی انگلی توڑ دی۔ فیصل کے منہ سے درد ناک چیخ نکلی تھی۔

”یہ ہاتھ اٹھے تھے، اس کی پاک دامنی کی طرف۔“ ایڈم نے اس کے دونوں ہاتھوں پر ضربیں ماریں۔ فیصل چیختے ہوئے اس سے معافی مانگ رہا تھا مگر وہ کچھ نہیں سن رہا تھا۔

”ان آنکھوں سے تو نے اسے بے پردہ دیکھا تھا نا۔“

ایڈم نے میز پر رکھا کرسٹل کا گلدان زور سے اپنے ہاتھ پر مارا اور اس کے نوکیلے سرے اس کی دونوں آنکھوں میں کھبو دیے۔ خود اس کے ہاتھ سے بھی خون بہ رہا تھا مگر اس پر ایک جنون سوار تھا۔

اسی وقت، نشاء نے کمرے کا دروازہ کھولا اور اندر کا منظر دیکھ کر چیخنے لگی۔ وہ اتنی دیر تک، فارینہ کے واپس نہ آنے پر اسے بلانے کے لیے یہاں آئی تو اس کے ہوش اڑ گئے۔ وہ فوراً واپس بھاگی اور سکیورٹی کو آوازیں دینے لگی۔ کچھ دیر میں وہاں لوگوں کا ہجوم جمع ہو گیا تھا۔ فارینہ کی سکیورٹی پر مامور لوگ بھی بھاگے آئے۔ سب صورت حال کو سمجھنے کی کوشش کر رہے تھے۔ فارینہ ڈری سہمی ایک کونے میں کھڑی تھی اور ایڈم سے مار کھا کھا کر فیصل بے حال ہو چکا تھا۔ ایڈم نے اس

کی وہ انگلی ہی توڑ دی تھی جس سے اس نے فارینہ کے گال کو چھوا تھا، فارینہ اس کا جنوں دیکھ رہی تھی، اسے بہت سال پہلے کا ایک واقعہ یاد آرہا تھا۔ تب بھی کسی نے اسی طرح، اپنے سامنے والے کو پیٹا تھا اور اس دن بھی وجہ فارینہ ہی بنی تھی۔ فارینہ گم صم کھڑی تھی۔ اس سے لوگ سوال پوچھ رہے تھے مگر اسے کچھ سمجھ نہیں آرہی تھی۔ بہ مشکل ایڈم کو کئی لوگوں نے پکڑ کر فیصل سے الگ کیا۔ نہیں تو آج وہ اس کی جان ہی لے لیتا۔ کسی نے پولیس کو اطلاع بھی کر دی تھی۔ پولیس نے آتے ہی ایڈم کو حراست میں لیا، فیصل کی حالت بہت خراب تھی۔ اسے فوراً ایمبولینس کے ذریعے ہسپتال پہنچایا گیا۔ پولیس فارینہ اور نشاء کو بھی چشم دید گواہ کے طور پر ساتھ لے گئی۔

پولیس اسٹیشن میں ان کے پہنچنے تک، مرتضیٰ ہاشم اور شہرام بھی پہنچ چکے تھے۔ مرتضیٰ ہاشم کے سکیورٹی آفیسر نے اسے فون کر کے سارے واقعے کی اطلاع دی تھی۔ وہ فوراً شہرام کو لے کر وہاں پہنچے۔ ایڈم کا بیان ریکارڈ کیا جا رہا تھا۔ وہاں فارینہ اور نشاء بھی تھیں۔

ایڈم نے ایک چھوٹا سا وائس ریکارڈ نکال کر میز پر رکھا اور اسے آن کر دیا۔ فیصل کی آواز میں اعترافِ جرم تھا۔ جو وہ فارینہ سے کہہ رہا تھا۔ فارینہ کا رنگ اڑ گیا۔

اس کی عزت سب کے سامنے مٹی میں ملنے والی تھی۔ کبھی ایسے ہی اس نے سب کے سامنے ایڈم کو ذلیل کیا تھا۔ تھپڑ مارا تھا، ناخنوں سے اسے زخمی کر دیا تھا اور آج اس کی باری تھی۔ آج بازی ایڈم کے ہاتھ میں تھی جس کے سامنے وہ ایسے عیاں ہوئی تھی کہ نظریں ملانے کے قابل بھی نہیں رہی تھی۔ اب باپ اور شہرام کے سامنے بھی اس کی عزت دو کوڑی کی ہونے والی تھی۔

”کاش یہ زمین پھٹے اور میں اس میں سما جاؤں۔“

فارینہ نے آنکھیں بند کرتے ہوئے دل میں دعا کی۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ قیامت کا لمحہ قریب تھا، مگر اسی وقت آواز آنا رک گئی۔ فارینہ نے چونک کر سر اٹھایا۔ فیصل کے اعترافِ جرم کے علاوہ اور کچھ نہیں تھا اس وائس ریکارڈنگ میں۔ فارینہ نے حیرت سے ایڈم کی طرف دیکھا جو بے نیازی سے کھڑا، پولیس کی باقی کارروائی دیکھ رہا تھا۔

”فیصل کے ساتھ میرے ذاتی اختلافات تھے۔ اسی لیے ہم دونوں ایک دوسرے کی تاک میں لگے رہتے تھے اور قسمت سے میرے ہاتھ یہ ثبوت لگ گیا۔ اسی لیے ہم میں ہاتھ پائی ہوئی تھی۔“

شہرام نے آگے ہو کر کہا، تو انسپکٹر نے سوچتے ہوئے اثبات میں سر ہلا دیا۔ ایڈم کا بازو شدید زخمی تو تھا ہی اور اس کی مرہم پٹی ہونا بھی ضروری تھی۔

”ٹھیک ہے۔ میں اتنا تعاون کرنے پر تیار ہوں مگر پلیز صبح ہوتے ہی قانونی کارروائی کر لیجیے گا۔ نہیں تو میرے لیے مسئلہ بن جائے گا۔“ انسپکٹر نے یاد دہانی کروائی۔ وہ سب وہاں سے نکلے۔ فارینہ اور نشاء مرتضیٰ ہاشم کے ساتھ کار میں بیٹھ گئیں۔ جب کہ شہرام ایڈم کو سہارا دیے اپنی کار کی طرف بڑھ گیا۔ اس کے بازو سے بہت خون بہ چکا تھا۔ ایڈم نے فرنٹ سیٹ پر بیٹھتے ہی، سیٹ سے ٹیک لگا کر آنکھیں موند لیں۔ اس کے چہرے پر تھکن اور تکلیف کے آثار واضح تھے۔ فارینہ نے اپنی آنکھوں میں نم پھیلتا محسوس کیا تھا۔ آج پہلی بار وہ اس شخص کے لیے روئی تھی جس سے ہمیشہ اس نے شدید نفرت کی تھی اور یہ تب کی بات ہے جب وہ بارہ سال کی بچی تھی۔

اور اس وقت کا وہ تیرہ سال کا آدم کا ایڈم تھا۔

☆...☆...☆

”آدم! آج تمہاری سالگرہ ہے نا؟“

ساری کلاس بریک میں باہر گئی تھی، مگر وہ اپنی کلاس ہی میں موجود تھا۔ آج بھی اسے لنچ میں سب کا بچا ہوا ناشتا نصیب ہوا تھا جو اس نے خاموشی سے اپنے پرانے لنچ باکس میں رکھ لیا تھا۔ کیوں کہ روز کی طرح آج بھی اپنے ناشتے کے انتظار میں وہ لیٹ ہو چکا تھا۔ ابا اسی اسکول میں چہر اسی تھا۔ خدا بخش کے باقی چار بچے سرکاری اسکول میں پڑھتے تھے۔ آدم کو وہ اس انگلش میڈیم اسکول میں اس لیے لے کر آیا تھا کیوں کہ سرکاری اسکول میں اسے داخلہ دینے سے منع کر دیا گیا تھا۔ جب کہ جس اسکول میں خدا بخش کام کرتا تھا، اس میں بہت سے عیسائی کمیونیٹی کے بچے اور اساتذہ بھی شامل تھے۔ اس لیے اس ادارے کا ماحول ملا جلا اور کچھ آزاد قسم کا تھا۔ کچھ خدا بخش نے، سفارش کے لیے بہت سی ٹیچرز کی منتیں بھی کی تھیں جو خدا ترسی اور دوسروں کی مدد کرنے میں مشہور تھیں۔ ان میں ایک مسز مار تھا بھی تھیں جو خدا بخش کو اس کی ایمان داری اور اچھی فطرت کی وجہ سے بہت پسند کرتی تھیں اور آدم کو اس اسکول میں داخلہ دلانے میں ان کا خاص کردار تھا۔

آدم یہاں آکر پہلے تو بہت خوش ہوا تھا۔ ابا کے دوسرے بچوں سے اس کی جان چاہے کچھ دیر کے لیے ہی سہی مگر چھوٹ گئی تھی۔ یہاں اس نے کچھ دوست بنانے کی کوشش کی جو پہلے پہل تو کامیاب ہوئی، پھر اس کے بارے میں سچ جانتے ہی

سب پیچھے ہٹ جاتے۔ یہ سچ بھی اس کے چال چلن سے زیادہ ، ابا کی بیوی کلثوم نے سب کو بتا یا تھا۔ وہ اتنے بڑے اسکول میں اس کا پڑھنا برداشت نہیں کر سکی۔ اس لیے ایک دن اسکول فنکشن پر ضد کر کے اپنے بچوں کے ساتھ آئی اور جاتے جاتے وہ لوگ اس کی راہ میں کانٹے بچھا گئے۔ یہ بات بہت تیزی سے سارے اسکول میں پھیلی۔ سب آدم سے دور دور بھاگتے اور جہاں جہاں سے وہ گزرتا ، وہ اس کی طرف ایسے دیکھتے جیسے وہ کوئی عجوبہ ہو۔ آدم یہ صورت حال دیکھ کر سب سے الگ تھلگ رہنے لگا۔ کلاس میں سب سے آخری قطار میں بیٹھتا اور بریک ٹائم میں بھی کلاس سے باہر نہیں نکلتا تھا۔

انہی دنوں ان کی کلاس میں ایک نئی لڑکی کا داخلہ ہوا۔ جو بہت زیادہ شرارتی اور نک چڑھی تھی۔ کلاس میں اس کی بہت کم لوگوں سے بنتی تھی۔ سنا تھا کہ بہت امیر باپ کی انتہائی لاڈلی بیٹی ہے جس کا باپ اس اسکول کی ٹرسٹی میں بھی شامل تھا۔ اس کے سب دوست بھی اس کی طرح اونچے گھرانوں کے چشم و چراغ تھے۔ ایک دن کلاس کی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے، وہ بہ مشکل اپنا بھاری بیگ اٹھا کر آرہی تھی، جب آدم نے اسے مدد کی آفر کی۔ تب وہ لڑکی آدم کے بارے میں کچھ نہیں جانتی تھی۔ اس دن گرمی بھی بہت تھی۔ اس لڑکی نے اپنا بیگ آدم کو پکڑا دیا جو بہت

مشکل سے اپنا اور اس کا بیگ اٹھا کر کلاس روم تک پہنچا۔ اس دن پہلی بار اس لڑکی نے کسی سے مسکرا کر بات کی اور اس کا شکریہ ادا کیا۔ کچھ دن ان کے درمیان دوستی چلی پھر وہ بھی بہت سی نظروں میں چھنے لگی۔ اس کے دوستوں نے کچھ اس طرح آدم کے بارے میں اس کی برین واشنگ کی کہ وہ آدم کو دیکھتے ہی اس سے بدکنے لگیا اور یہاں تک کہ آدم کی موجودگی سے بھی اسے سخت چڑھنے لگی۔ وہ نازک مزاج، شہزادیوں کی طرح پلی بڑھی لڑکی، اپنے آس پاس بھی ہر چیز بہترین سے بہترین چاہتی تھی۔ اس کے سب دوست، اسی کی طرح مکمل اور بہترین تھے۔ جب کہ آدم اپنے ادھورے وجود کا بوجھ لیے، نہ صرف اپنے لیے بلکہ معاشرے میں بھی بوجھ تھا۔ آدم سے اس کی چڑ بڑھتے بڑھتے نفرت میں بدل گئی۔ اب وہ اپنے دوستوں کے ساتھ مل کر ہر طرح سے اسے تکلیف اور اذیت پہنچانا اپنا فرض سمجھتی تھی۔ آدم کے لیے اس کی لہجے میں اتنی حقارت اور نفرت ہوتی تھی کہ آدم خود گھبرا جاتا تھا۔

مگر یہ بھی سچ تھا کہ پریوں جیسی وہ لڑکی اسے پہلی نظر ہی میں بہت اچھی لگی تھی۔ اسی لیے آدم نے اسے پہلے دن اس کا بیگ اٹھانے کی پیش کش کی تھی۔ وہ اپنا بیگ

بھی مشکل سے اٹھاتا تھا۔ اس نے خواہش کی تھی کہ ”کاش وہ اس سے دوستی کر لے۔“ اس کی یہ خواہش پوری ضرور ہوئی مگر بہت تھوڑے وقت کے لیے۔ آج اس کی سالگرہ تھی۔ یہ وہ دن تھا جو اس کے لیے تو کیا، اسے مرنے کے لیے چھوڑ دینے والے والدین کے لیے بھی قابلِ شرم تھا، مگر خدا بخش نہ جانے کس مٹی کا بنا ہوا تھا۔ وہ اس کمزور جان سے اتنی محبت کرتا تھا جیسے یہ اس کی اپنی اولاد ہو اور یہ محبت بھی اس لمحے اس کے دل میں جاگی تھی جب خان زادہ شمشیر نے نوزائیدہ بچے کو اس کی گود میں دیتے ہوئے، یہاں سے کہیں دور لے جانے کا حکم دیا تھا۔

”چاہے تو کسی یتیم خانے کے دروازے کے سامنے رکھ دینا یا کوڑے دان میں پھینک دینا۔ اگر اس کی قسمت میں جینا ہو گا تو یہ کسی آوارہ جانور کے نوکیلے دانتوں اور پنوں سے بچ جائے گا۔“ ساتھ ہی انہوں نے نوٹوں کی ایک گڈی اسے دیتے ہوئے کہا تھا کہ دوبارہ پلٹ کر یہاں مت آنا۔ اسے وہاں کام کرتے ہوئے ایک سال ہی ہوا تھا۔ وہ اپنے کام سے کام رکھنے والا سیدھا سادھا بندہ تھا۔

خدا بخش حکم کی تعمیل کرنے وہاں سے نکلا تو تھا مگر کچھ دیر میں ہی اس ننھے وجود کی گرمی اور حرکت نے اسے اپنا ارادہ بدلنے پر مجبور کر دیا۔ وہ خود چار بچوں کا

باپ تھا اور روزگار کے سلسلے میں در در کی ٹھوکریں کھاتا یہاں تک پہنچا تھا۔ اسے اپنے بچوں سے جنونی محبت تھی۔ اس کی بیوی کلثوم ایک سخت مزاج عورت تھی۔ وہ جتنی زبان کی کرخت تھی، اس کا دل بھی اتنا ہی سخت تھا۔ خدا بخش جب ایک بچے کو اپنی گود میں اٹھائے، چھپتا، چھپاتا اپنے شہر، اپنے گھر پہنچا، تو اس کی بیوی نے کھرام اٹھا دیا۔

”خدا بخش! کچھ عقل کر اگر کسی کو مفت کی کھلانے کا اتنا شوق ہو رہا تھا تو کم از کم یہ تو دیکھ لیتا کہ کل وہ تجھے کچھ دے بھی سکے گا یا نہیں۔ تو ایک بچہ، وہ بھی جو اپنے وجود میں ادھورا ہے، اس کی ذمہ داری اٹھانے چلا ہے۔ یہ جس کا گند ہے اسے ہی واپس دے آ نہیں تو اس کی نسل کے بہت لوگ ہر جگہ موجود ہوتے ہیں۔ انہیں سوئپ دے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ خوش ہو کر تجھے کچھ پیسے بھی دے دیں۔“

”خبردار دوبارہ اگر ایسی کوئی بات کی تو۔ دیکھ کلثوم میں نے ہمیشہ تیری مانی اور سنی ہے مگر اس بچے کی بار ہر گز نہیں اور اگر تُو نے کوئی ایسا ویسا قدم اٹھانے کا سوچا، تو میں اپنے چاروں بچوں کی قسم کھاتا ہوں، تجھے طلاق دے دوں گا اور تُو اچھی

طرح جانتی ہے کہ میرے بچے میری کمزوری ہیں۔ میں ان کی جھوٹی قسم کبھی نہیں کھائوں گا۔”

خدا بخش نے سختی سے کہا تو کلثوم دنگ رہ گئی۔ اس وقت تو وہ چپ کر گئی مگر اُس کے دل میں اس ننھے سے بچے کے خلاف پلٹی نفرت میں روز بہ روز اضافہ ہوتا گیا۔ خدا بخش نے اس بچے کے مختلف نام رکھے مگر ہر بار کلثوم اس کا مذاق اڑاتی، تضحیک کا نشانہ بناتی۔ تنگ آکر خدا بخش نے اس کا نام آدم رکھ دیا۔

”نسل انسانی کی ابتدا حضرت آدم اور اماں حوا سے ہوئی تھی۔ اس کی اصل شناخت کیا ہے میں نہیں جانتا مگر اسی نسبت سے میں نے اس کا نام آدم رکھ دیا ہے جو بھی ہے، ہے تو اسی رب کی تخلیق نا۔

خدا بخش نے جو بات اپنی چھوٹی سوچ وہ سمجھ کے مطابق کہی تھی، وہ عقل رکھنے والے کے منہ پر طمانچہ تھا۔ آدم کو ایک چھت تو میسر ہو گئی مگر اس کی زندگی جانوروں سے بھی بدتر تھی۔ چھوٹا تھا تو بھوک کی شدت سے روتا رہتا، مگر کلثوم اسے کچھ بھی دینے کے بجائے، آتے جاتے مارنا نہیں بھولتی تھی۔ وہ خدا بخش کی بات کا زہر دل میں رکھتے ہوئے، انسان سے ناگن بن گئی تھی۔ اتنی زہریلی کہ خود اپنا وجود بھی نیلا پڑ گیا مگر اس ننھے سے بچے سے اس کی نفرت کم نہیں ہوتی تھی۔

باقی بچے سامنے بیٹھے کھاتے، پیتے اور وہ بھوک سے روتا رہتا۔ خدا بخش نے ایک بار یہ دیکھ لیا، تو اس کا دل کانپ اٹھا۔ اس دن وہ دو سال کے آدم کو گود میں لے کر پھوٹ پھوٹ کر رویا۔ جس کی حالت گھر میں رکھے پالتو جانور سے بھی بدتر تھی۔ خدا بخش نے کلثوم سے کوئی شکوہ یا گلا کرنے کے بجائے، آدم کو اپنے ساتھ کام پر لے جانا شروع کر دیا۔ ان دنوں وہ ایک درمیانے درجے کے ڈھابے پر بیرے کا کام کرتا تھا۔ آدم، کو ایک کونے میں بٹھا کر وہ کوئی بھی چیز زمین سے اٹھا کر اسے پکڑا دیتا۔ کیوں کہ وہ اس کے لیے فی الحال کوئی بھی کھلونا خرید نہیں سکتا تھا۔ آدم کو بیٹھا کر وہ اس کے ارد گرد ٹوٹی کرسی یا کوئی فالتو میز رکھ دیتا تاکہ وہ کہیں چلا نہ جائے یا کسی کی اس پر نظر نہ پڑے۔ آدم نہایت متعصوم اور خوبصورت تھا مگر کمزور بہت تھا۔ اکثر خدا بخش کے ساتھ کام کرنے والے لوگ بھی اسے پیار کرتے اور اس کا خیال رکھتے تھے۔ ہوٹل کا مالک ریاض بھی آدم کی آمد سے بے خبر نہیں تھا، مگر اس نے کچھ بھی کہنے سے گریز کیا۔ کئی بار ایسا ہوا کہ خدا بخش کسی بیماری یا تکلیف کی وجہ سے کام پر نہیں جاسکا یا کسی وجہ سے آدم کو اپنے ساتھ نہیں لاسکا۔ تب ایک دن اس کے مالک ریاض نے اسے اپنے پاس بلا کر کہا کہ

”کل سے آدم کو اپنے ساتھ ضرور لے کر آنا۔“

”کیا ہوا صاحب! کیا اس سے کوئی غلطی ہو گئی ہے۔“ خدا بخش ڈر گیا کہ شاید اس کی روزی روٹی کا یہ ذریعہ بھی بند ہونے لگا ہے۔

”تمہارا بچہ بہت سعد ہے خدا بخش۔ میں نے کئی بار نوٹ کیا ہے۔ جب وہ موجود ہوتا ہے، تو اس دن آنے والے گاہکوں کی تعداد، عام دنوں کے مقابلے میں دگنی ہوتی ہے۔ ایسا پہلے کبھی سال میں بہ مشکل ایک یا دو بار ہوتا تھا، مگر اب تو اکثر ایسا ہونے لگا ہے اور جس دن وہ نہیں آتا، سب معمول کے مطابق ہوتا ہے۔ اب یہ اتفاق ہے یا کچھ اور میں نہیں جانتا۔“

خدا بخش یہ سن کر حیران رہ گیا، مگر اس نے کچھ کہا نہیں۔ اگر آدم کو اس وجہ سے محبت اور تحفظ ملتا ہے، تو اسے کچھ اور نہیں چاہیے تھا۔ اس طرح دن گزرتے رہے اور آدم چھ سال کا ہو گیا۔ جب خدا بخش نے اسے قریب کے ایک سرکاری اسکول میں داخل کر دیا۔

اس ڈھابے کے مالک نے اس وقت تک ترقی کر کے اپنے دو ہوٹل تعمیر کر لیے تھے، مگر اس کے باوجود وہ آدم سے بہت محبت کرتا تھا اور اس کے اسکول کی فیس سے لے کر سب خرچہ وہ دیتا تھا۔ یہ بات جہاں خدا بخش کے لیے تسلی بخش تھی، کلثوم کو انگاروں پر چلاتی تھی۔ اس کے بچے اس انعام سے کیوں محروم رہیں، یہ

سوچ سوچ کر ہی وہ جلتی رہتی تھی۔ بچپن میں آدم نے دوسرے بچوں کی دیکھا دیکھی اسے ”امی“ کہہ کر مخاطب کیا، تو کلثوم نے ایک ٹانگ اس کے پیٹ پر اتنے زور سے رسید کی کہ وہ دور جا گرا۔

”خبردار جو آئندہ مجھے امی کہا۔ تیرے جیسا ناسور میری کوکھ سے پیدا نہیں ہو سکتا ہے۔“

اس وقت آدم کو اس بات کی سمجھ نہیں آئی مگر وہ خدا بخش سے گلے لگ کر بہت رویا تھا۔

”ابا! اماں مجھے پیار نہیں کرتی ہیں۔ کیا میں ان کا بچہ نہیں ہوں؟“

پانچ سالہ آدم نے معصومیت سے سوال کیا۔ خدا بخش نے اس کا بھیگا چہرہ صاف کیا اور اس کی پیشانی چومتے ہوئے کہا۔

”نہیں میرے بچے۔ وہ سچ میں تمہاری ماں نہیں ہے۔ اس لیے تم اسے امی مت کہا کرو۔ وہ صرف اپنے بچوں کی ماں ہے۔ تمہارا ہر رشتہ صرف مجھ سے بنتا ہے۔ اس لیے وعدہ کرو آئندہ کسی سے ایسی امید نہیں رکھو گے اور نہ اداس ہو گے۔“

خدا بخش نے اپنا ہاتھ پھیلایا تو آدم نے فوراً اس پر اپنا چھوٹا سا ہاتھ رکھ دیا۔ پھر دل میں ہزار سوال رکھنے کے باوجود بھی اسے دوبارہ کسی سے شکوہ نہیں کیا۔ وہ صبح

ابا کے ساتھ اسکول جاتا اور دوپہر گھر آ کر ابا کا انتظار کرتا رہتا۔ کھانے کو اسے کبھی ملتا تھا اور کبھی نہیں۔ کلثوم اب اسے مارتی تو نہیں تھی مگر وہ اس سے بات بھی نہیں کرتی تھی۔ شاید اتنے سالوں میں اس نے بالآخر اسے گھر کے فالتو سامان کی طرح قبول کر ہی لیا تھا۔ اس لیے اپنے بچوں کا بچا کھچا اس کے آگے ایسے رکھتی تھی جیسے وہ جانور ہو۔ آدم خاموشی سے کبھی کھا لیتا اور کبھی واپس رکھ آتا۔ خدا بخش کے دوسرے بچے اس سے عمر میں بڑے تھے اور ماں کی طرح ہی اس سے چڑھتے تھے۔ اس لیے اس کے بارے میں سب کو بدگمان کرتے رہتے تھے۔ اسی وجہ سے آدم کو تین بار مختلف اسکولوں سے نکال دیا گیا۔ جہاں خدا بخش کے بچے اس کے ساتھ پڑھتے تھے۔ وجہ ایک ہی ہوتی۔

”اس کو یہاں سے لے جائیں۔ یہ سارا ماحول خراب کر دے گا۔ ہم بچوں کو تعلیم دیتے ہیں۔ خواجہ سرائوں کو نہیں!“

کہیں بہت نرمی سے اور کہیں بہت حقارت اور تحقیر سے جواب دیا جاتا تھا۔ ”مگر یہ بھی تو بچہ ہی ہے نا۔ کیا اس کے منہ پر لکھا ہوا ہے کہ خواجہ سرائے۔“ خدا بخش منت کرتا، مگر سامنے والوں کے پاس سو بہانے ہوتے۔ خدا بخش اکثر جب مختلف خواجہ سرائوں کو، مانگتے یا ناچتے ہوئے دیکھتا تو سوچتا کہ کیا خواجہ سرائوں کی

اس حالت کا اصل ذمہ دار ہمارا معاشرہ ہے؟ جو کسی بھی طرح، انہیں اپنے درمیان جگہ نہیں دیتا۔ ایک اچھوت کی طرح ان سے برتاؤ کرتا ہے۔ ان لوگوں کو عزت سے جینے کا حق کیوں نہیں ملتا؟ اگر سب یہ مانتے ہیں کہ انہیں بھی پیدا کرنے والا خدا ہے، تو پھر انہیں تضحیک کا نشانہ کیوں بنایا جاتا ہے؟ کیوں ان سے ملنا، ان سے کوئی بھی تعلق رکھنا، عام لوگ تو کیا، ان کے اپنے خون کے رشتے بھی نہیں رکھتے؟ پھر خدا نے انہیں زمین پر کیوں بھیجا ہے؟ اگر وہ ایک انسان کا درجہ بھی نہیں پاسکتے ہیں۔ ان کی پیدائش کا مقصد کیا ہے؟ یہ کیوں ہیں اور کس لیے ہیں؟ خدا بخش جتنا سوچتا، الجھتا ہی جاتا، مگر کبھی کسی حل تک نہیں پہنچ پاتا تھا۔

ان دنوں خدا بخش کو ایک مشہور اسکول میں جاب مل گئی اور اس نے یہ ہی بہتر سمجھا کہ آدم کو اپنے پاس ہی داخل کروالے تاکہ اس کے بچے، آدم کا سچ بتا کر اسے سب کے سامنے ذلیل و رسوا نہ کر سکیں۔ آدم یہاں آ کر پہلے سے کچھ بہتر صورت حال میں تھا، مگر بہت جلد وہ سب کی نظروں میں آنے لگا۔ اس کے بولنے کا تھوڑا سا مختلف انداز، نسوانیت لیا چہرہ، اس کی چال، سب کچھ اس کے راز کھولنے لگا تھا۔ باقی کسر خدا بخش کی بیوی نے پوری کر دی۔ اس نے یہ بات، خدا بخش کے ساتھ اسکول میں کام کرنے والی آیا کو رازدارانہ طور پر بھی بتا دی کیوں کہ اس

دن فنکشن پر یہ راز صرف اسکول کے بچوں تک ہی رہا۔ وہ چاہتی تھی کہ یہ بات اسکول کی ٹیچرز کے کان تک بھی جائے تاکہ آدم کو یہاں سے بھی نکال دیا جائے اور پھر اس آیا نے نیچے سے لے کر اوپر تک یہ بات پھیلا دی۔ اس سے پہلے کہ اس بات پر کوئی ایکشن لیا جاتا۔ مسز مارتھانے اس پر اسٹینڈ لے لیا۔ اس نے آدم کے اصلیت جانتے ہوئے ہی اپنی سفارش پر داخلہ کروایا تھا۔ وہ پرنسپل کے سامنے دلیل لے کر پہنچ گئی اور انہیں قائل کر کے ہی لوٹی تھی۔ مسز مارتھانے ایک عمر، اس اسکول میں کام کرتے ہوئے گزاری تھی۔ اس لیے ان کی بات کا رد کرنا آسان نہیں تھا۔ پھر جس عیسائی کمیونٹی سے اس اسکول کو فنڈز ملتے تھے، مسز مارتھانے سے بگاڑنے کے بعد، وہ بھی ملنا ممکن نہیں رہتا۔ مسز مارتھانے کی سروس کا صرف ایک سال رہ گیا تھا۔ پھر وہ اپنے ملک واپس جانے والی تھیں۔ اس لیے پرنسپل نے وقتی خاموشی اختیار کر لی اور اس طرح آدم اس اسکول میں تعلیم حاصل کرنے لگا، مگر اسکول کے بچوں کا رویہ اس کے ساتھ ویسا ہی ہنک آمیز ہی رہا۔ وہ بڑا ہونے کے ساتھ ساتھ، بہت سنجیدہ اور خود میں گم رہنے لگا تھا۔ اس نے اپنے بولنے، اٹھنے، بیٹھنے اور چلنے کے انداز میں خدا بخش کے کہنے اور دوسرے بچوں کو دیکھنے کے بعد تبدیلی لانی شروع کر دی جس میں وہ کافی حد تک کامیاب بھی ہو گیا، مگر پھر بھی

اس کا سچ، اس کا پیچھا نہیں چھوڑتا تھا۔ ان دنوں خدا بخش اسے، محلے کی ایک بوڑھی اماں کے پاس قرآن کی تعلیم حاصل کرنے کے لیے بھی بھیجنے لگا۔ آدم، اس کی بات بلا کسی چوں چرا کے مانتا تھا۔ سارے دن کی محنت اور مشقت کے بعد، رات کو خدا بخش جب سونے کے لیے چارپائی پر لیٹتا، تو آدم خاموشی سے اس کے پاؤں کی طرف بیٹھ کر اپنے ننھے ننھے ہاتھوں سے دبانے لگتا۔ خدا بخش اسے منع کرتا، اپنے پاؤں سمیٹ لیتا، مگر وہ اپنے کام میں لگا رہتا۔

”ابا! مجھے منع مت کیا کریں۔ مجھے آپ کی خدمت کر کے سکون ملتا ہے۔“ وہ معصوم چہرے پر سنجیدگی طاری کر کے کہتا، تو خدا بخش کی آنکھیں نم ہو جاتیں۔ اسے لگتا تھا کہ اس نے ساری زندگی میں بس یہ ہی ”کمایا“ ہے۔ باقی سب مایا ہے۔ اس کی بیوی کی طرح، اس کے بچے بھی باپ سے بدگماں اور چڑے ہوئے رہتے تھے۔ وقت چاہے جیسا بھی ہو تیز رفتاری کے ساتھ گزر ہی جاتا ہے۔ آدم جو پہلے پہلے اسکول میں عجبہ کے طور پر جانا جاتا تھا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کے وجود پر سے سب کی توجہ ہٹتی جا رہی تھی۔ ہاں وہ تب سب کی نظروں میں چھپتا تھا، جب کلاس میں سب سے خاموش اور پیچھے بیٹھنے والا بچہ، امتحان میں اوّل پوزیشن لیتا تھا۔ یہ بات سب کے لیے بہت حیران کن تھی۔ نہ تو اس پر کسی ٹیچر کی

خاص نظر کرم تھی اور نہ ہی وہ دوسرے بچوں کی طرح مہنگی مہنگی ٹیوشن لیتا تھا۔ وہ بس دھیان سے کلاس میں پڑھایا، سنتا اور سمجھتا تھا۔ پہلے پہل اس پر نقل کرنے کا بھی شک کیا گیا مگر سخت سے سخت نگرانی کے باوجود اس کے پاس سے کبھی کوئی نقل شدہ مواد نہیں ملا۔ اگر اس کے وجود میں قدرت نے کوئی کمی رکھی تھی تو، اسے ذہانت سے بھی نوازا گیا تھا مگر ایک خواجہ سرا کی پہلی پوزیشن کا اعلان کرتے ہوئے، اسے اسٹیج پر بلانا بہت عجیب سا لگتا تھا۔ اس کا حل یہ نکالا گیا کہ اس کی پوزیشن تو برقرار رکھی جاتی مگر اسٹیج پر ٹرائی اور رزلٹ لینے کے لیے خدا بخش کو بلایا جاتا۔ خدا بخش کانپتے ہاتھ پاؤں کے ساتھ اسٹیج پر جاتا۔ یہ بھی صرف ایک سے دو بار ہوا تھا، پھر اس کے ساتھ اکثر پہلی پوزیشن پر ایک بچہ اور بھی ہوتا جسے اسٹیج پر بلایا جاتا اور آدم کو رزلٹ کارڈ اور شیلڈ بعد میں دی جاتی تھی۔ خدا بخش، آدم کا اترا چہرہ دیکھتا، تو اسے تسلی دیتا۔

”تمہاری کامیابی، کسی بھی ٹرائی یا شیلڈ کی محتاج نہیں ہے آدم۔ تمہیں ایک جنگ لڑنی ہے، اپنے بقا کی جنگ۔ اس معاشرے سے اپنا حق وصول کرنا ہے اور اس کے لیے تمہیں اپنا دل بہت بڑا کرنا پڑے گا۔“

مسز مارتھانے ایک بار اسے منہ بسورتے اور خدا بخش سے سوال کرتے سنا، تو اس کے پاس آکر کر نرمی سے بولی تھیں۔

”آپ ٹھیک کہتی ہیں میڈم صاحبہ! مگر ابھی یہ بچہ ہے نا، نادان کچھ سمجھتا نہیں، اسی لیے ضد کر بیٹھتا ہے۔“

خدا بخش فوراً اس کے سامنے ڈھال بن کر کھڑا ہو جاتا۔

”یہی تو افسوس کی بات ہے خدا بخش! یہ بچہ ہو کر بھی رویے پڑھنے اور پرکھنے میں، کسی بوڑھے شخص کی طرح ماہر ہو گیا ہے۔ اس نے بھلا بچپن کب دیکھا اور محسوس کیا ہے۔“ مسز مارتھادکھی لہجے میں کہتی تھیں۔ مسز مارتھادیم کو اسکول میں مختلف ہونے والی ایکٹیویٹیز میں شامل کرتی رہتی تھیں۔ اسپورٹس سے زیادہ آدم کو اسٹیج پر مختلف کرداروں میں ڈھلانا اور پرفارم کرنا زیادہ پسند تھا، مگر وہ مسز مارتھادکھی کی ہدایت پر ہر مقابلے میں حصہ ضرور لیتا تھا۔ یہ دراصل اس کی تربیت کرنے اور اسے مضبوط بنانے کا ایک طریقہ تھا۔ اس نے مختلف ٹیلو اور ڈراموں میں جو جو کردار بھی کیے، وہ بہت سراہے گئے۔ اس طرح نہ چاہتے ہوئے بھی آدم کو ایسے رول میں کاسٹ کرنا پڑتا، جو کسی اور کے بس کی بات نہیں ہوتا تھا۔ اس طرح آدم اپنی خدا داد صلاحیتوں کی بنا پر تھوڑی بہت جگہ بنانے میں کامیاب ہو جاتا، مگر پھر بھی اسے آج

تک کسی کی اچھی دوستی نہیں ملی تھی۔ فارینہ کو دیکھ کر اس کے دل نے پہلی بار شدت سے یہ خواہش کی تھی کہ یہ نک چڑھی سی لڑکی اس کی دوست بن جائے۔ کچھ دن اسے یہ سعادت ملی بھی مگر پھر وہ بھی سب کی باتوں میں آکر اس سے دور ہوتی گئی بلکہ اب اکثر اسے تنگ کرنے، چھیڑنے اور مذاق اڑانے والے بچوں میں وہ بھی شامل ہوتی۔

یہ بھی اس دن کی بات ہے جب خدا بخش نے چھٹی کے وقت اس سے وعدہ کیا کہ کل اس کی سالگرہ والے دن، وہ اسے پارک لے کر جائے گا اور آئس کریم بھی لے کر دے گا۔ یہ بات پاس کھڑے اس کی کلاس کے کچھ بچوں نے سن لی اور انہوں نے فوراً ہی ایک منصوبہ بنا لیا۔ اگلے دن وہ خاموشی سے بریک ٹائم میں اپنے ساتھ لایا لٹچ کھا رہا تھا۔ جب فارینہ اس کی پاس آئی۔ آدم اسے دیکھ کر پہلے تو حیران ہوا، پھر ایک دم ہی خوشی سے بھرپور لہجے میں بولا۔

”فارینہ تم!“ آدم نے اپنے تھوڑے سے بچے لٹچ باکس کی طرف دیکھا۔ سوکھی روٹی اور تھوڑا سا اچار... اس کے پاس کچھ بھی ایسا نہیں تھا، جو فارینہ کو پیش کرتا۔ اس نے بے دلی سے اپنا لٹچ باکس بند کیا۔ آج اسے شدت سے احساس ہوا کہ اس کی جیب میں ایک روپیہ بھی موجود نہیں ہوتا مگر خدا بخش کے مالی حالات اس کے

سامنے تھے۔ اس لیے اس نے کبھی ضد بھی نہیں کی تھی۔ وہ افسردگی سے سر جھکا کر رہ گیا۔ فارینہ مسکراتے ہوئے آگے بڑھی۔ اس کے دونوں ہاتھ پیچھے کی طرف تھے۔ جیسے وہ کچھ چھپا رہی ہو۔

”آدم! آج تمہاری سالگرہ ہے نا۔“ فارینہ نے معصومیت سے پوچھا، تو حیرت سے دیکھتے آدم نے سر اثبات میں ہلا دیا۔

”اسے کیسے پتا چلا؟“ وہ دل ہی دل میں بہت حیران ہوا اور بے تحاشا خوش بھی کہ اس کے خاص دن پر، کوئی بہت خاص اسے وش کرے گا۔

”پیپی برتھ ڈے ٹو یو، پیپی برتھ ڈے ڈیر آدم۔“ فارینہ نے ہلکی سی آواز میں گنگناتے ہوئے، ایک گفٹ پیکیٹ اس کی طرف بڑھایا تھا۔ آدم خوشی اور حیرت سے گنگ اسے دیکھتا ہی رہ گیا۔ کبھی کوئی اسے اتنے پیار سے بھی وش کر سکتا ہے یہ اس نے خواب میں بھی نہیں سوچا تھا۔ اس نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے، گفٹ پیکیٹ پکڑ لیا۔

”تھینک یو فارینہ! یہ میری زندگی کی سب سے یاد گار اور پیاری سالگرہ ہے۔“ آدم نے خوشی سے معمور لہجے میں کہا۔

”تھینک یو بعد میں کہہ لینا! پہلے اپنا گفٹ تو دیکھ لو۔ پتا نہیں تمہیں پسند بھی آتا ہے یا نہیں۔“ فارینہ کی آنکھوں میں چمک تھی اور ہونٹوں پر مسکراہٹ۔

”تم لائی ہو، تو اچھا ہی ہو گا، مگر میرے پاس ایسا کچھ بھی نہیں ہے جو میں تمہیں اس موقع پر پیش کر سکوں، لیکن وعدہ میں کل تمہارے لیے کینڈی ضرور لائوں گا۔“ آدم نے سوچ لیا تھا کہ وہ ابا سے کہے گا کہ اسے سیر نہیں کرنی اور نہ ہی آئس کریم کھانی ہے۔ بس ابا اسے ایک اچھی سی کینڈی لے دے جو وہ کل فارینہ کو دے گا۔ فارینہ کے بے حد اصرار کرنے پر آدم مسکراتے ہوئے، کانپتے ہاتھوں سے اپنا گفٹ کھولنے لگا۔ چمکیلا گفٹ پیپر اتارتے ہی ایک مناسب سائز کا ڈبا نکلا۔ آدم نے تجسس سے اسے الٹ پلٹ کر دیکھا اور پھر اس پر لگی ٹیپ کھولنے لگا۔ ڈبا کھولتے ہی وہ چونکا اور ہاتھ بڑھا کر اندر موجود چیزیں ایک ایک کر کے باہر نکالنے لگا۔

لال رنگ کا پرائیوٹ گاڑی جس پر گولڈن کام ہوا تھا، کانچ کی چوڑیاں اور جھمکے آدم کا رنگ فق ہو گیا۔ جب کہ فارینہ نے فوراً ڈبے میں رکھا لال دوپٹا نکالا اور اس کے اوپر دے دیا۔

”ہیپی برتھ ڈے ٹو یو۔“ اچانک ہی بہت سے آوازیں، قہقہے، کھکھلاہٹیں اس کی آس پاس گونجنے لگیں۔ سب بچے تالیاں بجاتے، شور مچاتے اندر آگئے۔ اس کا مطلب کہ وہ یہ سب چھپ کر دیکھ رہے تھے۔ آدم کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ اس نے غصے سے دوپٹا اتار کر نیچے زمین پر پھینکا۔ ایک لڑکے نے اپنے کمرے سے اس کی تصاویر بھی لیں تھیں۔ آدم نے اس کے ہاتھ پر جھپٹا مارا اور کیمرہ چھین کر نیچے زمین پر زور سے مارا۔ وہ کئی ٹکڑوں میں بٹ گیا۔ اس لڑکے کو شدید غصہ آیا اور وہ آدم کو مارنے لگا۔ آدم نے بھی اپنے ہاتھ پائوں چلائے اور اس پر حاوی ہو گیا۔ اس پر کوئی جنون سوار ہو گیا تھا۔ وہ اپنے اندر کا سارا غصہ، نفرت اور چڑاس پر نکال رہا تھا۔ فارینہ خوف زدہ ہو کر پیچھے ہٹ گئی۔ اس وقت اسے آدم سے خوف کے ساتھ ساتھ شدید نفرت بھی محسوس ہوئی تھی۔ اس لڑکے کے کچھ ساتھی فوراً آگے بڑھے اور اسے چھڑاتے ہوئے آدم کو پیٹنے لگے۔ وہ چاروں مل کر اسے مار رہے تھے۔ اسی وقت شور شرابے کی آواز سن کر اسکول کا اسٹاف دوڑا آیا اور انہیں ایک دوسرے سے بہ مشکل الگ کیا۔ آدم کی حالت بھی خراب تھی مگر جس لڑکے کو اس نے مارا تھا، اس کی حالت بہت بری تھی۔

اسے فوراً ہسپتال پہنچایا گیا۔ اس کے والدین بھی پہنچ گئے۔ سب سے پوچھا گیا، تو سب نے آدم ہی کو قصور وار ٹھہرایا۔ وہ سب طاقت اور پیسے میں اس سے کہیں آگے اور مضبوط تھے۔ پرنسپل کو مجبوراً آدم کے خلاف ایکشن لینا پڑا۔ خدا بخش کے لاکھ منٹیں، ترلے اور اگلی بار ایسی غلطی نہ کرنے کا وعدہ کرنے کے باوجود، آدم کو اسکول سے نکال دیا گیا۔ یوں آدم کی زندگی میں کھلنے والا روشن دریچہ ہمیشہ کے لیے بند ہو گیا اور اس کی وجہ وہ لڑکی بنی تھی جس سے دوستی کی وہ شدید خواہش رکھتا تھا۔

”آدم تم نے ایسا کیوں کیا؟“ خدا بخش نے اس سے پوچھا، تو روتے ہوئے اُس نے کہا۔

”ابا میں نے ہمیشہ سب کی باتیں سنیں اور برداشت کیں مگر اس لڑکی نے جب سب کے ساتھ مل کر میرا مذاق اڑایا اور مجھے بے وقوف بنایا، تو میں برداشت نہیں کر سکا۔ ابا وہ مجھے بہت اچھی لگتی ہے اور میں اس سے دوستی کرنا چاہتا ہوں۔ میں کیسے اس کے سامنے یہ برداشت کرتا کہ میں کسی سے کمتر ہوں، اگر وہ دوسرے لڑکوں سے دوستی کر سکتی ہے، تو مجھ سے کیوں نہیں۔“

آدم کے لہجے میں ضد تھی اور غصہ بھی۔

خدا بخش اس کی باتوں پر چونک گیا۔ وہ اب بڑا ہو رہا تھا۔ اس میں تبدیلی آرہی تھی۔ چودہ سال لڑکپن کی عمر ہوتی ہے جس میں بہت سی باتوں کو سمجھنا اور بتانا ضروری ہو جاتا ہے۔ اسے آگاہی دینا خدا بخش کا کام تھا۔

”اس لیے کہ تم دوسروں کی طرح نہیں ہو۔ تم ان سے مختلف ہو آدم۔“ خدا بخش نے اسے نرمی سے سمجھانا چاہا۔

”مگر کیوں ابا؟ میں سب سے الگ کیوں ہوں؟“ آدم نے تڑپتے ہوئے پوچھا۔ خدا بخش نے اسے اپنے سینے سے لگا لیا۔

”میرے بچے! یہ اللہ کی مرضی ہے۔ ہم کچھ نہیں کر سکتے ہیں۔“ خدا بخش نے اس کا سر تھپکتے ہوئے کہا، تو آدم فوراً ان کی آغوش سے نکلا۔

”اللہ نے مجھے ایسا کیوں بنایا ہے ابا کہ میں جسے دل سے پسند کرتا ہوں، اس سے دوستی نہیں کر سکتا، اسے اپنی زندگی میں شامل نہیں کر سکتا۔

ابا۔ بتا دیں اپنے اللہ میاں کو کہ آدم ان سے سخت ناراض ہے۔“

آدم نے منہ پھلاتے ہوئے کہا۔ فارینہ کی وجہ سے آج پہلی بار وہ اپنے رب سے دور اور شکوہ کننا ہوا تھا۔

”نہ میرے بچے! ایسا نہیں بولتے۔ اللہ تو بہت مہربان ہے اپنے بندوں پر۔“ خدا بخش کا دل خوف سے کانپ اٹھا۔

”تو کیا میں اس کا بندہ نہیں ہوں ابا۔ جو وہ مجھے کچھ بھی نہیں دیتا ہے۔ مجھ سے سب چھین لیتا ہے۔ آخر کیوں؟ میں ہی کیوں ابا، میں ہی کیوں۔“

آدم بلک بلک کر رو رہا تھا۔ خدا بخش کے لیے اسے سنبھالنا بہت مشکل ہو گیا تھا۔ پھر اس دن کے بعد سے آدم کو چپ لگ گئی۔ وہ سارا دن خاموش، چپ چاپ ایک کونے میں بیٹھا رہتا۔ اس کی سوچیں عجیب و غریب ہوتی جا رہی تھیں۔ وہ جتنا غور کرتا، اتنا ہی الجھتا جاتا۔ روزمرہ کے معمولات میں اس کی دلچسپی ختم ہو کر رہ گئی تھی۔ خدا بخش نے پرنسپل سے درخواست کی تھی کہ اس سال آدم کو امتحان میں بیٹھنے کی اجازت دے دی جائے جسے رد کر دیا گیا۔ اس طرح آدم کا وہ سال بھی ضائع ہو گیا جس کا خدا بخش کو بہت افسوس اور دکھ تھا۔

”ابا! یہاں کسی کی زندگی ضائع ہو جاتی ہے اور کسی کو پتا بھی نہیں چلتا اور آپ ایک امتحان کا دکھ لیے بیٹھے ہیں۔“ آدم کا لہجہ روز بہ روز تلخ ہوتا جا رہا تھا۔ سارا دن وہ کتابوں کو ہاتھ نہیں لگاتا تھا جب کہ اسے پڑھنے کا بہت شوق تھا۔ قرآن پاک پڑھنے بھی وہ بہ مشکل جاتا رہا۔ کچھ دنوں میں اس کا قرآن بھی مکمل ہو جانا

تھا۔ اسی لیے وہ خاموش تھا کہ ابا کو کسی طرف سے تو خوشی ملے۔ آدم کافی دنوں سے محسوس کر رہا تھا کہ ابا کھویا کھویا اور گم صم رہنے لگا ہے۔ گھر آکر کھانا کھاتے ہی وہ لیٹ جاتا۔ اب وہ پہلے کی طرح، آدم سے باتیں بھی نہیں کرتا تھا۔ کسی گہری سوچ میں ڈوبا اپنے ارد گرد سے لا تعلق رہنے لگا تھا۔ کلثوم کے کلیجے کو ٹھنڈ پڑ گئی، جب آدم کو اسکول سے بے عزت کر کے نکالا۔ وہ اپنے مجازی خدا کی طرف طنزیہ نظروں سے دیکھتی تھی۔

”اب بول! کیا کرے گا اس کا۔ آخر اس کا انجام تو یہی ہونا ہے۔ اپنی جنس کے لوگوں کے پاس اسے ہر حال میں جانا ہی پڑے گا۔ تو کب تک اسے بچائے گا۔“ کلثوم اکثر طنزیہ لہجے میں کہتی۔ خدا بخش خاموشی سے اسے دیکھتا رہ جاتا۔ وہ اسے کیسے بتاتا کہ یہ ڈر ہی تو اسے راتوں کو سونے نہیں دیتا۔ اس معاشرے میں آدم جیسے بچوں کا صرف ایک ہی مستقبل تھا، لیکن اس کا دل نہیں مانتا تھا کہ وہ اُسے اس حال میں دیکھے۔ وہ آدم کو اپنے باقی بچوں کی طرح، ہی دیکھنا، چاہتا تھا، مگر قسمت کی ستم ظریفی کے آگے وہ بے بس تھا اور اسی بے بسی میں ایک دن وہ مسز مارتھا کے سامنے پھوٹ پھوٹ کر رو دیا۔ تبھی امید کی ایک کرن مسز مارتھا نے اس

کی خالی جھولی میں ڈالی تھی مگر اس کے لیے اسے قربانی دینی تھی۔ اپنی سب سے پیاری اور عزیز چیز کی۔

☆...☆...☆

چکراتے ہوئے سائیں نے موندی موندی آنکھوں سے پلٹ کر دیکھا۔ خان زادہ شمشیر ہاتھ میں اپنی اسٹک پکڑے غضب ناک تیوروں سے اسے دیکھ رہے تھے۔ اسے چھڑی کی شدید ضرب اس کے سر پر لگی تھی۔

”بے غیرت، گھٹیا، بیخ ذات! تیری جرأت کیسے ہوئی، ہماری عزت پر بری نظر ڈالنے کی۔ تو فرشتے کے روپ میں درندہ ہے۔ میں تیری جان لے لوں گا۔ تو نے میری بیٹی کو ہاتھ بھی کیسے لگایا۔“ نیم تاریک کمرے میں خان زادہ شمشیر نے صرف دروازے سے نظر آتے سائیں اور ہاتھ جوڑ کر روتی مریم کو دیکھا تھا جس کے سر سے دوپٹا اتر کر پاؤں میں رل رہا تھا۔ خان زادہ شمشیر نے منٹوں میں ایک کہانی سوچ لی اور ایک دم سے دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئے اور ہاتھ میں پکڑی چھڑی سے اس کے سر پر وار کیا۔

وہ کچھ بھی سنے بغیر، سائیں پر جھپٹے اور اسے گردن سے دبوچ لیا۔

”میں تجھے اپنے ہاتھوں سے جہنم رسید کروں گا۔“ سائیں کی آنکھیں ابل گئی تھیں ، مگر وہ کوئی بھی مزاحمت کیے بغیر چپ چاپ ان کے ہاتھوں میں جان دے رہا تھا۔ جب کونے میں کھڑی نوربانو چیختی ہوئی ان کی طرف بڑھی۔

”مار تو آپ نے اسے کئی سال پہلے ہی دیا تھا۔ اگر قدرت نے آج اسے نئی زندگی دے کر ہمارے سامنے لا کھڑا کیا ہے، تو شاید اس لیے کہ ہم اپنے اس گناہ کا کفارہ ادا کر سکیں، جو ایک معصوم بچے کو ٹھکرا کر کیا تھا۔ کیوں آپ آج بھی اپنی اولاد، اپنے خون کو نہیں پہچان سکے۔ یہ قدرت کی طرف سے وہ آزمائش ہے جس میں آپ کبھی پورے نہیں اترے تھے۔ خدا کا واسطہ ہے۔ چھوڑ دیں میرے بچے کو۔“ اور کتنا ظلم کمائیں گے آپ؟“ نوربانو نے ان کی سخت گرفت سے سائیں کو چھڑانے کی کوشش کی اور روتے ہوئے ان کے قدموں میں اپنا سر رکھ دیا۔

”آپ کو خدا اور رسول ﷺ کا واسطہ! میرے بچے کی جان بخش دیں۔ ابھی تو میری ممتا اسے اپنی آغوش میں بھر کر ٹھنڈی بھی نہیں ہوئی۔“

نوربانو کہہ رہی تھیں۔ اسی وقت مریم آگے بڑھی اور باپ کے آگے ہاتھ جوڑتے ہوئے بولی۔

”خدا کا واسطہ ہے ابا۔ بھائی کو چھوڑ دیں۔“ اسی وقت خان زادہ شمشیر کے ہاتھوں کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی اور سائیں لڑکھڑا کر نیچے گر گیا۔ اس کی سانس رک رک کر چل رہی تھی۔ نور بانو اور مریم فوراً اس کی طرف لپکیں جب کہ خان زادہ شمشیر پھٹی پھٹی نگاہوں سے اسے دیکھ رہے تھے۔

”یہ میں نے کیا کیا؟ آج پھر اپنے ہی جگر گوشے کو، اپنے ہی ہاتھوں سے مارنے کی کوشش کی؟“ خان زادہ شمشیر خوف سے پیچھے ہٹے۔

”میں جو کئی سالوں سے اندر ہی اندر پچھتاوے کی آگ میں جلتا رہا۔ کئی بار دل میں یہ خواہش شدت سے ابھری تھی کہ کاش میں اس بچے کو اپنا نام دے کر دنیا میں معتبر بنا دیتا۔ کسی کو کیا پتا چلنا تھا کہ وہ درحقیقت ادھورا ہے۔ میں چاہتا تو تھوڑی سی سمجھ داری اور ہمت سے اس کا یہ عیب چھپا سکتا تھا، مگر میں نے کیا کیا؟“ خان زادہ شمشیر نے نیچے گرے سائیں کا سفید چہرہ دیکھا، تو خوف کی لہر ان کے اندر دوڑ گئی۔

”کیا یہ مر گیا ہے؟“ وہ پلٹ کر کمرے سے باہر بھاگے۔ ان کے پیروں میں اتنی سکت نہیں تھی کہ وہ چند قدموں کا فاصلہ طے کرتے اور سائیں کو ہاتھ لگا کر دیکھتے کہ وہ زندہ ہے یا مر گیا ہے۔ وہ بچے کی طرح خوف زدہ ہو کر چھپنا چاہتے تھے۔ کسی

کونے میں گم ہو جانا چاہتے تھے، جہاں کوئی انھیں دیکھنے والا نہ ہو۔ کوئی ان سے سوال جواب کرنے والا نہ ہو مگر اندھیرے کمرے کے کونے میں چھپ کر بیٹھتے ہوئے انہیں کچھ دیر ہی گزری تھی۔ جب انہیں خیال آیا کہ وہ کس سے بھاگ رہے ہیں اور کیوں بھاگ رہے ہیں۔

سوالوں اور جوابوں کے سلسلے اور بحث، ان کے اندر کئی سالوں سے ہو رہی تھی۔ پچھتاوے کی آگ ان کے اندر لگی تھی۔ اپنے ضمیر کے آگے وہ خود شرمندہ اور جواب دہ تھے۔ اس کونے میں چھپ کر بیٹھنے سے، وہ دنیا کی نظروں سے تونچ سکتے تھے، مگر خود سے ہرگز نہیں۔

گھٹنوں کے گرد دونوں بازوؤں کا گھیرا بنائے، ٹھنڈے فرش سے بے پروا، وہ پھوٹ پھوٹ کر رو رہے تھے۔ ان کی سفید ڈاڑھی سے آنسو ٹپک کر ان کے بندھے ہوئے ہاتھوں پر گر رہے تھے۔ کچھ دیر ایسا لگ رہا تھا جیسے ان کے جسم کو جھٹکے لگ رہے ہیں۔ انہیں وہ سنہری دوپہر کا دن اور نہر کا کنارہ یاد آ رہا تھا۔ جب سائیں کی بزرگی اور روحانیت دیکھ کر وہ اندر سے کمزور ہو کر بے اختیار اپنا آپ اس کے سامنے کھول بیٹھے تھے۔ حالاں کہ سائیں نے دبے لفظوں میں انھیں منع بھی کیا تھا کہ وہ کسی کے راز کا بوجھ نہیں اٹھانا چاہتا، مگر وہ اپنے اندر کی جنگ اکیلے لڑتے لڑتے

تھک گئے تھے۔ انہیں اپنا دکھ بیان کرنے کے لیے کسی کا کندھا چاہیے تھا۔ اس وقت وہ کندھا، انہیں سائیں نے دیا اور وہ اس کے سامنے کھلتے گئے۔ اپنے اندر کے سب ڈر، سب باتیں، سب پچھتاوے اسے سنا دیے یہ جانے بغیر کہ وہ خود کتنی تکلیف اور اذیت سے گزارا تھا۔ سائیں پر یہ راز کھلا بھی تو کیسے۔ وہ جو خود اتنے سالوں سے اپنے اصل کی تلاش میں بھٹک رہا تھا، وہ سچ آج خود چل کر اس کے پاس پہنچا تھا، مگر اس بات سے خان زادہ شمشیر بے خبر تھے۔ وہ اپنے دل کی پتا کہہ کر ہلکے، پھلکے ہو گئے تھے۔ اس دن انہوں نے سائیں کو بہت خاص مقام اور جگہ دی تھی اپنی زندگی میں بھی اور اپنے دل میں بھی مگر آج انہوں نے کیا کیا؟ سچ جانے بغیر کیسا گھٹیا الزام اس پر لگا دیا کہ وہ خود اپنی ہی نظروں میں گر کر رہ گئے۔ انہوں نے شاید کبھی دل سے اسے اپنا مانا ہی نہیں تھا۔ بھلا دل سے مانے اور بنائے گئے رشتے، اتنی جلد کیسے بدگمانی کی دھول میں چھپ سکتے ہیں۔ قریبی مسجد سے ”اللہ اکبر“ کی صدا بلند ہوئی، تو وہ چونکے۔

”جب تک سانس ہے، توبہ کی امید نہیں چھوڑنی چاہیے۔“ سائیں نے ان کے پچھتاوے پر اپنے لفظوں کا مرہم رکھا تھا۔ انہوں نے کندھے پر پڑی چادر سے اپنا بھیگا ہوا چہرہ صاف کیا اور گھٹنوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے اٹھے تو ان کی منہ سے کراہ

نکل گئی۔ ایک رات ہی میں وہ صدیوں کا سفر طے کر چکے تھے۔ وہ تیز تیز قدموں سے مہمان خانے کی طرف بڑھے، جب پورچ میں گم صم کھڑی نوربانو اور مریم پر ان کی نظر پڑی۔ کسی خیال سے وہ چونکے۔

”نہیں! وہ مجھے پچھتاوے کے بھنور میں ایسے، بے یارو مدد گار چھوڑ کر نہیں جا سکتا۔ میں اسے نہیں جانے دوں گا۔“ انہوں نے خود کلامی کی، مگر ان کی آواز اتنی اونچی تھی کہ نوربانو اور مریم چونک کر ان کی طرف متوجہ ہو گئیں۔ وہ ہوش وہ حواس سے بیگانہ، ملگجے کپڑوں اور سادہ سی چپل پہنے، لڑکھڑاتے قدموں سے گیٹ کی طرف بھاگا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ دونوں اُسے روکتیں وہ گیٹ کھول کر باہر نکل گیا۔ گیٹ پر کھڑا چوکیدار حیران رہ گیا۔ اسی وقت نوربانو نے چوکیدار سے چیخ کر کہا۔

”ڈرائیور سے کہو، جلدی سے گاڑی نکالے۔ مریم تم بھاگ کر میری چادر لے آؤ۔ جلدی کرو۔ ہمارے پاس زیادہ وقت نہیں۔“ نوربانو نے کہا تو مریم فوراً سر ہلاتی اندر کی طرف بھاگی۔ اس کے واپس آنے تک چوکیدار سرونٹ کوارٹر سے ڈرائیور کو لے آیا تھا۔ اب وہ گاڑی اسٹارٹ کیے ان کا منتظر کھڑا تھا۔

”امی میں بھی ساتھ چلوں گی۔“ مریم نے ماں سے کہا، تو وہ رک کر فوراً بولیں۔

”نہیں تم گھر پر رو۔ کسی کو کچھ خبر نہیں اور اگر کوئی ہمارے بارے میں پوچھے تو کہہ دینا سائیں کے ساتھ، شہر والے مزار پر دیگ چڑھانے گئے ہیں۔“

نوربانو نے جلدی سے گاڑی میں بیٹھ کر ڈرائیور کو چلنے کا اشارہ کیا۔ ڈرائیور نے تیزی سے گاڑی دوڑائی۔ آج کی رات حویلی کے مکینوں پر قیامت بن کر گزری تھی۔ سائیں کو بہ مشکل ہوش میں لانے کے بعد، انہوں نے خان زادہ شمشیر کی طرف سے معافی مانگی تھی۔ سائیں نے ان کے جوڑے ہاتھوں کو چوما اور لڑکھڑاتے قدموں سے جانے کی اجازت چاہی۔ مریم اور نوربانو اس سے لپٹ کر رونے لگیں، مگر وہ نہیں رکا تھا۔

”میری ٹرین چھوٹ جائے گی۔ مجھے جانا ہے۔“ انہیں بہ مشکل خود سے الگ کرتا وہ کمرے سے باہر نکلا۔ جاتے جاتے اس نے مڑ کر ایک بار ان کی طرف دیکھا اور گیٹ پار کر گیا۔ وہ دونوں اپنی جگہ گم صم نہ جانے کتنی دیر کھڑی رہیں۔ جب خان زادہ شمشیر وہاں پہنچے۔

”ٹھہرو۔ گاڑی روکو۔“ کچھ دور ہی پہنچے خان زادہ شمشیر کے پاس پہنچ کر بولیں تھیں۔ ڈرائیور نے گاڑی روکی تو وہ چونک کر متوجہ ہوئے۔ اسی وقت کار کے شیشے سے نوربانو نے سر نکال کر آواز دی۔

”جلدی سے کار میں بیٹھ جائیں۔ نہیں تو اس کی گاڑی نکل جائے گی۔“

خان زادہ شمشیر فوراً دروازہ کھول کر بیٹھ گئے۔ ریلوے اسٹیشن زیادہ دور نہیں تھا، مگر ان دونوں کو وہ بھی میلوں کے فاصلے پر لگ رہا تھا۔ چھوٹے سے ریلوے اسٹیشن پر جیسے ہی گاڑی رکی، خان زادہ شمشیر فوراً نیچے اترے اور اندھا دھند بھاگتے ہوئے اندر داخل ہو گئے۔ نوربانو بھی انہیں آوازیں دیتی ہوئیں، پیچھے لپکی تھیں۔ جب کہ ڈرائیور حیرت سے یہ سب دیکھنے کے باوجود، مہربان لب تھا کہ یہی اس کی وفاداری کا تقاضا تھا۔

صبح کی روشنی ابھی، زمین سے نہیں ملی تھی۔ اس لیے اسٹیشن پر لوگوں کا ہجوم نہ ہونے کے برابر تھا۔ خان زادہ شمشیر پھر بھی دیوانوں کی طرح اسے ادھر، ادھر، ڈھونڈ رہے تھے۔ جب ایک بچہ پر چادر اپنے گرد لپیٹے سائیں کی نظر ان پر پڑی اور وہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اسی وقت خان زادہ شمشیر نے بھی اسے دیکھ لیا۔ وہ اسے پکارتے ہوئے، اس کی طرف بڑھے، تو عجلت میں ان کا پائوں کسی چیز سے ٹکرایا، تو انگوٹھے کا ناخن اکھڑ گیا جس سے خون بہ نکلا۔ وہ منہ کے بل زمین پر گرے۔ پیچھے آتی نوربانو کے منہ سے چیخ نکل گئی۔ اسی وقت سائیں بھاگ کر ان کے پاس پہنچا اور سہارا دے کر اٹھانے کی کوشش کرنے لگا۔

[illegible]

”نہیں ابو! آپ مجھے میری ہی نظروں میں مت گرائیں۔ میرے دل میں کوئی شکوہ نہیں ہے آپ کے لیے۔“ سائیں نے ان کے چہرے پر بہتے آنسو صاف کیے۔

”نہیں تم ایک بار کہو کہ تم نے مجھے معاف کیا۔ میرے ظلم کے لیے، میرے گناہ کے لیے، صرف ایک بار کہہ دو۔“ وہ اس کے سامنے ایسے ہاتھ پھیلا کر بھیک

مانگ رہے تھے کہ سائیں کا دل کٹ کر رہ گیا۔ اس نے ان کے پھیلے ہوئے ہاتھ
تھامے اور بولا۔

”میں نے آپ کو معاف کیا۔ آپ کے ہر عمل اور کوتاہی کے لیے۔ بس اب آپ نے رونا نہیں ہے۔“ سائیں نے نرمی سے ان کا بھیگا چہرہ صاف کیا۔ ان کی سفید ڈاڑھی آنسوؤں سے تر تھی۔

”پھر تم ہمیں چھوڑ کر کیوں جا رہے ہو؟ چلو میرے ساتھ، واپس چلو۔ اب ہم ساتھ رہیں گے۔ میں سب کو بتاؤں گا کہ تم میرا خون ہو، میرے جگر کا ٹکڑا ہو، چلو میرے ساتھ۔“ انہوں نے سائیں کا ہاتھ پکڑ کر اپنی طرف کھینچا۔

”نہیں ابو جان! میں آپ کے ساتھ واپس نہیں جا سکتا۔ مجھے معاف کر دیں۔“

سائیں نے نرمی سے کہا، تو وہ دونوں چونک کر اس کی طرف دیکھنے لگے۔

”اس کا مطلب ہے تم نے ہمیں دل سے معاف نہیں کیا۔“ نوربانو نے سسکتے ہوئے

کہا۔

”نہیں ماں جی! ایسا نہیں ہے مگر...“ سائیں کہتے کہتے چپ ہو گیا۔

”مگر کیا؟“ خان زادہ شمشیر نے تڑپ کر پوچھا۔

”اتنے سالوں سے جو راز سب کی نظروں سے چھپا رہا ہے، اسے پوشیدہ ہی رہنے دیں۔ آپ سب کے سوالوں کا جواب دیتے دیتے تھک جائیں گے، مگر لوگوں کے سوال کبھی ختم نہیں ہوں گے۔ آپ کے اونچے شملے، آپ کی خاندانی گدی پر سوال اٹھائے جائیں گے، آپ کس کس کو مطمئن کریں گے۔ کس کس کو بتائیں گے کہ آپ کے گھر ایک خواجہ سرا نے جنم لیا تھا۔ آپ لوگ برداشت کر بھی لیں گے مگر باقی خاندان والے! وہ اس سچ کو کبھی نہیں تسلیم کریں گے۔ میں نے اتنے سال اس اذیت میں رہتے ہوئے گزارے ہیں۔ میں آپ لوگوں کو اس اذیت کا شکار ہوتے ہوئے، اس عمر میں نہیں دیکھ سکتا۔ میرا ضمیر کیسے گوارا کرے کہ میرے بوڑھے والدین، اس عمر میں دنیا کی عدالت میں ہر روز ملامت کے کٹھرے میں کھڑے ہوں۔ میرے بہن بھائی، مجھے قبول کر بھی لیں مگر اپنے سے جڑے رشتوں کے سامنے تضحیک کا نشانہ بنتے ہوئے ساری زندگی گزاریں گے۔“ سائیں نے نرمی سے کہا۔ وہ دونوں ٹکڑ ٹکڑ اس کا چہرہ دیکھنے لگے۔

”ہمیں سب منظور ہے، مگر تم سے جدائی گوارا نہیں۔“ نور بانو نے کہا، تو خان زادہ شمشیر نے بھی اثبات میں سر ہلایا۔

”میرے پیارے والدین!“ سائیں نے آگے بڑھ کر دونوں کی پیشانی کو باری باری چوما۔

”اگر قسمت مجھے آپ کی خدمت کرنے کو موقع دیتی، تو میں ساری زندگی، رب کا شکر ادا کرتے سجدے میں جھکا رہتا مگر میرے لیے یہی بہت ہے کہ آج مجھے آپ دونوں کو ”امی، ابو“ کہنے کا حق ملا ہے۔ میں آپ دونوں کے گلے سے لگ کر رویا ہوں۔ ماں کی گود کی گرمی اور باپ کی شفقت دیکھی ہے۔ باپ کی مار کا ذائقہ چکھا ہے۔ مجھ سے میرے والدین راضی ہیں۔ آپ خود ہی بتائیں کہ دنیا میں آج مجھ سے زیادہ خوش نصیب کون ہو گا؟“

سائیں نے ہلکا سا مسکراتے ہوئے کہا۔

”مگر میں اپنی ممتا کا کیا کروں؟ ابھی اس کی پیاس نہیں بجھی۔ میری بھری ہوئی گود نے بھی، تمہاری جگہ اور اس کے خالی پن کو ہمیشہ محسوس کیا ہے، میں تمہیں خود سے دور کیسے جانے دوں۔ مجھے چھوڑ کر مت جاؤ میرے بچے۔ میں اس دنیا میں تو کیا، روزِ محشر بھی بھرے میدان میں چنچ چنچ کر کہوں گی کہ تم نے میری کوکھ سے جنم لیا ہے اور مجھے تم پر ناز ہے۔ مجھے چھوڑ کر مت جاؤ۔“

نور بانو نے اس کی شہادت کی انگلی کے نیچے بنے نشان کو چوما اور اس سے لپٹ گئیں۔

”امی جان! میں چاہے کہیں بھی رہوں، کس حال میں بھی رہوں، رہوں گا تو آپ کا ہی نا۔ بس تھوڑا سا انتظار اور پھر ہم سب ہمیشہ کے لیے ساتھ ہوں گے۔ اس کی رحمت کے سائے میں۔ میں جس سفر پر چل نکلا ہوں، وہاں سے واپس نہیں پلٹ سکتا۔ کیا آپ یہ چاہیں گے کہ میں دین سے بھی جائوں اور دنیا سے بھی۔“

سائیں نے پوچھا، تو وہ دونوں نفی میں سر ہلانے لگے۔

”پھر میرا راستہ مت روکیں۔ ایک چھوٹے سے سفر سے لوٹوں گا، تو لمبی نیند آپ کے پہلو میں ہی سوئوں گا۔ یہ میرا وعدہ رہا، بس مجھے قسم کا طوق اتارنے دیں، اس ذات کے لیے خالص بننے دیں کہ ”اور بے شک اللہ جسموں سے نہیں، روح سے محبت کرتا ہے۔“

سائیں نے کہا، تو دونوں کے دل ایک دم ہی مطمئن ہو گئے۔ سائیں نے باری باری دونوں کو گلے سے لگایا اور پیار کیا۔ پھر ٹرین کی وسل بجتے ہی الوداعی نظروں سے انھیں دیکھتا، ہاتھ ہلاتا، ریل پر سوار ہو گیا۔ دھند میں جہاں تک وہ لوگ ایک دوسرے کو دیکھ سکتے تھے، دیکھتے رہے۔

آنکھوں سے اوجھل ہوتے ہی خان زادہ شمشیر اور نور بانو نے شکستہ قدموں سے واپسی کا سفر شروع کیا۔ جب کہ ٹرین کے سب سے آخری ڈبے کے ایک کونے میں، گھٹنوں میں سر دیے، وہ بے آواز رو رہا تھا۔ زندگی نے آج اسے وہ سب کچھ دیا جس کی تمنا کبھی اس کی سب سے بڑی خواہش تھی، مگر افسوس کے اس کی پاس سانسوں کی مہلت بہت کم رہ گئی تھی۔ تیزی سے گزرتے ہر منظر کے ساتھ ساتھ، وہ بھی ماضی کی بھول بھلیوں میں پہنچ گیا۔ ان بھول بھلیوں میں اسے جو پہلا دروازہ ملا وہ، ماضی کے اس لمحے میں کھلتا تھا جب اس کے مستقبل سے پریشان اور فکر مند خدا بخش کو اچانک امید کی ایک کرن مل گئی تھی۔

☆...☆...☆

”دید اپنے کی تھی اُسے خواہش

آپ کو ہر طرح بنا دیکھا

شمع ہو کر کے اور پروانہ

آپ کو آپ میں جلا دیکھا“

”نہیں ابا میں آپ کو چھوڑ کر کہیں نہیں جائوں گا۔“ خدا بخش کی بات سنتے ہی وہ ان سے لپٹ گیا۔

”تم مجھے چھوڑ کر نہیں جا رہے ہو۔ تم زندگی میں کچھ بننے کے لیے آگے بڑھ رہے ہو۔“

خدا بخش نے اسے پیار سے سمجھاتے ہوئے کہا، مگر وہ کسی طرح نہیں مان رہا تھا اور ان سے ایسے لپٹا ہوا تھا جیسے وہ چھوٹا سا بچہ ہو جسے اپنے کھو جانے کا ڈر ہو۔

”آدم! میرے بچے! میرے بس میں ہوتا، تو میں ہمیشہ تمہیں اپنی نظروں کے سامنے رکھتا، مگر وقت اور حالات کا تقاضا ہے کہ ابھی ہم ایک دوسرے سے دور ہو جائیں مگر ہمیشہ کے لیے نہیں۔ ہم بہت جلد ضرور ملیں گے۔ میں جیسا کہوں گا، تم مانو گے۔ وعدہ کرو۔ نہیں تو میں تم سے ہمیشہ کے لیے ناراض ہو جاؤں گا۔“

خدا بخش نے اس سے وعدہ لیا۔ پھر جیسا جیسا وہ کہتے گئے، وہ سر جھکا کر خاموشی سے کرتا رہا۔ پھر وہ دن بھی آگیا۔ جب وہ یہ ملک چھوڑ کر، مسز مارٹھا کی گارجین شپ میں امریکا جا رہا تھا۔ اس رات خدا بخش ساری رات نہیں سویا اور چھپ چھپ کر آنسو بہاتا، اسے سینے سے لگائے بیٹھا رہا، آدم بھی ان سے لپٹا رہا، مگر کب تک؟

جدائی کی گھڑی سر پر آہی گئی۔ ایئر پورٹ پر خدا بخش، مسز مارٹھا کے سامنے ہاتھ جوڑ کر رو پڑا۔

”آپ کی بہت مہربانی! آپ نے اس بچے پر شفقت کی! بس آپ سے ایک گزارش ہے، اس کا بہت خیال رکھیے گا۔ یہ بہت سادہ اور معصوم ہے۔ اسے دنیا کی کوئی خبر نہیں ہے۔“

”خدا بخش فکر مت کرو اور ہمت رکھو۔ دیکھنا ایک دن یہ بچہ کامیاب ہو کر لوٹے گا۔“ مسز مارٹھا نے مضبوط لہجے میں کہا۔ خدا بخش نے بھیگی آنکھوں سے انہیں الوداع کیا۔ یہی حال آدم کا بھی تھا۔ امریکا میں مسز مارٹھا اسے اپنے فلیٹ میں لے آئیں۔ یہاں آنے کے بعد آدم کو پتا چلا کہ مسز مارٹھا کا ایک بیٹا، بائیس سال کا بیٹا بھی ہے جو پہلے اپنے باپ کے پاس رہتا تھا، جب ان دونوں میں علیحدگی ہوئی تو مائیکل نے باپ کے ساتھ رہنے کو ترجیح دی کیونکہ وہ امیر شخص تھا مگر اس کے مرنے کے بعد اس کی دوسری بیوی اور اس کے بچوں نے اسے وہاں سے نکال دیا تو اسے اپنی بوڑھی ماں کا خیال آیا جو پاکستان سے بہت جلد لوٹنے والی تھیں۔ اس نے ماں کو جذباتی طور پر بلیک میل کر لیا اور ان کے آنے سے پہلے ہی مزے سے ، ان کے فلیٹ میں رہنے لگا مائیکل من موجدی قسم کا شخص تھا۔ اس کا زیادہ تر وقت شراب کے نشے میں گزرتا۔ یہاں آ کر بھی مسز مارٹھا نے جاب شروع کر دی۔ مائیکل زیادہ تر گھر پر ہی رہتا یا کبھی کبھار وہ کوئی کام کر لیتا تھا مگر مستقل مزاجی

سے نہیں۔ یہاں آکر آدم کی تعلیم کا سلسلہ شروع ہو گیا، مگر یہاں زندگی کے ساتھ ساتھ بھاگنا ضروری تھا۔ اسی لیے اسے ایک پٹرول پمپ پر ملازمت مل گئی جس کا مالک ایک بوڑھا خبطی تھا، مگر وہ آدم کے حق میں اچھا تھا۔ آدم کا نام یہاں آکر پہلے ایڈم اور پھر ایڈی میں تبدیل ہو گیا۔ اپنے ابا کی ہدایت کو سامنے رکھتے ہوئے آدم نے خوب محنت کرنا شروع کر دی۔ وہ کسی قابل بن کر جلد سے جلد واپس جانا چاہتا تھا۔ اسی لیے اکثر رات کو دیر تک پڑھتا رہتا، وہ اسکول کے پتے پر ابا (خدا بخش) کو کئی خط بھی لکھ چکا تھا۔ خدا بخش اس کے خطوں کے انتظار میں پوسٹ مین کی راہ دیکھتا رہتا۔ کلثوم اور اُس کے بچوں کے لیے یہ بہت تکلیف دہ بات تھی کہ آدم ملک سے باہر چلا گیا ہے۔ وہ بار بار شکوہ کرتی کہ اپنی اولاد کے اچھے مستقبل کے لیے تو کبھی اس نے ایسا نہیں سوچا۔ خدا بخش اس کی کسی بات کا جواب نہیں دیتا تھا۔ وہ بہت خاموش اور چپ چاپ رہنے لگا تھا۔ آدم کی دوری نے اسے اندر سے توڑ کر رکھ دیا تھا، مگر وہ بہ ظاہر مضبوط بنا پھرتا۔

دوسری طرف بھاگتی دوڑتی زندگی میں، آدم کو خوشی اور مسرت کا جو لمحہ میسر تھا، وہ وہی تھا جب وہ رات کو سونے سے پہلے تھوڑا تھوڑا کر کے روز ابا کو خط لکھتا۔ پھر جب خط طویل ہونے لگتا، تو وہ اسے پوسٹ کر دیتا۔ پھر ابا کے خط کے انتظار میں

دن گننے لگتا۔ خدا بخش اسے خط میں بہت سی ہدایتیں لکھ کر بھیجتا۔ کبھی لکھتا۔ ”آدم یار! تیری اردو تو وہاں جا کر بہت ہی کمزور ہو گئی ہے۔ ابھی بھی تیرے خط میں املا کی غلطیاں نکالی ہیں میں نے۔ دیکھ دھیان سے پڑھنا۔ نہیں تو لوگ کیا کہیں گے کہ وہاں جا کر تُو نالائق ہو گیا ہے کہ اردو لکھنی ہی بھول گیا۔“ آدم یہ پڑھ کر ہنسنے لگتا اور مسز مار تھا کو بھی ابا کی یہ بات مزے لے لے کر سناتا۔ وہ مُسکرا کر پوچھتیں کہ تم نے کیا جواب دیا ہے۔

”ابا یار! فکر مت کریں یہاں اردو نہیں انگلش کی ضرورت ہوتی ہے اور میری انگلش شروع سے بہت اچھی ہے۔“ آدم ہنستے ہوئے جواب لکھتا۔ اسی طرح دن گزرنے لگے۔ اس کے اندر سیکھنے کی صلاحیت قدرتی طور پر بہت تیز تھی۔ وہ بہت جلد کسی بھی چیز کو پک کر لیتا تھا اور بہت جلد کسی بھی رنگ میں ڈھل جاتا تھا۔ اسی لیے تو اس کے گیٹ اپ اور کردار اسکول ڈراموں میں بہت مشہور تھے۔ یہی خوبی اس کی یہاں بھی بہت کام آئی۔ وہ اپنے آس پاس کے لوگوں کا مشاہدہ بہت باریک بینی سے کرتا تھا۔ یہاں آکر اسے بہت اعتماد ملا تھا۔ کوئی اس کا مذاق اڑانے والا یا اسے کمتر سمجھنے والا نہیں تھا۔ یہاں آکر اس کے کچھ دوست بھی بنے جو اس کی ذہانت اور قابلیت سے بہت متاثر ہوئے تھے۔ بہت سے مواقع پر اس نے اپنے

فن کا مظاہرہ بھی کیا، جو دیکھنے والوں کے لیے خوشی کا باعث بنتا۔ اس کے استاد اور دوست اس سے فرمائش کر کے کسی نہ کسی آرٹسٹ کی نقل اتارنے کی فرمائش بھی کرتے۔ جسے یہ بخوبی پوری کر دیتا۔ یہ اس کا اضافی وصف تھا۔ کچھ عرصے میں وہ ، امریکن لب و لہجے میں بولنے کی پریکٹس کرتا ، بالآخر اس میں کامیاب ہو گیا۔ وہ یہاں آکر بہت خوش تھا۔ اسے اپنی ذات کی اہمیت کا اندازہ ہونے لگا تھا۔ اسے یہاں ایک انسان کا درجہ ہی دیا جاتا تھا۔ کوئی اسے تیسرے درجے کی مخلوق نہیں کہتا تھا مسز مار تھانے ایک بار اسے سمجھاتے ہوئے کہا تھا کہ:

”تمہارے سامنے پورا آسمان ہے ، اب یہ تم پر منحصر ہے کہ تم اپنے ڈر اور خوف کی وجہ سے ، اپنے پروں کی طاقت کو استعمال کرنے کے بجائے رینگ کر زندگی گزارنا چاہتے ہو یا اپنے پروں کی طاقت سے آسمان کی وسعتوں کو چھوتے ہو۔ یہ یاد رکھنا، جب تک تم اپنے لیے خود کچھ نہیں کرو گے ، کوئی تمہارے لیے کچھ بھی نہیں کر سکے گا۔ تبدیلی ، آپ کے اندر سے آتی ہے ، باہر سے نہیں۔ خود کو پہچانو اور احساسِ کمتری سے باہر نکل کر دنیا کو بتا دو کہ تم یا تمہارے جیسے لوگ بھی زمین پر انسان ہی کا درجہ رکھتے ہیں اور رب ان کا بھی اتنا ہی ہے ، جتنا دوسرے لوگوں کا۔“

آدم نے اس بات کو اچھی طرح ذہن نشین کر لیا۔ وہ بہت خوش تھا۔ جب اس کی خوشی کو کسی کی نظر لگ گئی۔ مائیکل نے ان دنوں ایک تھیٹر میں کام کرنا شروع کیا تھا۔ اسے وہاں چھوٹے چھوٹے رول مل جاتے تھے جس سے وہ بہت خوش تھا۔ وہ اکثر آدم کو بھی اپنے ساتھ لے جاتا۔ آدم کے لیے یہ سب بہت دل چسپ ہوتا تھا۔ اسٹیج کے پیچھے مختلف آرٹسٹوں کو طرح طرح کے بہروپ میں تیار ہوتے دیکھنا اور اندر کی بہت سی چھوٹی بڑی باتیں اسے پتا چل جاتی تھیں۔ چوں کہ شروع سے اس کی قوتِ مشاہدہ بہت تیز تھی۔ اسی لیے وہ بہت کچھ سیکھنے لگا تھا۔ اس تھیٹر کا مالک اینڈی بہت دل چسپ شخصیت کا مالک تھا۔ اسے مختلف تجربات کرنے کا بہت شوق تھا۔ آدم سے اس کی اچھی خاصی جان پہچان ہو چکی تھی اور اس نے وعدہ کیا تھا کہ بہت جلد آدم کو اپنے ڈرامے میں کام کرنے کا موقع دے گا۔ وہ ایک عام سا دن تھا جب وہ مائیکل کے ساتھ تھیٹر گیا۔ رات انہیں بہت دیر ہو گئی۔ مائیکل اسے بہانے سے بڑے اسٹور روم میں لے آیا۔ جہاں فنکاروں کے بہروپ بدلنے کا بہت سامان پڑا ہوا تھا۔ زیادہ تر لوگ جا چکے تھے۔ بس چند ہی لوگ رہ گئے تھے ، وہ بھی تھیٹر بند کر کے جانے والے تھے۔ آدم کو مختلف چیزیں دکھاتے دکھاتے ، مائیکل نے ایک دم ہی رنگ بدلا۔ پہلے تو آدم کو کچھ سمجھ ہی نہیں آئی کہ اس کے

ساتھ ہو کیا رہا ہے نشے میں دھت مائیکل اس کے ساتھ کیا کرنا چاہ رہا ہے۔ جب اس کے حواس بحال ہوئے اور اس نے شیطانیت کا روپ دیکھا، تو وہ خوف سے کانپ گیا۔ اس وقت وہ اٹھارہ سال کا ہو چکا تھا مگر مائیکل کے سامنے وہ بچہ ہی تھا۔ مائیکل نے اس کی منہ پر سختی سے ہاتھ رکھا ہوا تھا۔ اپنے بچاؤ کی کوشش کرتے ہوئے کوئی چیز اس کے ہاتھ لگی جو اس نے مائیکل کو دے ماری اور اس کی گرفت کمزور ہوتے ہی وہ اسے خود پر سے دھکا دیتے ہوئے دروازے کے طرف بھاگا۔ مائیکل نے غلیظ گالیاں دیتے ہوئے اس کا پیچھا کیا۔ اسی وقت شور کی آواز سن کر سکیورٹی گارڈ بھاگا چلا آیا۔ اس نے آدم کا بگڑا ہوا حلیہ دیکھا اور اس کے پیچھے بھاگتے مائیکل کو بھی۔ آدم اس کے پاس رکنے کے بجائے، تیزی سے وہاں سے نکل گیا۔ وہ روتے ہوئے سڑک پر تیزی سے بھاگتا کئی بار گاڑیوں کی زد میں آتے ہوئے بچا تھا۔ اسے سمجھ نہیں آرہی تھی کہ وہ رات کے اس وقت کہاں جائے، کس سے مدد مانگے۔ مسز مارٹھا کے پاس جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ وہ مائیکل سے بہت محبت کرتی تھیں۔ وہ کبھی بھی نہ مانتیں کہ ان کا بیٹا اس حد تک گر بھی سکتا ہے۔ روتے روتے آدم، اسی پٹرول پمپ پر پہنچ گیا جہاں وہ کام کرتا تھا۔ اس نے مالک کا سامنا کرنے کے بجائے، پچھلی طرف بنے سٹور روم کا دروازہ کھولا اور وہاں چھپ

کر بیٹھ گیا۔ ساری رات اس نے روتے ہوئے گزاری۔ ابا کو آوازیں دیتے ہوئے، وہ بہت تڑپا تھا۔ وہ کہیں بھی چلا جائے، اس کی بد قسمتی ہمیشہ اس کے ساتھ رہتی تھی۔ نہ جانے کس وقت اس کی آنکھ لگ گئی۔ جب اسے اپنے پاس کھٹکا سا محسوس ہوا اور وہ فوراً ہی ڈر کر اٹھ بیٹھا۔ سامنے پٹرول پمپ کا مالک، وہ بوڑھا خبطی انکل جان کھڑا اسے گھور رہا تھا۔ مگر اس نے اسے کچھ نہیں کہا۔ آدم کے پھٹے کپڑے اور گردن اور چہرے پر تھپڑوں اور ناخنوں کی نشان، بہت سی ان کہی کہانیاں سن رہے تھے۔ وہ خاموشی سے پلٹ گئے۔ کچھ دیر بعد واپس آئے اور ہاتھ میں پکڑا شاپر بیگ اس کی طرف بڑھایا۔

”کپڑے بدل کر اندر آ جاؤ۔ میں ناشتے پر تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔“

وہ کہتے ہوئے چلے گئے۔ آدم نے کپڑے بدلے اور نلکے سے منہ ہاتھ دھویا۔ وہ پہلے کبھی ان کے گھر نہیں گیا تھا۔ اس لیے کچھ جھجک رہا تھا۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ انکل جان کی فیملی میں اور کون کون ہے؟ وہ لکڑی کا بیرونی دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا، تو اس کا استقبال خاموشی نے کیا۔ انکل جان کا گھر سلیقے سے سجا ہوا اور صاف ستھرا تھا۔ وہ چند قدم چل کر ایک جگہ رک گیا۔ اسے سمجھ نہیں آرہی تھی کہ اب وہ کیا کرے، اس کی سوچی ہوئی آنکھیں اور رویا ہوا چہرہ منہ دھونے کے باوجود

بھی اسی طرح تھا۔ اسی وقت انکل جان، ہاتھ میں ٹرے پکڑے ایک کمرے سے برآمد ہوئے۔ وہ سمجھ گیا کہ یہ کچن ہو گا۔

”ینگ بوائے! تم ابھی تک یہاں کھڑے ہو۔ آج اگر میں مہربان ہوں، تو اس کا ناجائز فائدہ مت اٹھائو۔ جلدی سے ناشتا کر لو، پھر پٹرول پمپ کی صفائی کے بعد اسے کھولنا بھی ہے۔“

انکل جان نے مخصوص تحکمانہ لہجے میں کہا۔ آدم نے گھبرا کر جلدی سے کہا۔

”آپ ناشتا رہنے دیں۔ مجھے ویسے بھی بھوک نہیں، میں کام شروع کرتا ہوں۔“

آدم کہتا ہوا جلدی سے مڑا۔ وہ کسی کا بھی سامنا نہیں کرنا چاہتا تھا۔

”میں نے تم سے مشورہ نہیں مانگا۔ تمہارا کیا مطلب کہ میں نے ناشتے میں آج جو فیاضی کا مظاہرہ کیا ہے، وہ ایسے ہی رہ جائے گا۔ چلو آؤ جلدی سے۔ مجھے ٹھنڈے ناشتے سے چڑ ہے۔“

انکل جان نے کہتے ہوئے، اسے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا اور ڈرائنگ روم میں چلے گئے۔ آدم بھی خاموشی سے ان کے پیچھے چل پڑا۔ میز پر گرما گرم ناشتا، اس کا منتظر تھا۔ آدم ایک کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا۔

”اس مراقبے کے بعد، کیا تم ناشتا کرو گے؟“ آدم کو خاموشی سے سر جھکا کر بیٹھا دیکھ کر انکل جان بولا۔

”آپ کی باقی فیملی بھی آجائے، اس لیے انتظار کر رہا تھا۔“ آدم نے آہستگی سے کہا۔ سلاؤس پر جیم لگاتے ہوئے، ایک لمحے کے لیے انکل جان کے ہاتھ رک گئے۔

”تمہاری طرح، میرا بھی کوئی نہیں ہے۔ ناشتا شروع کرو!“ انکل جان نے کہا، تو وہ چونک کر ان کی طرف متوجہ ہوا۔

”میری طرح! آپ کو کیسے پتا؟“ آدم نے بے ساختہ پوچھا۔ پھر ایک دم ہی چپ ہو گیا۔

”جن کے اپنے ہوں نا، وہ اتنے تنہا اور اکیلے نظر نہیں آتے۔“ انکل جان نے جوس کا گھونٹ بھرا۔ یہ سن کر آدم ساکت رہ گیا۔ پھر اس نے آہستہ سے ہاتھ سلاؤس کی طرف بڑھایا، تو اس کا ہاتھ کانپ رہا تھا۔ انکل جان نے دیکھا، مگر کچھ کہا نہیں۔ اسی وقت وہ دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ اس کے اندر کی توڑ پھوڑ، اب برداشت سے باہر ہو چکی تھی۔ کچھ دیر تک انکل جان نے اسے رونے دیا۔ جب وہ رو چکا، تو انکل جان نے ٹشو پیپر اس کی طرف بڑھایا، جسے آدم نے خاموشی سے تھام لیا۔

”آنسوؤں کی زبان، صرف وہ رب ہی جانتا اور سمجھتا ہے۔ میں تمہارے منہ سے، تمہاری کہانی سننا چاہوں گا۔“ انکل جان نے کہا تو کچھ دیر کی خاموشی کے بعد آدم نے بولنا شروع کیا۔ آنکھ کھلنے سے لے کر آج تک کی سب باتیں، سب دکھ، اس کے سامنے کھول کر رکھ دیے۔ وہ چپ ہوا، تو انکل جان کتنی دیر بول ہی نہیں سکے۔

”مجھے لگتا تھا کہ دنیا میں صرف میرا دکھ ہی سب سے بڑا ہے، مگر آج اندازہ ہوا کہ ایسا نہیں ہے۔“ انکل جان نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔

”آپ کا دکھ؟“ آدم نے حیرت سے سوال کیا۔

”ہاں! تمہیں کیا لگتا ہے کہ صرف تم ہی اس معاملے میں فیاضی سے نوازے گئے ہو۔“ انکل جان نے اداسی سے مسکراتے ہوئے کہا، مگر ان کی آنکھوں میں نمی پھیل گئی تھی۔

”بہت سال پہلے، جب میں امنگوں اور زندگی سے بھرپور تھا۔ میں نے محبت کی ریت پر ایک چھوٹے سے گھر کی بنیاد رکھی تھی۔ کیتھی میری محبت تھی اور میری دنیا بھی۔ اس کی ایک مسکراہٹ کے لیے میں کچھ بھی کرنے کو تیار رہتا تھا۔ میری ساری دنیا اس سے شروع ہو کر اسی پر ختم ہوتی تھی۔ کتنے سال تو مجھے یہ لگتا رہا

کہ وہ بھی مجھ سے بہت محبت کرتی ہے۔ ہمارے تین پیارے پیارے بچے تھے۔ بیٹا تقریباً تمہاری عمر کا تھا اور اس کے بعد دو جڑواں بیٹیاں تھیں۔ میں اپنے گھر کے لیے دن رات محنت کرتا رہا۔ انہیں بہتر سے بہتر زندگی دینے کی کوشش کرتا رہا مگر نہ جانے ہمارے گھر کو کس کی نظر لگ گئی۔ شادی کے اتنے سال گزرنے کے بعد، اچانک کیتھی کو لگنے لگا کہ میں اس کے جوڑ کا نہیں ہوں۔ اسے مجھ میں بہت سی خامیاں نظر آنے لگیں اور مجھ سے شکوے رہنے لگے۔ میں اس صورت حال سے بری طرح پریشان تھا۔ میرے بچے بھی مجھ سے زیادہ، اپنی ماں کے قریب تھے۔ بیٹا تو بالکل، اپنی ماں کی کاپی تھا۔ عادتوں میں بھی اور مزاج میں بھی۔ دونوں بیٹیاں پھر بھی مجھ سے محبت کرتی تھیں مگر ماں کی وجہ سے اکثر نظر انداز بھی کر جاتی تھیں۔ ایک دن مجھے اس تبدیلی کی وجہ بھی مل گئی۔ میری بیوی کو اچانک اس کا پرانا محبوب مل گیا تھا اور وہ اس کے ساتھ دوبارہ سے تجدید وفا کرنا چاہتی تھی۔ تم جانتے ہو آدم! ایک عورت کی سب سے بڑی خوبی اس کی وفا ہوتی ہے اور سب سے بڑی خامی اور بد صورتی اس کی بے وفائی۔

میری بیوی نے چالاکی سے میرے بچوں کو بھی مجھ سے بد ظن کر دیا اور پھر مجھ سے لڑ جھگڑ کر گھر چھوڑ کر چلی گئی اور عدالت میں کیس کر کے، میری جائیداد کا

ایک بڑا حصہ اپنے نام کروا لیا۔ میرے پاس صرف یہ پٹرول پمپ بچا تھا۔ یہ بھی منظور تھا مجھے اگر وہ مجھے چھوڑ کر ایک خوش گوار اور مطمئن زندگی گزارتی، مگر...!”

انکل جان کی نیلی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ آدم دم بہ خود انہیں سن رہا تھا۔

”مجھے چھوڑ کر وہ بہت خوش و مطمئن تھی۔ بچے بھی اس کے پاس تھے۔ جب ایک رات اپنے بوائے فرینڈ کے فارم ہاؤس پر ہونے والی پارٹی سے واپسی پر، تیز رفتاری اور نشے میں ہونے کی وجہ سے ان کی کار حادثے کا شکار ہو گئی اور وہ سب موقع پر ہی جاں بحق ہو گئے۔“

انکل جان کتنی ہی دیر روتے رہے۔ آدم کی آنکھوں میں بھی آنسو تھے۔ دکھ کسی کا بھی ہو، اگر اسے محسوس کرنے کی حس موجود ہے، تو وہ دکھ رلاتا ضرور ہے۔ آدم بھی ان کے ساتھ رو رہا تھا۔

”جن سے محبت کی جاتی ہے، ان کی سلامتی کی دعا ہر سانس کے ساتھ دل سے نکلتی ہے اور میرے بچے، جن کے بغیر میں نے کبھی کوئی کرسمس، کوئی خوشی نہیں منائی تھی۔ ان کے جانے کے بعد میں نے ہر خوشی کے دروازے اپنی ذات پر بند کر دیے ہیں۔“ انکل جان نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔

”خیر یہ سب تمہیں اس لیے نہیں بتایا کہ تم یہ جان سکو کہ میں کتنا اکیلا اور دکھی ہوں۔ میں نے تمہیں یہ سب اس لیے بتایا ہے کہ تم یہ جان سکو کہ زندگی کبھی بھی، کسی کے لیے نہیں رکتی، چاہے کوئی کتنا پیارا اور قریبی ہی کیوں نہ ہو، اسے چلتا ہی رہنا ہے۔ جب آپ اس بات کو سمجھ جاتے ہیں کہ زندگی کا نام ہی روانی ہے تو پھر آپ جانے والی چیز کا ماتم نہیں کرتے۔ زندگی میں کچھ مستقل نہیں ہے، سوائے اس کے تغیر کے... تمہیں رب نے دوسروں سے مختلف بنا کر کیوں بھیجا۔ اب اس کا رونا رونے کے بجائے، اپنی زندگی کو بہتر بنانا سیکھو۔ تم بھی دنیا میں اپنے مخصوص وقت کے لیے ہی بھیجے گئے ہو۔ اس وقت میں جو کر سکتے ہو کر لو۔ چاہے تو مظلومیت کا ٹیگ لگا کر دوسروں سے ہمدردی بٹورتے رہو یا پھر خود اتنے مضبوط بن جاؤ کہ کوئی تمہارے اصل تک پہنچ ہی نہ سکے۔ دنیا کا ایک اصول ہے، جو جھکتا ہے، وہ اسے جھکاتی ہے۔ تم دنیا میں زندہ رہنا چاہتے ہو، تو سب سے پہلے اپنی کمزوریوں پر قابو پانا سیکھو اور اس کے لیے تمہیں محنت کرنی پڑے گی۔“

آدم نے اثبات میں سر ہلایا۔ پھر وہاں سے اس کی زندگی کا نیا باب شروع ہوا۔ اس نے انکل جان کے ساتھ رہائش اختیار کر لی۔ مسز مار تھا ایک دن اس سے ملنے آئیں اور بغیر کچھ کہے اس کا سارا سامان دیں گئیں۔ ان کی خاموشی کا مطلب ناراضی تھا

یا کچھ اور آدم نہیں سمجھ سکا۔ اس نے لوگوں کے بارے میں سوچنا چھوڑ دیا تھا۔ اس نے اپنی زندگی بہت سے حصوں میں بانٹ لی تھی۔ صبح کالج، دوپہر کو پٹرول پمپ پر کچھ گھنٹے گزار کر وہ شام کو مارشل آرٹس کی کلاسز لیتا تھا۔ وہاں سے واپسی پر وہ ایک میوزک اکیڈمی جاتا اور رات کو پھر پٹرول پمپ پر ڈیوٹی دیتا۔ وہ فارغ وقت میں شیشے کے سامنے کھڑے ہو کر چلنے کی پریکٹس کرتا۔ اپنی چال میں اسے کوئی خامی یا کمی نظر آتی تو وہ اسے دور کرنے کی کوشش کرتا، اپنے بولنے کے انداز میں بھی بہت تبدیلی لے آیا تھا۔ غرض اسے اپنی ظاہری شخصیت میں جو جو کمی لگتی وہ اس پر پوری طرح سے محنت کرتا۔ اس نے بہت سے سسلیمنٹ اور ہارمونز کی میڈیسن لینی شروع کر دیں اور مارشل آرٹس کے بعد جم جوائن کر لیا۔ وہ باڈی کو بہتر سے بہتر شپ دینے کے لیے بہت محنت کر رہا تھا۔ انکل جان کی راہنمائی اسے پوری طرح حاصل تھی۔ وہ اسے اس کی کمی سے لڑنا سکھا رہے تھے۔ اسے طرح دن گزرتے گئے۔ پھر ایک دن آدم جو اب ایڈم یا ایڈی کے نام سے جانا جاتا تھا۔ اسی تھیٹر گیا، جہاں کبھی اس نے اپنی زندگی کا تلخ لمحہ دیکھا تھا۔ اس کی شخصیت بہت سحر انگیز اور اٹریکٹو ہو گئی تھی۔ اس نے تھیٹر کے مالک اینڈی کو اس کا وعدہ یاد دلایا۔ اینڈی اس سے مل کر بہت متاثر ہوا اور اس نے بہت جلد اسے اپنے

ڈارے میں ایک بہت اہم رول دیا۔ جب اس نے وہ پرفارم کیا تو سارا ہال تالیوں سے گونج اٹھا۔ یہ سب مائیکل نے بھی دیکھا۔ وہ آج بھی وہاں موجود تھا مگر ترقی نہیں کر پایا تھا۔ شو ختم ہونے کے بعد وہ اچانک ہی مائیکل سے ملنے اس کے پاس پہنچ گیا۔ مائیکل اسے دیکھ کر بہت حیران ہوا۔

”تمہارا ایک حساب چکانا تھا۔“ کہتے ہوئے، آدم نے زور کا ایک بچ اس کے منہ پر مارا۔ مائیکل الٹ کر پیچھے کی طرف گرا اور اس کے منہ سے خون بہنیلگا۔ وہ پلٹ کر جانے لگا جب اسی رات والے سکیورٹی گارڈ نے اسے پہچان کر روکا تھا۔

”تم نے بہت اچھا جواب دیا اس خبیث کو۔ تمہارے بارے میں پوچھنے ایک عورت بھی آئی تھی جو شاید تمہاری کوئی جاننے والی تھی اور تمہارے گھر نہ لوٹنے کی وجہ سے بہت پریشان بھی تھی۔ میں نے اسے تمہارے ساتھ ہونے والے واقعے کے بارے میں بتا دیا تھا، وہ بہت پریشان اور روتے ہوئے یہاں سے گئی تھی۔ کیا وہ تمہاری ماں تھی؟“ اس نے گم صم کھڑے آدم سے پوچھا۔

”ماں نہیں، ماں جیسی ضرور تھی۔“ آدم نے کہا اور وہاں سے چلا گیا۔ پھر وہ مسز مارتھا سے ملنے ان کے اسکول گیا، تو پتا چلا کہ وہ فالج کا شکار ہو کر ہسپتال میں داخل ہیں۔ آدم بھاگتا ہوا ہسپتال پہنچا۔ ایک بیڈ پر اکیلی لیٹی وہ منتظر نظروں سے

دروازے کی طرف دیکھ رہی تھیں۔ آدم کو دیکھتے ہی ان کی بھتی ہوئی آنکھوں میں روشنی بڑھ گئی۔ آدم نے روتے ہوئے ان کی پائوں چھوئے، وہ بول نہیں سکتی تھیں اور نہ ہی اپنا سیدھا ہاتھ اٹھا سکتی تھیں، مگر ان کا بایاں ہاتھ پوری حرکت کرتا تھا جس سے اشارہ کر کے انہوں نے آدم کو اپنے پاس بلایا اور اس کی چہرے پر محبت سے ہاتھ پھیرا اور لرزے ہاتھوں سے اس کے آنسو صاف کیے۔ آدم نے کافی وقت وہاں گزارا اور جب ملاقات کا وقت ختم ہوا تو وہ وہاں سے اٹھ گیا، مگر اگلی صبح آنے کا وعدہ کر کے اور اگلی صبح جب وہ ان کے لیے پھول لے کر پہنچا، تو اسے پتا چلا کہ مسز مار تھا کی کل رات ہی موت واقع ہو گئی تھی۔ آدم روتے ہوئے قبرستان پہنچا اور پھول ان کی قبر پر رکھ کر واپس لوٹ آیا مگر کتنے ہی دن وہ اُداس پھرتا رہا۔ اس نے ابا کو خط لکھ کر بھی یہ اطلاع دی تھی، مگر وہاں سے کوئی جواب نہیں آیا تو وہ بہت پریشان ہوا اس نے اسکول کے نمبر پر کال کر کے خدا بخش کے بارے میں پتا کیا، تو اس کے سر پر آسمان ٹوٹ پڑا۔

”خدا بخش کا ایک مہینے پہلے ہی انتقال ہو چکا تھا۔“ آدم یہ سن کر دھاڑیں مار مار کر رویا، وہ اس کے سوا کر بھی کیا سکتا تھا۔ اسے کسی نے بتانا ضروری ہی نہیں سمجھا اور اسے بتاتا بھی کون؟ اس کا وہاں اور تھا ہی کون سوائے ابا کے۔ آگے پیچھے ہونے

والی ان اموات نے اسے بہت خاموش اور گم صم سا کر دیا تھا۔ وہ پہلے ہی اپنے مذہب سے دور تھا۔ خدا بخش کے انتقال نے اسے اور بھی دور کر دیا۔ وہ دل ہی دل میں خدا سے خفا ہو کر آزادانہ روش پر چل نکلا۔ اس کی تعلیم مکمل ہو چکی تھی اور اسے ایک اچھی جاب بھی مل گئی۔ مگر اس کے ساتھ ساتھ وہ فلم میکینگ اور فیشن ڈیزائنگ میں تعلیم بھی حاصل کرنے لگا۔ انکل جان کا خیال وہ اپنے باپ کی طرح رکھتا تھا۔ انکل جان بہت بوڑھے اور کمزور ہو گئے تھے۔ ان کی ساری دیکھ بھال اب آدم کے ذمے تھی جسے وہ بہ خوبی نبھا رہا تھا۔ اس نے اپنی سیونگ سے انکل جان کے ساتھ شراکت داری کر لی اور وہاں سے ترقی کرتا رہا۔ انکل جان اس کی ہر کامیابی پر بہت خوش ہوتے اپنے آخری دنوں میں انکل جان بار بار کہتے تھے کہ آدم نے ان کی اولاد سے بڑھ کر خدمت کی ہے۔ انہوں نے اپنے حصہ بھی اس کے نام کرنا چاہا مگر آدم نے منع کر دیا اور کہا کہ وہ اپنے حصے کو ویلفیئر کر دیں۔ اسے اس کی ضرورت نہیں ہے اور بہت سے لوگوں کو اس کی ضرورت ہو گی۔ انکل جان کو اس کی تجویز بہت اچھی لگی اور اپنی زندگی ہی میں انہوں نے اپنا حصہ ایک ٹرسٹ کو دے دیا۔ آدم انکل جان کو اپنے ساتھ، لے گیا اور ان کی آخری سانس تک خدمت کی۔

آدم کے پاس دولت بھی تھی اور شہرت بھی۔ وہ اپنے سرکل میں جانا پہچانا جاتا تھا۔ اس کے پاس سب کچھ موجود تھا، مگر اس کے باوجود وہ ایک ان دیکھی آگ میں جلتا رہتا تھا۔ اعلیٰ سے اعلیٰ شراب کا نشہ بھی اسے مدہوش نہیں ہونے دیتا تھا کہ کہیں اس کا سچ کسی کے سامنے نہ آجائے۔ وہ گرل فرینڈز بھی بناتا تھا اور ان کے ساتھ وقت بھی گزارتا تھا مگر ایک حد سے آگے کبھی نہیں گیا تھا۔ وہ اپنی دولت کو دونوں ہاتھوں سے ان پر لٹاتا تھا، ان کی ہر خواہش پوری کرتا تھا۔ اسی وجہ سے لڑکیاں اس سے دوستی کرنے کے لیے پاگل تھیں۔ ایک آزاد معاشرے میں رہتے ہوئے، اس کے لیے اپنی کمی سے لڑنا مشکل ہوتا جا رہا تھا۔ اس کا نفس اسے مختلف راستے دکھانے لگا تھا۔ وہ شاید ان پر چل بھی پڑتا اگر اسے یہ خوف نہ ہوتا کہ وہ سب کے سامنے عیاں ہو جائے گا جس شخصیت کو بنانے اور سنوارنے میں اسے اتنے سال لگے، وہ اس طرح سب کے سامنے کمزور پڑ جائے، یہ اسے منظور نہیں تھا۔ ان دنوں اسے فلم بنانے کا جنون چڑھا اور اس نے مختلف لوگوں سے رابطے شروع کر دیے۔ جب اس کی ملاقات شہرام سے ہوئی اور یوں اسے پاکستان آنے کا بہانہ مل گیا۔ پاکستان آنے کی دو وجوہ تھیں، ایک خدا بخش کی قبر پر جانا اور دوسرا وہ نازک مزاج، نک چڑھی لڑکی جسے اتنے سال گزرنے کے باوجود وہ نہیں بھولا

تھا۔ بھولتا بھی کیسے۔ وہ اس کی ذات تک پہنچنے کا پہلا حوالہ بنی تھی۔ نہ وہ اسے ٹھکراتی اور نہ وہ اسکول سے نکالا جاتا اور نہ وہ یہاں تک پہنچتا۔ پاکستان آنا، اس کی اپنی دلی خواہش تھی جسے وہ شہرام کے کندھے پر رکھ پورا کر رہا تھا۔ یہاں آکر اس نے سب سے پہلا کام جو کیا، وہ خدا بخش کی قبر کو ڈھونڈنے کا تھا جو اسکول میں اسے پرانے لوگوں کی مدد سے مل گئی جو اس کے ساتھ کام کرتے تھے۔ خدا بخش کی قبر پر حاضری دینے کے بعد اس نے، اس کے گھر والوں کی تلاش شروع کر دی اور کافی تگ و دو کے بعد بالآخر انہیں ڈھونڈ ہی لیا۔ کلثوم، پہلے تو اسے پہچان ہی نہیں سکی۔ اتنا شاندار شخص بھلا اس کا واقف کار کیسے ہو سکتا تھا۔ وہ غربت کی لکیر سے نیچے زندگی گزار رہی تھی۔ بچے اس کے نافرمان اور نکلے نکلے تھے۔ کلثوم کو اس عمر میں لوگوں کے گھروں میں کام کرنا پڑتا تھا۔ پھر بھی وہ اپنے دونوں بیٹوں اور ان کی بیویوں سے ذلیل ہوتی تھی۔ دونوں بڑی بیٹیاں شادی شدہ اور اپنے اپنے گھر بار کی تھیں مگر وہ بھی سسرال میں خوش نہیں تھیں۔ کلثوم کے ٹوٹے ہوئے دروازے کے سامنے جب وہ اپنی شاندار کار سے نیچے اترا، تو محلے کے سب لوگ تجسس کے مارے اس کی گرد جمع ہونے لگے۔

کلثوم کے گھر میں ایک افراط فری مچ گئی کہ اتنے شاندار مہمان کو کہاں بٹھائیں۔ آدم نے جب کلثوم سے اپنا تعارف کروایا، تو وہ حیرت سے دنگ رہ گئی اور پھر اس کے سامنے ہاتھ جوڑتے ہوئے پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ آدم یہاں اسے شرمندہ کرنے نہیں آیا تھا۔ وہ صرف ابا کے بارے میں جاننے آیا تھا۔ کلثوم نے بتایا کہ خدابخش آخری چند سالوں میں بہت بیمار رہنے لگا تھا۔ وہ اکثر اس کے خط لے کر بیٹھا بار بار پڑھتا رہتا تھا، حتیٰ کہ اس نے مرتے وقت یہ وصیت بھی کی تھی کہ ان خطوط کو اس کے ساتھ ہی دفنایا جائے۔ وہ یہ کسی کے سپرد کر کے نہیں جانا چاہتا تھا۔ خدابخش کے مرنے کے بعد ان کے حالات خراب سے خراب تر ہوتے گئے۔ اب کلثوم کو اپنی زیادتیوں کا احساس ہونے لگا تھا، مگر افسوس کہ وقت اس کے ہاتھ میں نہیں رہا تھا۔ سرخ آنکھوں کے ساتھ، جب آدم وہاں سے اٹھا، تو بہت دل گرفتہ تھا۔ ابا ہی وہ شخص تھا جس نے اسے زندگی دی، چھوٹے سے چڑیا کے بوٹ جیسے بچے کو سرد و گرم راتوں میں سینے سے لگائے پھرتا تھا۔ اپنے جسم سے اس کے بدن کو حرارت پہنچاتا تھا۔ کیوں کہ اس کے پاس اتنے پیسے نہیں ہوتے تھے کہ وہ اسے سرد و گرم لباس دلا سکے۔ وہ اپنے منہ کے نوالے اس کے منہ میں ڈالتا تھا کہ وہ خود تو بھوک برداشت کر سکتا تھا مگر وہ ننھی سی جان بھوک کی

شدت سے رونے لگتی تھی۔ آدم اس دن چینی مار مار کر رویا۔ اللہ سے ناراضی شدت اختیار کر چکی تھی۔ اسے لگتا تھا کہ اس نے ہمیشہ، اس سے سب چھینا ہی ہے، اسے دیا کچھ بھی نہیں۔ آدم نے کلثوم کا وظیفہ مقرر کر دیا اور اس کے بیٹوں کو کریانے کی دکان کھول دی تاکہ وہ روزگار کما سکیں۔ کلثوم اس احسان کے لیے، اس کی شکر مند تھی مگر آدم نے یہ کہہ کر بات ختم کر دی۔

”میں یہ سب صرف ابا کے لیے کر رہا ہوں کیوں کہ وہ اگر آج زندہ ہوتے تو، یہی سب کرتے جو میں نے کیا ہے۔“

آدم کی بات نے کلثوم کو لاجواب کر دیا۔ شہرام کے ساتھ اس کا پروڈکشن ہائوس بہت کامیاب چل رہا تھا۔ انہوں نے جو مختلف تجربات کیے، انہیں بے حد سراہا گیا۔ ان دنوں جب وہ اپنی نئی فلم کے لیے آڈیشن لے رہے تھے، ایک نئے اور خوبصورت چہرے نے اپنی اپنی جگہ دونوں کو حیران کر دیا تھا۔ شہرام فارینہ کے بے تحاشا حسن اور ذہانت سے متاثر ہوا تھا۔ جب کہ آدم کا معاملہ ذرا ہٹ کر تھا۔ فارینہ وہ لڑکی تھی جس نے اسے توڑ کر پھر سے بننے کی ہمت عطا کی تھی۔ وہ فارینہ کو پہلی ہی نظر میں پہچان گیا تھا۔ اسے فارینہ کبھی نہیں بھولی تھی، مگر فارینہ اسے فوراً نہیں پہچان سکی تھی۔ اسی لیے آدم کے دیکھنے سے وہ الجھن محسوس کرتی تھی

۔ آدم اسے کن انکھیوں سے دیکھتا رہتا تھا۔ پہلے پہل فارینہ اسے اپنا وہم سمجھنے لگی، اس کی نظریں عجیب طرح کی تھیں، کچھ کہتی ہوئیں اور کچھ سوال کرتی ہوئیں۔ بارہ ، تیرہ سال کا عرصہ کچھ کم ، تو کچھ زیادہ بھی نہیں تھا کہ وہ اسے نہ پہچان پاتی اور جب وہ اسے پہچان گئی تو حیرت سے دنگ رہ گئی۔

”تم!“ فارینہ نے حیرت سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا، تو اس نے مسکراتے ہوئے سر خم کیا تھا۔

”جی آپ کا خادم! ویسے داد دیتا ہوں تمہاری یادداشت کو۔ بہت جلد پہچان گئی تم اپنے بچپن کے دوست کو۔“ آدم نے بظاہر مسکراتے ہوئے کہا مگر اس کے لفظوں کی کاٹ فارینہ محسوس کر گئی تھی۔

”شٹ اپ! تم نہ کل میرے دوست بننے کے قابل تھے اور نہ ہی آج میں تمہیں اس قابل سمجھتی ہوں۔ تمہارا یہ بہروپ دوسروں کے لیے متاثر کن ہو گا۔ میرے لیے نہیں۔“

فارینہ نے نخوت سے کہا، تو آدم اس کے چہرے کی طرف دیکھ کر مسکراتا رہا۔
”اچھا تو تمہیں کیسے متاثر کیا جاسکتا ہے۔“ آدم کا انداز تمسخرانہ لگا فارینہ کو۔ اسی لیے وہ مزید تپ کر بولی۔

”کم از کم اس زندگی میں تو تمہاری یہ خواہش پوری نہیں ہو گی۔“
”اچھا کوئی بات نہیں۔ تمہارے لیے اگلی زندگی تک بھی انتظار کر سکتا ہوں۔“ آدم سنجیدگی سے کہتا اور فارینہ غصے میں پیڑ پٹختی وہاں سے چلی جاتی۔ ان دونوں کے درمیان اکثر نوک جھوک رہنے لگی تھی۔ فارینہ نے اگر معاہدہ نہ کیا ہوتا تو وہ کب سے یہ فلم چھوڑ بھی چکی ہوتی مگر وہ فلم کا ادھاکام مکمل کر واپسی تھی۔ اسی دوران شہرام نے اسے ایک اور پروجیکٹ کے لیے بھی سائن کر لیا۔ آدم سے لاکھ اختلاف سہی مگر وہ یہ بھی بہت اچھی طرح جانتی تھی کہ اس کی پوزیشن بہت مضبوط ہے۔ اگر وہ آدم سے بگاڑ لیتی تو اسے اپنی سمت تبدیل کرنی پڑتی جس کے لیے وہ فی الحال تیار نہیں تھی۔ وہ جانتی تھی کہ پاکستان فلم انڈسٹری زوال کا شکار ہے اور آدم کا جرأت مندانہ قدم تازہ ہوا کی جھونکے کی طرح تھا۔ سب سے بڑی بات، آدم کی زیر سرپرستی بننے والی فلمیں انٹرنیشنل لیول پر ریلیز کی جاتی تھیں۔ اسے آدم سے زیادہ، اپنے امیج کی فکر تھی، اپنے کیریئر کا خیال تھا، اسی لیے وہ آدم کو جتنا ہو سکتا تھا نظر انداز کرتی رہتی تھی مگر شاید آدم اس کی یہ کمزوری جان گیا تھا۔ اسی لیے وہ فارینہ کو زچ کرنے کا کوئی بھی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتا تھا۔ فارینہ پہلے تو ضبط کرتی رہتی۔ پھر وہ بھی چھوٹی سے چھوٹی بات پر برہم ہونے لگی۔ شہرام کے

سامنے یہ سب معمول کی بات بن گئی تھی۔ وہ دونوں کے درمیان پل کا کام کرتا تھا۔

فارینہ نے ایک دو بار نوٹ کیا کہ آدم، اس کے لیے کچھ خاص احساسات رکھتا ہے۔ جیسے وہ اس کا کسی کے ساتھ زیادہ فری ہونا یا دوستی کرنا برداشت نہیں کرتا تھا۔ حتیٰ کہ شہرام کے ساتھ بھی۔ بہت بار ایسا ہوا کہ فارینہ نے جان بوجھ کر شہرام کی بات کو اس کی بات پر فوقیت دی تو آدم غصے سے بھرا، وہاں سے اٹھ جاتا تھا۔ ایک بار اسی بات پر دونوں میں بحث ہو گئی۔

”تمہیں اس سب سے مطلب نہیں ہونا چاہیے کہ میں اپنی ذاتی زندگی میں کس سے تعلق رکھتی ہوں اور کس سے نہیں۔“ ایک بار اس نے فیصل آفندی کے ساتھ فارینہ کو ہنس کر باتیں کرتا دیکھ لیا تھا۔ فیصل آفندی کی شہرت اچھی نہیں تھی۔ یہ بات آدم کے ساتھ ساتھ باقی سب بھی بہت اچھی طرح جانتے تھے مگر فارینہ آدم کو جلانے کے لیے اس سے قریب ہونے کا ڈراما کرنے لگی جس پر ایک دن آدم نے اسے سختی سے منع کیا، تو وہ غصے سے بول پڑی تھی۔

”مجھے مطلب ہے فارینہ! کیوں کہ میں ...“ آدم کہتے ہوئے رک گیا۔ فارینہ نے تیکھی نگاہوں سے اسے دیکھا۔

”آگے کہنے کی جرأت نہیں ہے تم میں۔“ اس نے چیلنج کیا تھا۔ وہ آدم کی حالت سے لطف اٹھاتی تھی۔ اسے اچھا لگتا تھا کہ آدم اس کے پیچھے پاگل ہو۔

”جرأت کی بات مت کرو فارینہ۔ میرے حوصلے چٹانوں کو مات دے سکتے ہیں۔“ آدم نے مضبوط لہجے میں کہا، تو فارینہ سر جھٹک کر رہ گئی اور طنزیہ ہنستے ہوئے وہاں سے جانے کے لیے مڑ گئی۔ جب پیچھے سے آدم کی آواز آئی اور اس کے قدم بے ساختہ رک گئے۔

”آدم، فارینہ سے محبت کرتا ہے۔ تب سے جب اس نے پہلی بار اسے دیکھا تھا، تب سے جب اس نے پہلی بار محبت کا معنی سمجھا تھا۔ آدم کے لیے کائنات میں اگر کوئی وجود محبت کا استعارہ ہے، تو وہ وجود صرف تمہارا ہے فارینہ۔“

آدم کی سنجیدہ آواز پر فارینہ حیرت سے مڑی، کچھ دیر تک اس کا چہرہ دیکھنے کے بعد وہ بے ساختہ کھکھلا کر ہنسی اور ہنستی ہی چلی گئی۔ آدم لب بھینچے اسے دیکھتا رہ گیا۔ آج اسے ایک بات کی سمجھ آئے تھی کہ

”محبت کے اظہار کے سامنے، محبت کا مذاق بنایا جائے تو اس سے زیادہ بد صورت لمحہ کوئی نہیں ہوتا۔“ اور وہ سختی سے ہونٹ بھینچے اسے خود پر، اپنی محبت پر ہنستا ہوا دیکھ رہا تھا۔

”سوری مگر!“ فارینہ نے اپنی ہنسی روکنا چاہی لیکن ناکام رہی۔ پھر بہ مشکل وہ اپنی ہنسی پر قابو پاتے ہوئے بولی۔

”دراصل تم نے بات ہی اتنی مزاحیہ کر دی تھی کہ میری ہنسی نہیں رک رہی۔ تم خود ہی سوچو کیا کبھی ایسا ہوا ہے کہ ایک خواجہ سرا کو کسی سے محبت ہو جائے۔ او ہو سوری مجھے شاید تمہیں یہ نہیں کہنا چاہیے تھا، مگر تمہارا سچ تو یہی ہے نا۔ جسے تم چھپانے کی کوشش کرنے میں بہت حد تک کامیاب ہوئے ہو مگر تم ایک جگہ غلطی کر گئے۔“ فارینہ ایک دم ہی سنجیدہ ہوئی۔ جب کہ آدم کا رنگ فق ہو چکا تھا۔ فارینہ کے منہ سے اپنے لیے یہ سچ سنا، اس کے لیے بہت تکلیف دہ تھا۔

”تمہارے جیسے لوگوں کو میں خیرات تو دے سکتی ہوں مگر اپنا دل نہیں۔ فارینہ ہاشم پر ابھی اتنا برا وقت نہیں آیا کہ وہ ایک خواجہ سرا کی محبت میں مبتلا ہو گی۔“ فارینہ نے نفرت سے کہا اور حقارت بھری نگاہ اس پر ڈال کر وہاں سے چلی گئی۔ جب کہ آدم نے بے اختیار سر اٹھا کر اوپر والے سے شکوہ کیا۔

”پھر میرے دل میں کیوں، اس عورت کی محبت ڈالی جو مجھے سب سے کمتر سمجھتی ہے۔ بنانے والے تُو نے خواجہ سرائوں کے سینے میں دل کیوں بنایا۔ اگر بنایا تھا تو

اس کی پرواز، اس کی خواہش محدود کیوں نہیں رکھی۔“ وہ پھر اس سے ناراض ہوا اور بہت شدید۔

آدم کا حال، فارینہ کے سامنے مجنوں کی طرح ہو گیا تھا، وہ صرف اس کی ایک نظر، ایک میٹھے لفظ کے لیے اس کے آگے پیچھے پھرتا، مگر وہ تھی کہ پتھر کی مورت بنی رہتی۔ اس دن ریسٹورنٹ میں جب شہرام نے انہیں ایک نئے پروجیکٹ کے لیے بلایا اور خود لیٹ ہو گیا۔ تب بھی فارینہ اور آدم کے درمیان یہ بحث چھڑ گئی تھی جسے اٹھانے میں زیادہ ہاتھ اس کا اپنا ہوتا تھا۔ اسی ضد میں، اس نے شہرام کے پرپوزل پر آدم کے سامنے ہاں کرتے ہوئے جلد شادی کی شرط رکھی۔ یہ سنتے ہی آدم شدید ذہنی اور دلی دھچکے کا شکار ہوا تھا۔ فارینہ یہی تو چاہتی تھی۔ وہ سمجھتی تھی کہ آدم اس سے بدلہ لینے کے لیے کسی بھی حد تک چلا جائے گا۔ شہرام کے ساتھ ہونے والا حادثہ اور پھر اس کا اغوا اسی سلسلے کی کڑی لگی۔ فارینہ کے اغوانے اسے بھی شدید دھچکا پہنچایا تھا۔ اس نے اپنے خفیہ ذرائع سبجو لوکیشن، معلوم کی تھی وہ ایک کچی بستی کی تھی۔ اس دن جب وہ وہاں پہنچا، تو اس کی ملاقات اسی لال رنگ کے کپڑے والے ملنگ سے ہوئی جو اسے مختلف مواقع پر ملتا رہا تھا۔ آدم کو اپنی بستی میں دیکھ کر وہ مسکرا کر بولا۔

”دیکھ لے! اب ہم نہیں، تو ہمارے پاس آیا ہے۔“ آدم ذہنی طور پر بہت تھک چکا تھا۔ اس نے کچھ دیر ملنگ کے پاس بیٹھ کر باتیں کرتے ہوئے گزاری۔ آدم نے جب ان سے پوچھا کہ وہ ایک لڑکی کی تلاش میں یہاں آیا ہے، جسے یہاں ہی کسی گھر میں رکھا گیا ہے، کیا وہ اس سلسلے میں اس کی کوئی مدد کر سکتے ہیں؟ ملنگ بابا نے اثبات میں سر ہلایا اور کچھ دیر بعد ہی بستی میں پھرنے والے بچوں نے ایک گھر کی نشاندہی کی جس کا دروازہ ہمیشہ بند رہتا ہے، مگر اکثر وہاں سے کسی کے رونے اور چیخنے کی آوازیں آتی ہیں۔ آدم جو یہ سنتے ہی اکیلا ہی اسے بچانے چلا تھا، ملنگ بابا کے منع کرنے پر رک گیا۔ ملنگ بابا نے اپنی بستی کے کچھ لوگوں کو ساتھ لیا اور وہاں کے لوگوں سے بات کی وہ بھی اس گھر کے بارے میں مشکوک تھے اور لڑکی کے اغوا کا سنتے ہی ہاتھوں میں ڈنڈے پکڑے وہاں پہنچ گئے۔ اس دوران آدم نے فون پر شہرام کو مطلع کر دیا کہ وہ جلد از جلد پولیس لے کر پہنچ جائے۔ پھر تھوڑی سی مزاحمت اور تلاشی کے بعد فارینہ انہیں مل گئی۔ ملنگ بابا کی بستی کے لوگ پاؤں میں بڑے بڑے گھنگھرو پہنتے تھے جن کی چھن چھن کی آواز دور سے آتی۔ فارینہ نے آدم کو دیکھتے ہی جس رد عمل کا مظاہرہ کیا۔ وہ آدم کے ساتھ ساتھ سب کے لیے حیران کن تھا۔ وہ وہاں سے غصے سے نکلا، تو اسی ملنگ نے اس کا راستہ روکا تھا۔

”یہ ہے تیری ساری دنیا جس کے ہاتھوں ذلیل و رسوا ہو رہا ہے تو۔“ ملنگ نے پوچھا، تو آدم کوئی جواب دیے بغیر وہاں سے چلا آیا۔ وہ زیادہ تر ملک سے باہر رہنے لگا تاکہ فارینہ سے سامنا کم ہو اور وہ اسے بھول سکے۔ وہ بہت بے دلی سے یہاں سے وائنڈ اپ کر رہا تھا۔ لا حاصل کی تمنا نے اسے تھکا دیا تھا۔ ان دنوں وہ پاکستان میں ہی موجود تھا اور اس دن فارم ہائوس پر ہونے والی پارٹی میں وہ بھی شامل تھا۔ وہ فارینہ کی آمد سے قطعی لاعلم تھا۔ وہ پارٹی میں بہت دیر سے پہنچا اور کافی دور سے سفر کر کے آیا تھا اسی لیے وہ گیٹ روم میں تیار ہونے کے لیے چلا گیا اور جب وہ اپنے کمرے سے نکل رہا تھا، اچانک اس کی نظر فیصل آفندی پر پڑی جو بہت پر اسرار انداز میں ایک کمرے کا دروازہ کھول کر اندر جا رہا تھا۔ آدم فوراً اپنے کمرے میں گیا اور اپنے سامان میں موجود ماسٹر کی نکال کر دبے قدموں سے چلتا اس کمرے کے دروازے تک پہنچا۔ اسے کسی گڑ بڑ کا احساس ہو رہا تھا۔ شہرام کے ساتھ ہونے والے حادثے میں بھی، اسے فیصل پر شک تھا، مگر اس کے پاس کوئی ثبوت نہیں تھا اور آج اسے بہتر موقع ملا تھا۔ اسے رنگے ہاتھوں پکڑنے کا۔ آدم نے بغیر آواز کیے کمرے کا دروازہ کھولا۔ فیصل اسے سامنے ہی نظر آگیا۔ اس کی پشت دروازے کی طرف تھی۔ آدم نے ذرا اور آگے ہو کر دیکھا، تو غصے کی شدید لہر اس

کے اندر اٹھی تھی۔ وہ موبائل سے تصاویر لے رہا تھا، مگر کس کی یہ آدم کو نہیں پتا تھا۔ وہ پردے کے پیچھے چھپ کر کھڑا ہو گیا۔ جب اس نے فیصل کو سامنے بیڈ پر مطمئن انداز میں لیٹتے ہوئے دیکھا۔ تھوڑی دیر بعد واش روم کا دروازہ کھلا اور کوئی باہر نکلا۔ فیصل کو کمرے میں دیکھتے ہی جب وہ چلائی تو آدم اپنی جگہ ساکت رہ گیا۔ وہ فارینہ کی آواز تھی جسے وہ بہری ہوتی سماعتوں کے ساتھ بھی پہچان سکتا تھا۔ اس کی اندر لاوا ابلنے لگا۔ فیصل کی حرکت کے بارے میں سوچ کر۔ اس نے جیب میں ہاتھ ڈال کر چھوٹا سے وائس ریکارڈر نکالا اور فیصل کی گفتگو ریکارڈ کرنے لگا۔ جب فیصل نے فارینہ کے ساتھ بدتمیزی کرنے کی کوشش کی تو وہ اس پر جھپٹ پڑا۔ اگر اور لوگ اسے بچانے نہ آتے، تو شاید وہ اسے جان ہی سے مار دیتا۔ اس دوران وہ اس کا موبائل چھپانا نہیں بھولا تھا۔ پھر پولیس آئی اور اسے تھانے لے گئی۔ جہاں سے فارینہ کے باپ اور شہرام کی مداخلت نے اسے وقتی طور پر جیل جانے سے بچا لیا۔ اس کے لیے اتنا موقع ہی بہت تھا۔ اس موبائل کو ضائع کرنے کے لیے فیصل آفندی بھی معمولی شخص نہیں تھا اسے بھی بہت سے لوگوں کی پشت پناہی حاصل تھی۔ آدم نے، فارینہ کی خاطر، ان سب سے جان بوجھ کر لڑائی لی تھی۔ وہ سب فارینہ کو تو بھول گئے مگر ان کا اصل ہدف اب آدم بن گیا تھا۔ فیصل آفندی

کے ساتھ قانونی لڑائی، لڑنے کے دوران آدم نے اپنا سب کچھ دائو پر لگا دیا۔ اس کا کیریئر، اس کی شناخت، اس کا معاشرے میں اعلیٰ مقام تک۔ وہ اگر چاہتا تو شاید ان سب سے بہت آرام سے باہر نکل بھی سکتا تھا مگر نہ جانے کیوں وہ اس لڑائی کو طول دے رہا تھا۔ اسی دوران، فیصل آفندی پر حملہ کرنے اور اسے شدید زخمی کرنے کی وجہ سے اسے کچھ مہینوں کے لیے جیل بھی جانا پڑا۔ حالاں کہ اس کے وکیل نے کہا بھی تھا کہ اگر وہ اس کیس میں فارینہ کا نام لے لے کہ اس نے فارینہ کی عزت بچانے کے لیے فیصل پر حملہ کیا تھا، تو وہ بہت آسانی سے بچ جائے گا، مگر آدم نے اس بات سے صاف انکار کر دیا۔

”اس کی عزت پر کوئی حرف بھی آئے، یہ میں برداشت نہیں کر سکتا۔“ آدم اطمینان سے کہتا۔ مرتضیٰ ہاشم اور شہرام اس کے کیس کی پیروی کر رہے تھے۔ وہ آدم کی ثابت قدمی سے بہت متاثر تھے۔ پھر بالآخر کیس کا فیصلہ آدم کے حق میں ہوا اور فیصل آفندی پر فرد جرم عائد کر کے اسے جیل بھیج دیا گیا۔

”او بھائی! کیا سو گئے ہو۔ اٹھو اسٹیشن آگیا ہے۔“ کسی نے اس کا کندھا ہلایا، تو وہ چونک کر ماضی سے حال میں لوٹا۔ اسے پتا ہی نہیں چلا اور سفر کٹ بھی گیا تھا۔

”کاش سارے سفر ایسے ہی ہوتے۔ پل بھر میں طے ہونے والے۔ بند آنکھوں سے بھی طے ہو جانے والے۔“ اس نے چادر کو اپنے گرد اچھی طرح لپیٹا اور تھکے ہوئے قدموں سے ٹرین سے اتر گیا۔

☆...☆...☆

”اس حادثے کے بعد فارینہ بالکل بدل گئی تھی اور تو اور ان دنوں آدم نے اپنے سب کام چھوڑ دیے تھے۔ وہ پاکستان سے بہت جلد جانے والا تھا۔ مجھے وہ بتا چکا تھا۔ ان دنوں وہ کہاں غائب رہتا تھا۔ کوئی نہیں جانتا تھا۔ اسی طرح کچھ مہینے چلتا رہا۔ پھر آدم ایک دم ہی منظر سے غائب ہو گیا۔ مجھے ملنے والی آخری اطلاع کے مطابق وہ واپس امریکا جا چکا تھا، مگر وہ مجھ سے مل کر نہیں گیا اور نہ ہی اپنا نیا پتا چھوڑ کر گیا تھا۔ جاتے جاتے وہ یہاں کے لوگوں سے سب رابطے اور واسطے ختم کر گیا تھا۔ میں نے کچھ عرصہ کوشش کی اسے تلاش کرنے کی مگر پھر فارینہ کی اچانک لندن جانے کے پروگرام نے مجھے پریشان کر دیا۔ میں اسے روکنے کی کوشش کرنا چاہتا تھا مگر اس کے والد کا کہنا تھا کہ وہ ان دنوں شدید ذہنی دباؤ کا شکار ہے، اسے کچھ وقت کے لیے بریک چاہیے۔ اس لیے اسے کچھ مت کہو، اسے جانے دو۔ میں نہیں جانتا تھا کہ وہ ہمیشہ کے لیے مجھے چھوڑ کر ایسے جائے گی کہ دوبارہ کبھی پلٹ کر ہی

نہیں دیکھے گی۔ اسے ڈھونڈتے، اس کا پتا تلاش کرتے میں تھک گیا ہوں۔ مرتضیٰ انکل بھی اکثر ملک سے باہر ہوتے ہیں یا شاید وہ جان بوجھ کر میرا سامنا نہیں کرنا چاہتے۔“

شہرام نے ماضی کے درتچے بند کیے۔ زویا نے اس کے اُداس چہرے کی طرف دیکھا اور بولی۔

”شہرام کیا تمہیں نہیں لگتا کہ ایڈم اور فارینہ کے درمیان کوئی خاص تعلق یا کنکشن ہمیشہ سے رہا ہے۔ مجھے حیرت تو اس بات پر ہو رہی ہے کہ جو بات میں نے اتنی دور سے سن کر جان لی، وہ تم ان کے ساتھ رہتے ہوئے نہیں جان سکے۔“

زویا نے کہا، تو شہرام بے ساختہ ہنس پڑا۔

”بیوٹی وڈ برین۔“ (حسن اور ذہانت ایک ساتھ)

ہاں تم نے ٹھیک کہا۔ یہ بات مجھے تب نہیں سمجھ آئی تھی، مگر اب میں پوری جزئیات کے ساتھ، ان کے درمیان موجود فریکوینسی کو محسوس کر رہا ہوں۔ شاید یہی وجہ ہے دونوں کی گمنامی کی۔“

شہرام نے سنجیدہ ہوتے ہوئے کہا۔

”دونوں نہیں! صرف ایڈم۔ فارینہ یہاں کہیں ہی ہے، شاید کسی مینٹل ہاسپٹل یا میں کچھ کہہ نہیں سکتی۔ یہ سچ انکل مرتضیٰ ہی ہمیں بتا سکتے ہیں۔“

زویا نے پورے اعتماد سے کہا، تو شہرام بری طرح چونکا۔
”کیا مطلب ہے تمہارا...“

”انکل مرتضیٰ اور میرے بابا۔ بہت پرانے اور قریبی دوست ہیں اور جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے، وہ اپنی بیٹی کے سلسلے میں عانیہ سے مسلسل رابطے میں رہتے تھے۔ تمہاری پہلے ان سے ملاقات نہیں ہو سکی کیوں کہ وہ ملک سے باہر گئے ہوئے تھے۔ عانیہ کی شادی پر بھی اسی لیے نہیں آئے تھے، مگر اب وہ یہاں ہی ہیں، لیکن آئی تھنک ہمیں انکل سے ملنے سے پہلے، عانیہ سے تفصیل لے لینی چاہیے۔“ زویا نے کہا، تو شہرام کے ذہن میں ایک جھماکا سا ہوا۔ اسے یاد آیا کہ اس دن، اس نے کرئل ثقلین کیانی کے ساتھ، ڈرائنگ روم میں کسی کی جھلک دیکھی تھی۔ وہ مرتضیٰ ہاشم تھے، مگر اس نے اس دن زیادہ غور نہیں کیا۔ اسی لیے انہیں پہچان نہیں پایا تھا۔ زویا نے عانیہ کو فون کیا، تو وہ اپنے کلینک میں موجود تھی۔ اس نے اسے وہاں اپنا انتظار کرنے اور رکنے کے لیے کہا۔ عانیہ بہت حیران ہوئی مگر اس نے کچھ کہا نہیں۔ تھوڑی دیر بعد زویا اور شہرام کو ایک ساتھ آتا دیکھ کر وہ حیران ہونے کے

ساتھ ساتھ خوش بھی ہوئی مگر جب شہرام نے اسے اپنا موبائل آن کر کے ایک تصویر دکھائی تو وہ چونک گئی۔

”فارینہ ہاشم۔“

”میں اس کے بارے میں سب جاننا چاہتا ہوں۔ پلیز منع مت کرنا، میری محبت کا سوال ہے۔“ شہرام نے کہا، تو عانیہ نے بے ساختہ زویا کی طرف دیکھا جس نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے اپنی نم ہوتی آنکھوں کو چھپایا تھا۔ عانیہ گہری سانس لیتے ہوئے شہرام کی طرف متوجہ ہوئی۔

”فارینہ کا کیس جب میرے پاس آیا، اس کی ذہنی حالت بہت خراب تھی۔ انکل مرتضیٰ کے کہنے کے مطابق وہ کچھ عرصہ لندن میں اپنی فیملی کے ساتھ وقت گزار کر بھی آئی تھی مگر وہاں جا کر بھی وہ اپنے ذہنی دباؤ سے چھٹکارا نہیں پاسکی۔ وہ ڈپریشن کی خطرناک اسٹیج پر پہنچ چکی تھی۔ میں نے اس کا علاج کرنے کی پوری کوشش کی مگر وہ بہت ضدی اور موڈی لڑکی تھی۔ اس کا ذہن ایک جگہ پر جیسے رک سا گیا تھا۔ وہ کسی پچھتاوے کے زیر اثر کبھی تو اونچا اونچا رونے لگتی اور کبھی بالکل گم صم ہو جاتی۔ حتیٰ کہ اس پر میڈیسن بھی اثر نہیں کر رہی تھی۔ اس کے ساتھ اصل مسئلہ کیا تھا، یہ مجھے نہیں پتا اور نہ انکل نے مجھے بتایا۔ اسی لیے مجھے

یہی مناسب لگا کہ میں انہیں بگڑتی صورت حال سے آگاہ کر دوں کہ ”اگر مزید کچھ عرصہ، فارینہ کی حالت ایسی رہی تو یہ مکمل طور پر پاگل بھی ہو سکتی ہے۔ اس لیے بہتر یہی ہے کہ اس کے مسئلے سے آگاہی حاصل کر کے اسے حل کیا جائے۔“ بس اس دن کے بعد مجھے فارینہ کے بارے میں کچھ علم نہیں اور نہ ہی انکل نے دوبارہ کبھی اس کا ذکر کیا۔ میرے پوچھنے کے باوجود بھی۔ وہ یہی کہہ دیتے ہیں کہ ”وہ جہاں بھی ہے بہت خوش اور مطمئن ہے۔“

عانیہ نے یہ کہتے ہوئے بات ختم کی۔ شہرام گم صم سا بیٹھا رہا۔

”فارینہ اسی شہر میں تھی۔ وہ ذہنی مسئلے کا شکار رہی، اتنا عرصہ علاج کرواتی رہی اور مجھے خبر ہی نہیں ہو سکی اور میں دعویٰ کرتا رہا اس سے محبت کا۔“

شہرام کے لہجے میں پچھتاوا تھا اور وہ تیزی سے اپنی جگہ سے اٹھا۔

”چلو مجھے انکل مرتضیٰ سے ملنا ہے ابھی۔“ وہ زویا سے کہتا ہوا دروازے کی طرف بڑھا۔ زویا اس کے پیچھے پیچھے تھی۔ وہ جب مرتضیٰ ہاشم کے گھر پہنچے تو رات کے نو بج چکے تھے۔ وہ تھکے ہارے کہیں سے گھر لوٹے ہی تھے، جب ملازم نے زویا کے آنے کی اطلاع دی وہ بہت حیران ہوئے، مگر اسے فوراً اندر بلا لیا۔ زویا کے ساتھ آنے والی شخصیت کو دیکھ کر وہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑے ہوئے۔

”شہرام تم...“ ان کا لہجہ حیران کن نہیں تھا بلکہ ایسا تھا جیسے وہ کسی سے بھاگتے بھاگتے بالآخر اس کے سامنے آکھڑے ہوئے ہوں۔

”میں آپ سے یہ نہیں پوچھنے آیا کہ آپ نے اتنا عرصہ مجھ سے سچ کیوں چھپائے رکھا۔ میں صرف یہ پوچھنے آیا ہوں کہ فارینہ کہاں ہے؟“

شہرام نے ان کے سامنے کھڑے ہوئے عاجزی سے سوال کیا۔ وہ ایک نظر اسے دیکھ کر رہ گئے۔

”آؤ بیٹھو! میں بھی اکیلے یہ بوجھ اٹھاتا اٹھاتا تھک سا گیا ہوں۔“ مرتضیٰ ہاشم نے کہا اور صوفے کی پشت سے ٹیک لگاتے ہوئے گویا ہوئے۔

☆...☆...☆

آدم کے کیس کی سماعت چلتی رہی۔ فارینہ کو لمحہ بہ لمحہ سب رپورٹس مل رہی تھیں۔ آدم کے وکیل نے فارینہ کو بتایا کہ وہ اپنے کیس میں اس کا نام نہیں لینا چاہتا۔ وہ نہیں چاہتا کہ فارینہ سب کی نگاہوں کا مرکز بنے۔ فارینہ، آدم کے رویے پر بہت حیران تھی، آدم کے ساتھ وہ جتنا برا اور تحقیر آمیز رویہ رکھ چکی تھی، آدم اگر چاہتا، تو اس سے گن گن کر بدلے لے سکتا تھا۔ وہ جو ہر قدم پر، اس کی عزت نفس کو مجروح کرتی آئی تھی، اس کا مذاق اُڑاتی آئی تھی۔ آدم نے اس سے کسی

بات کا بدلہ نہیں لیا تھا۔ فارینہ دیکھتی رہی اور آدم نے اپنا سب کچھ دائو پر لگا دیا۔ پھر فارینہ نے سنا کہ وہ بہت جلد ملک چھوڑ کر جا رہا ہے۔ فارینہ اس سے ملنے گئی۔ پہلی بار اور پہلی بار ہی آدم نے اس کے آنے کا نوٹس نہیں لیا۔

”کیا تمہارا جانا ضروری ہے۔“ فارینہ نے پوچھا، تو آدم نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ جس کی آنکھوں میں آج اس کے لیے حقارت نہیں تھی۔ فارینہ پہلی بار اس کے اپارٹمنٹ آئی تھی۔ آدم نے خوش گوار حیرت سے اسے خوش آمدید کہا۔

”ضروری تو کچھ نہیں ہوتا فارینہ۔“ آدم کا لہجہ سادہ تھا۔

”اچھا پھر مت جاؤ۔“ فارینہ نے جلدی سے کہا۔

”رک کر کیا کروں گا۔“ آدم کا لہجہ اُداس تھا۔

”اس محبت کے لیے رک جاؤ، جو تمہیں مجھ سے ہے۔“ فارینہ نے ایک دم سے کہا، تو آدم کتنی ہی دیر خاموش بیٹھا رہ گیا۔

”فارینہ! کاش تم نے پہلے کبھی میری بات غور سے سن لی ہوتی۔ میں تب بھی تم سے کچھ زیادہ کی تمنا نہیں رکھتا تھا اور آج تو بالکل بھی نہیں۔“

فارینہ! تم نے کبھی کسی بچے کو چاند کے لیے ضد کرتے دیکھا ہے، بس میری ضد بھی اتنی سی تھی کہ وہ چاند کچھ دیر کے لیے ہی سہی، میری کھڑکی پر بھی روشن

رہے۔ بس، چاند کو پانے اور چھونے کی تمنا، مجھے فنا کے راستے سے گزر کر ملے گی اور ایک محبت کے لیے کون فنا کا سفر طے کرے۔ ”آدم نے کھوکھلی ہنسی ہنستے ہوئے کہا۔

”میں تیار ہوں، تمہارے لیے فنا ہونے کے لیے! تم ایک بار کہو تو سہی۔“ فارینہ کا انداز جنونی تھا۔ آدم نے نفی میں سر ہلایا۔

”فارینہ! ایک نقطہ تھا محبت جس پر ہمیں ایک ہونا تھا، اکٹھے ہونا تھا، مگر افسوس وہ نقطہ ایسے ہی گزر گیا ہے۔ اب بس دور دور تک خلا اور سناٹا ہے، ہو کا عالم ہے، واپس پلٹ جاؤ۔ کچھ نہیں میرے پاس۔ جاؤ یہاں سے۔“ آدم نے سختی سے کہا، تو فارینہ صدمے سے گنگ رہ گئی۔ اسے آدم سے اس رویے کی امید نہیں تھی۔ وہ روتی ہوئی پلٹ آئی مگر کسی پل چین نہ پاتے ہوئے پھر اس کے در پر پہنچی تو اس پر قیامت ٹوٹی۔ آدم وہ اپارٹمنٹ بچ کر جا چکا تھا۔ اس کا اس طرح اچانک چلے جانا سب کے لیے حیران کن تھا، مگر فارینہ جانتی تھی کہ وہ صرف اس سے بچنے کے لیے چلا گیا ہے، مگر وہ دونوں ہی نہیں جانتے تھے کہ فاصلے، محبت کے لیے اکسیر ہوتے ہیں۔

فارینہ نے کچھ عرصہ لندن میں اپنے بہن بھائیوں کے ساتھ بھی گزارا، مگر اسے کسی پل چین نہ ملا۔ وہ اسی طرح بے چین و بے کل رہی۔ آدم کے سچ سے وہ اچھی طرح واقف تھی۔ دونوں کے درمیان صدیوں کا فاصلہ اور دوری تھی۔ پھر بھی وہ اپنے دل کے آگے ہارتی جا رہی تھی۔ زندگی میں بہترین چاہنے اور مانگنے والی کا دل کہاں آکر اٹکا تھا۔ پہلے پہل وہ یہ سمجھتی رہی کہ وہ پچھتاوے کا شکار ہو کر اس کی طرف متوجہ ہوئی ہے، مگر گزرتے ہر لمحے نے اسے بتایا کہ آدم نے اپنی محبت سے اس کا دل جیت لیا ہے، مگر پھر اس سے آگے کیا؟

آدم سے محبت کے باوجود بھی وہ اس کی زندگی میں شامل نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ سراب تھا، بس سراب۔

وہ اپنی دلیلوں سے بہلتی تھی، مگر اسے بھول نہیں پاتی تھی۔ اسی ذہنی کشمکش میں وہ ذہنی تناؤ کا شکار ہو گئی اور پاکستان لوٹ آئی مگر بہت خاموشی سے۔ یہاں آکر اس کی حالت اور بگڑنے لگی۔ وہ دیوانی ہو گئی تھی۔ اپنے حال سے بے خبر اور ہر وقت گم صم سی رہنے والی فارینہ نے مرتضیٰ ہاشم کو پریشان کر دیا تھا۔ عانیہ سے علاج کروانے کے باوجود اس کی حالت سنبھلنے میں نہیں آرہی تھی۔ عانیہ کے وارن

کرنے پر ان کے ہاتھ پاؤں پھول گئے اور وہ ایک دن فارینہ کے سامنے بے بسی سے رو پڑے۔

”کیوں اپنی باپ کو ستا رہی ہو۔ جانتی ہو نا کہ میں تمہیں اس حالت میں نہیں دیکھ سکتا۔ مجھے بتاؤ تمہیں کیا چاہیے! میں ساری دنیا سے لڑ کر بھی تمہیں لا کر دوں گا۔ مگر خدا کا واسطہ ہے خود کو سنبھالو فارینہ! میں تمہیں کھونے کا حوصلہ کہاں سے لاؤں۔“

”اور میں اسے نہیں کھو سکتی! مجھے وہ لا دیں ڈیڈ۔ مجھے آدم چاہیے ڈیڈ۔ مجھے آدم چاہیے پلیز۔ اسے کہو کہ لوٹ آئے نہیں تو میں مر جاؤں گی۔“ فارینہ چلا چلا کر رونے لگی۔ مرتضیٰ ہاشم حیرت سے اسے دیکھتے رہ گئے۔

”مگر تم تو شہرام سے محبت۔“ ان کے منہ سے لفظ ٹوٹ کر نکلنے لگے۔

”نہیں کرتی میں کسی سے محبت! وہ نظر نہیں آتا، تو کچھ بھی نظر نہیں آتا ڈیڈ۔ کوئی بھی دل کو نہیں بھاتا۔ میں کتنی بھی کوشش کر لوں، مگر وہ نہیں بھولتا۔ مجھے بتائیں میں کیا کروں۔“ فارینہ نے بے بسی سے روتے ہوئے کہا۔ مرتضیٰ ہاشم نے اسے گلے لگا لیا۔

”مت رو میری بچی! میرا وعدہ ہے میں تمہیں، آدم سے ضرور ملواؤں گا۔ چاہے کچھ بھی ہو جائے۔“ وہ نہیں جانتے تھے کہ وہ اس سے کیا وعدہ کر رہے ہیں۔

”آپ سچ کہہ رہے ہیں نا! چاہے کچھ بھی ہو۔ آپ مجھے روکیں گے نہیں۔ اگر آپ اپنی زبان سے پھرے، تو میں خود کو ہی ختم کر لوں گی۔“ فارینہ کے کہنے پر وہ دل تھام کر رہ گئے۔

”ایسا مت کہو! تم مرنے کی بات کرتی ہو اور جان میری نکلنے لگتی ہے۔“ ان کے لہجے میں خوف تھا۔ فارینہ نے خاموشی سے باپ کے سینے پر سر رکھ دیا۔

”مجھے معاف کر دیں، مگر میں مجبور ہوں ڈیڈ۔“ دل ہی دل میں وہ ان سے مخاطب ہوئی تھی۔ پھر مرتضیٰ ہاشم نے آدم کی تلاش میں ہر ذریعہ استعمال کیا، مگر وہ اُس تک نہیں پہنچ سکے۔ اس دوران فارینہ بیمار ہو کے بستر سے لگ گئی اور دنوں میں سوکھ کر کاٹھا ہو گئی۔ ساری ساری رات دیوانوں کی طرح پھرتی اور خود سے باتیں کرتی رہتی تھی۔ کبھی خود ہی ہنس پڑتی اور کبھی رو پڑتی۔ کبھی مرتضیٰ ہاشم خوف زدہ ہو جاتے کہ عانیہ کی پیش گوئی حقیقت کا روپ دھارنے لگی ہے اور فارینہ مکمل پاگل ہو جائے گی۔ انہوں نے آدم کی تلاش تیز سے تیز کر دی۔ تب ہی انہیں کچھ عجیب و غریب اطلاع ملی کہ وہ جس کی تلاش میں امریکا کی خاک چھان

رہے تھے، وہ اسی ملک کے کسی چھوٹے سے شہر میں موجود تھا۔ باقی کی تفصیلات اور بھی زیادہ حیران کن تھیں۔ وہ شخص، دولت جس کے گھر کی باندی تھی، جس کی شخصیت اور دیدہ زیب لباس کے چرچے تھے، جو فیشن اور اسٹائل میں لوگوں کا آئیڈیل تھا۔ وہ یکسر بدلے ہوئے حلیے میں، خدمتِ خلق میں مصروف ہے۔

مرتضیٰ ہاشم کو یہ کہانی بہت پراسرار اور غیر معمولی لگی۔ انہوں نے فارینہ کو اس بارے میں بتایا، تو وہ خوشی سے کھل اُٹھی۔ جب مرتضیٰ ہاشم نے کہا کہ وہ اسے آدم سے ملوانے لے جائیں گے تو فارینہ نے انکار کر دیا۔

”آپ کے ملوانے سے وہ نہیں ملے گا۔ اس کے لیے مجھے خود جانا پڑے گا۔ جو گن بنا پڑے گا۔ وہ مجھ سے راضی ہو گا، تو مجھ سے ملے گا نا۔“ مرتضیٰ ہاشم اس کی بات کا مطلب نہیں سمجھے، مگر جب تین دن بعد فارینہ اچانک گھر سے غائب ہو گئی تو انہوں نے عقل کے گھوڑے دوڑائے اور فوراً اُس کی پیچھے وہاں پہنچے تھے، مگر فارینہ نے انہیں یہ کہہ کر واپس بھیج دیا کہ

”آپ اپنا وعدہ نبھائیں، نہیں تو مجھے مرنے کی اجازت دیں۔“ مرتضیٰ ہاشم کانپ کر رہ گئے۔ وہ کتنی آسانی سے باپ کو بلیک میل کر رہی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ وہ باپ کی سب سے بڑی کمزوری ہے۔

”ٹھیک ہے اگر تم ایسا ہی چاہتی ہو تو جو دل میں آئے کر لو مگر ایک بات یاد رکھنا فارینہ۔ تم بیٹی ہو کر اپنے باپ کو چھوڑ سکتی ہو، مگر میں ایک باپ ہو کر تمہیں اس طرح نہیں چھوڑ سکتا۔ خدا کی قسم مجھے تمہاری حالت کا اندازہ نہ ہوتا تو میں کبھی بھی تمہیں یہاں نہ چھوڑتا۔ تم نے ایک باپ کا محبت بھرا دل دکھا کر اچھا نہیں کیا۔“ مرتضیٰ کی آنکھوں میں نمی تھی۔ فارینہ باپ کے سینے سے لگ گئی۔

”مجھے معاف کر دیں! میں اچھی بیٹی نہیں ہوں نا۔“ فارینہ نے پوچھا تو مرتضیٰ ہاشم اس کی پیشانی چومتے ہوئے بولے۔

”جیسی بھی ہو! مجھے دنیا میں سب سے زیادہ عزیز ہو۔“ مرتضیٰ ہاشم وہاں سے پلٹ تو آئے مگر اس کی طرف سے غافل نہیں ہوئے تھے۔ ایک بار انہوں نے فارینہ سے کہا تھا ”باہر کی دنیا عورت کے لیے تب تک محفوظ ہے جب تک وہ کسی اپنے کی پناہ میں ہے۔“ اس بات کو تقریباً دو سال ہونے والے تھے۔ آج بھی وہ وہاں سے ملنے والی اچانک خبر کی وجہ سے گئے تھے اور جب گھر واپس لوٹے تو ایک اور نئی صورت حال ان کی منتظر تھی۔ شہرام اور زویا یہ سن کر کتنی ہی دیر خاموش رہے۔ پھر شہرام اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔

”کہاں جا رہے ہو؟“ زویا نے بے چینی سے پوچھا۔

”باقی کا سچ جاننے کے لیے! اگر وہ دونوں ایک دوسرے سے محبت کرتے تھے تو پھر مجھے دھوکا کیوں دیا۔ ایک نے دوست بن کر لوٹا اور ایک نے محبوب بن کر۔ مجھے بھی اپنے حصے کا حساب لینا ہے۔“ شہرام نے سنجیدگی سے کہا اور بیرونی دروازے سے باہر نکلا تو زویا نے پیچھے سے آواز دی۔

”ہم تمہارے لیے دعا کریں گے۔“ شہرام نے پلٹ کر حیرت سے اسے دیکھا جو دروازے میں فریم کی طرح استادہ تھی۔

”کیا تم میرے ساتھ نہیں چلو گی؟“ شہرام نے پوچھا، تو زویا نے نم آنکھوں سے نفی میں سر ہلا دیا۔

”ہمارا، تمہارا ساتھ بس یہاں تک ہی تھا شہرام۔ ہم جانتے ہیں کہ تم اپنی محبت کو منانے جا رہے ہو، ہم تمہارے راستے کا پتھر نہیں بننا چاہتے۔ تم ہمیں ایک سایہ دار شجر کی طرح یاد رکھو کہ جس کی چھانوں میں تم کچھ دیر کے لیے رکے تھے۔ ہمارے لیے یہ ہی بہت ہے۔“ زویا نے بہت ضبط سے کہا تھا۔ شہرام دل سے اس کی عظمت کا قائل ہوا تھا۔ اس نے، زویا کو سیلوٹ کیا، تو وہ بے ساختہ ہنس پڑی۔

شہرام چلا گیا اور زویا بے آواز رونے لگی۔ کبھی کبھی کسی کی محبت اس تک پہنچانے کے لیے، اپنی محبت کی قربانی دینا پڑتی ہے۔

☆...☆...☆

”یہاں روز روز کیوں چلا آتا ہے، تیرا یہاں کیا کام؟“ آج پھر اسے سر شام، اس کچی بستی میں دیکھ کر اس ملنگ نے پوچھا۔ آدم بچھلیکیئی دنوں سے روزانہ وہاں جا رہا تھا۔ ان لوگوں کو خاموشی سے بیٹھ کر دیکھتا رہتا۔ گزشتہ کچھ دنوں سے وہاں ایک بہت بڑا میلا لگا ہوا تھا۔ تب آدم نے پہلی بار ان لال کپڑوں میں ملبوس لوگوں کو گھنگھرو پہنے دھمال ڈالتے دیکھا تھا۔ آدم کا دل بھی بے اختیار ان کے ساتھ جھومنے کو کرنے لگا تھا، مگر وہ چپ بیٹھا رہا۔

”میرا کام تو کہیں بھی نہیں ہے۔ جہاں بھی جاتا ہوں، سب سے الگ ہی نظر آتا ہوں۔“ آدم نے بے زاری سے کہا۔ اس کی ساری زندگی پھر سے صفر پر آ کر رک سی گئی تھی۔

”تُو نے کبھی اپنا رنگ ہی نہیں تلاشتا۔ ہمیشہ دوسروں کے رنگوں میں رنگتا رہا ہے۔ اسی لیے آج بھی سب سے الگ ہی نظر آتا ہے۔“ ملنگ نے کہا، تو آدم خاموشی سے اسے دیکھ کر رہ گیا۔

”میرا رنگ کیا ہے؟“ آدم نے پوچھا۔

”وہ ہی جو تیرے من کا رنگ ہے۔ بھلا رنگ بھی کسی سے پوچھ کر اپنائے جاتے ہیں۔ اپنے اندر دیکھ کون سا رنگ تجھے نظر آتا ہے، وہی تیرا اصل رنگ ہے۔“ ملنگ نے ہاتھ میں پکڑے ڈنڈے سے زمین پر لکیر کھینچی تھی۔

”مجھے صرف ایک ہی چہرہ نظر آتا ہے اور کچھ بھی نہیں۔“ آدم نے بے بسی سے کہا۔

”وہ چہرہ ہی تو حائل ہے، تیرے اور اس رنگ کے درمیان یا تو چہرہ چھوڑ دے یا پھر رنگ۔ نہیں تو چہرے کو اپنے رنگ میں رنگ لے بہت آسان سی بات ہے۔“ ملنگ نے مسکرا کر کہا، تو آدم جھنجھلا کر رہ گیا۔

”تم مجھے الجھا رہے ہو۔“

”اچھا پھر یہاں کیوں آتے ہو؟“ ملنگ نے بے نیازی سے پوچھا۔

”اب نہیں آؤں گا۔“ آدم غصے سے کہتا ہوا۔ وہاں سے اُٹھ گیا۔ دو دن نہیں گیا اور تیسرے دن پھر پہنچ گیا۔

”یہاں کون سی چیز تجھے کھینچ کر لے آتی ہے۔ وہ چہرہ یا رنگ؟“ ملنگ نے پوچھا، تو آدم سوچ میں پڑ گیا۔

”وہ چہرہ!“ آدم نے پورے اعتماد سے جواب دیا۔ ملنگ نے اثبات میں سر ہلا دیا۔
- تین دن تک آدم یہ ہی جواب دیتا رہا، پھر تھک ہار کر چوتھے دن بولا۔
”مجھے اس رنگ کی کھوج یہاں تک لاتی ہے۔ میں جاننا چاہتا ہوں کہ میرے اندر کیا ہے؟“

”اپنے اندر جھانک کر دیکھ لو۔ جواب مل جائے گا۔“ ملنگ نے نرمی سے کہا۔
”اندر صرف خاموشی ہے، سناٹا ہے، ویرانی ہے اور بیابان ہے۔“ آدم کا لہجہ مایوس کن تھا۔

”دیکھتے رہو! جب تک جواب نہ ملے۔“ ملنگ نے کہا۔ ایک دن وہ اسی طرح بیٹھے باتیں کر رہے تھے، جب آدم نے ایک شان دار سی کالے رنگ کی بڑی سی گاڑی کو وہاں آتے دیکھا۔ کچھ دیر بعد ایک وجیہہ شخصیت کا مالک سوئڈ، بوئڈ شخص نکلا۔
ملنگ کے پاس آکر وہ بہت احترام سے جھکا اور ملنگ کے ہاتھ چومے۔ آدم خاموشی سے یہ منظر دیکھتا رہا۔ پھر کچھ دیر بعد وہ چلا گیا۔ ملنگ دوبارہ، آدم کے پاس آکر بیٹھ گیا۔ کچھ دیر کی خاموشی کے بعد آدم نے پوچھا۔

”یہ کون تھا؟ تمہارا کوئی مرید؟“

”نہیں! میرا بیٹا۔“ ملنگ نے بے ساختہ کہا۔ آدم حیرت سے اسے دیکھتا رہ گیا۔

”وہ تمہارا بیٹا ہے اور تم اس حال میں ہو۔“ آدم کے منہ سے نکلا تھا۔ ملنگ مسکرا نے لگا۔

”کس حال میں! اس کا اصل یہ ہی حال تھا، مگر اس نے جو رنگ چنا، وہ تم نے دیکھ لیا ہے۔“ ملنگ نے جواب دیا تو آدم حیران رہ گیا۔

”یعنی جب جب میں نے تمہیں دیکھا وہ...“ ملنگ نے اثبات میں سر ہلایا۔
”وہ میرے بیٹے کا مجھ سے پیار ہے۔ وہ جب بھی کوئی بڑا پروجیکٹ شروع کرتا ہے یا کسی بھی کام کی ابتدا کرتا ہے، تو مجھے زبردستی اپنے ساتھ لے جاتا ہے۔ تم جانتے ہو، بڑے سے بڑے لوگوں سے بھی وہ میرا تعارف فخریہ لہجے میں کرواتا ہے۔
جب پہلے دن تم مجھے اس پلازے کی پارکنگ میں ملے تھے، وہ پلازہ بھی میرے بیٹے کا ہے، جس نمائش میں تم مجھے ملے تھے، وہ نمائش بھی میرے بیٹے نے آرگنائز کروائی تھی اور جس دن تم مجھے پولیس اسٹیشن ملے تھے، اس دن ہماری برادری کے ایک بندے کو پولیس پکڑ کر لے گئی تھی اور میرے بیٹا میرا ایک فون کرنے پر وہاں پہنچ گیا تھا۔“ ملنگ نے تفصیل سے بتایا

”اونو... اور میں سمجھتا رہا کہ تم ایک فراڈ ہو۔ کیا تمہیں عجیب نہیں لگتا کہ کہاں تم اور کہاں تمہارا بیٹا۔“ آدم نے سوال کیا۔

”تم ایک سوال ہی کیوں گھما پھرا کر کرتے ہو۔ اسے جو رنگ اپنے اندر نظر آیا اس نے وہ چن لیا۔ فقیری، سب کے بس کی بات نہیں ہوتی۔ یہ صرف اس کی نظر اور رضا سے ملتی ہے۔“ ملنگ نے آسمان کی طرف انگلی اٹھا کر کہا۔ آدم نے بھی طنزیہ نظروں سے اوپر کی طرف دیکھا۔

”وہ جو کچھ بھی نہیں دیتا۔“

”ایک وہ ہی تو سب کچھ دیتا ہے۔“ ملنگ نے اتنے یقین سے کہا کہ آدم غصے سے پھٹ پڑا۔

”کیا دیتا ہے وہ؟ صرف لینا جانتا ہے وہ۔ دکھ دیتا ہے، تکلیف دیتا ہے اور بس۔“ آدم کہتے کہتے دکھ کی رو میں بہتا چلا گیا۔ سب کچھ کہہ ڈالا اس نے۔ جب وہ خاموش ہوا، تو ملنگ نے نرمی سے کہا۔

”اتنا کچھ تو تجھے بن مانگے دیا اُس نے۔ تُو نے کبھی مانگا خود سے بھی؟“

”وہ کیسے؟“ آدم حیران ہوا تھا۔ اسے امید تھی کہ سب کی طرح وہ بھی اسے ہی مظلوم اور دکھی سمجھے گا۔

”خود دیکھ لے۔ تُو کہاں پیدا ہوا اور کن ہاتھوں میں تُو نے پرورش پائی۔ تیرے ابا کے دل میں، اس نے تیرے لیے محبت ڈالی، نہیں تو خود سوچ، کوئی کسی دوسرے کے بچے سے بھی اتنی محبت کرتا ہے اور وہ بھی ایسا بچہ جسے ہمارے معاشرہ کبھی قبول ہی نہیں کرتا۔ تو عام لوگوں کی طرح زندگی سسک سسک کر بھی گزار سکتا تھا یا تیرے قبیلے کے لوگوں کی طرح ناچ کر یا بھیک مانگ کر بھی، مگر تجھے اس نے ان سب سے محفوظ رکھا چاہے جیسے بھی۔ نہ وہ لڑکی تیری زندگی میں پھانس بن کر آتی اور نہ تیرا باہر جا کر پڑھنے کا بہانہ بنتا۔ سوچ بھلا، اس غیر مذہب کی عورت کو صرف تجھ سے ہی کیوں ہمدردی ہوئی؟ جبکہ تجھ سے زیادہ مظلوم اور قابل رحم لوگ بھی اس کے آس پاس موجود تھے۔ اس لیے کہ یہ بھی اس ذات کا حکم تھا۔ پھر دیار غیر میں تجھے بہتر سے بہتر مواقع ملے۔ اگر تیری زندگی میں کوئی سخت پل آیا بھی تو، تُو محفوظ رہا۔ تجھے سنبھالنے والے بہت سے نہیں تو، ایک یا دو لوگ ضرور موجود رہتے تھے۔ زندگی میں کیا نہیں ہے تیرے پاس۔ کیا تُو نے کبھی اس پر شکر ادا کیا؟ نہیں نا۔ پھر شکوہ کرنے میں پہل کیوں کرتا ہے۔ جب تُو اس کی دی نعمتوں کا شکر ادا نہیں کر سکتا، تو غم بانٹنے کس منہ سے آجاتا ہے۔“ ملنگ کی باتوں نے اسے ایسا آئینہ دکھایا تھا کہ وہ کتنی ہی دیر کچھ بول ہی نہیں سکا اور وہ

خاموشی سے وہاں سے اُٹھ کر چلا گیا۔ پھر کئی دن نہیں آیا۔ جب آیا، تو پتا چلا کہ وہ سب لوگ، کسی بزرگ کے عرس پر قریبی آبادی میں گئے ہوئے تھے۔ آدم وہاں پہنچا، تو رنگ محفل عروج پر تھی۔ دھمال دیکھ کر اس کے رگ وپے میں ایک آگ سی جلنے لگی، مگر وہ ابھی ”ہوں اور نہ ہوں“ کے درمیان معلق تھا۔ اس کے قدموں نے رقص کے بے شمار رنگ دیکھے اور چھوڑے تھے، مگر یہ کچھ الگ تھا۔ اس میں جو کیفیت تھی، وہ اسے اپنے کسی رقص میں کبھی نظر نہیں آئی تھی۔

”ڈرتا کیوں ہے؟ آجا۔ اس کوچے میں سب رنگ ایک سے ہی ہیں۔ نہ تو تیری جینز، شرٹس کی کوئی اہمیت ہو اور نہ میرے چولے کی۔ جب عشق قدموں کو مست کرتا ہے، تو جسم نہیں، روح محو رقص ہوتی ہے اور روح کا لباس ایک ہی رنگ کا ہے۔ جب اس نقطے کو سمجھ لے گا، اپنے اندر کے رنگ کو بھی پہچان لے گا۔ پھر تیرا سفر دنوں میں نہیں لمحوں میں طے ہو گا۔“ ملنگ نے اس سے کہا، تو وہ سر جھٹک کر رہ گیا۔

”مجھ سے یہ نہیں ہو گا کبھی بھی۔“ آدم نے مایوسی سے ان کی طرف دیکھا اور واپس پلٹ گیا۔ پھر وہ کچھ عرصے کے لیے امریکا چلا گیا۔ وہاں جا کر بھی وہ فارینہ

کو بھول پایا اور نہ پہلے کی طرح اپنی روٹین کا عادی ہو سکا۔ وہ دوبارہ پلٹ آیا، مگر اب کی بار وہ کچھ سوچ کر ہی آیا تھا۔

”مجھے لگتا ہے کہ میرے اندر کی خاموشی میں کوئی آواز گونجتی ہے مگر کس کی؟ یہ میں نہیں جان سکا۔“ آدم کے چہرے اور لہجے میں صدیوں کی تنکان تھی۔

”جان جاؤ گے! ابھی وقت ہی کتنا ہوا ہے۔ یہاں تو صدیاں ایسے ہی گزر جاتی ہیں، مگر اندر سے کوئی آواز نہیں آتی۔“ ملنگ کے لفظوں میں ہمیشہ یقین بولتا تھا۔ اسی طرح آدم آتا اور جاتا رہا، مگر کوئی بھی فیصلہ کرنے سے قاصر رہا۔ جیسے اس کی کشمکش بڑھتی ہی جا رہی تھی۔

ایک دن آدم آیا، تو بہت ٹوٹا ہوا تھا۔ ”وہ کہتی ہے میں اس کی محبت کی خاطر رک جاؤں، مگر میں رک جاؤں بھی تو، اسے نہیں پا سکتا۔“ وہ کچی مٹی پر بیٹھا، گھٹنوں میں سر دیے رو رہا تھا۔

”تمہیں تو خوش ہونا چاہیے! بالآخر تمہاری محبت نے اسے جھکنے پر مجبور کر دیا ہے اور کیا چاہیے تمہیں۔“ ملنگ نے بے پروائی سے کہا۔

”میری محبت اس سے ہمیشہ بے غرض رہی ہے۔ صرف اس کی ایک مہربان نظر، ایک اپنائیت بھری مسکراہٹ کے لیے ترسا ہوں، مجھے ساری دنیا ٹھکرائے، ذلیل

کرے، مجھے فرق نہیں پڑتا، مگر مجھے ساری دنیا میں صرف ایک ”وہ“ ٹھکرائے،
مجھ سے نفرت کرے، مجھے حقیر سمجھے، مجھے فرق پڑتا ہے۔ اس کا مجھے دیکھنا، میری
خوش بختی ہے اور اس کا مجھ سے منہ پھیرنا، میری کم نصیبی۔

”سب کو معلوم ہے میں ہوں اُس کا

آئینہ ہو رہا ہے فسوں اُس کا

وہ مجھے دیکھتا رہے اور میں

دیکھنا، دیکھتا رہوں اُس کا

مجھ میں اک شخص مرنے والا ہے

کوئی بتلائے کیا کروں اُس کا

میرے سینے کا زخم دیکھو تم

دیکھنا ہے اگر جنوں اُس کا

میں کبھی بات کر سکوں اس کی

میں کبھی نام لے سکوں اُس کا...”

آدم کی آواز میں بہتے لفظوں نے ہر طرف ایک سوز پیدا کر دیا تھا۔

”اُس کے ساتھ سودا کر لے۔“ ملنگ نے سوچتے ہوئے کہا، تو آدم خالی خالی نگاہوں
سے اسے دیکھتا رہ گیا۔

”کس سے؟“ آدم نے نا سمجھی سے پوچھا، تو ملنگ نے اوپر کی طرف انگلی اٹھا کر
کہا۔

”اُس سے! جس کا سودا سب سے کھرا ہے! حساب، کتاب میں پکا، مگر اپنے بندوں
کے معاملے میں درگزر اور شفقت سے کام لینے والا، اس سے کر لے اپنی چاہت کا
سودا۔ اپنی چاہت اسے سونپ دے اور اس کی چاہت، اپنی چاہت بنا لے۔ بس اتنا
ساکام ہے۔“

”میں کچھ سمجھا نہیں؟“ آدم کی آنکھوں میں واضح الجھن تھی۔ ملنگ نے ہاتھ میں
پکڑے ڈنڈے کو زمین پر کھڑا کیا اور اس پر اپنی ٹھوڑی اٹکاتے ہوئے کہا۔

”تم اُسے ”یہاں“ دنیا میں دے دو اور ”وہاں“ آخرت میں لے لینا۔“ ملنگ کی
بات پر آدم کتنی ہی دیر اس کا چہرہ دیکھتا رہا۔

”یہ کیسے ممکن ہے؟“ اس کی آواز کھوئی کھوئی سی تھی۔

”اُسے راضی کر لو! جس نے یہ محبت تمہارے دل میں ڈالی ہے جس کا وعدہ، سچا وعدہ ہے، جو اپنے وعدے سے نہیں مکر تا۔“

”وہ کیسے راضی ہو گا؟“ اس کے لہجے میں تجسس تھا۔

”سب سے آسان اور محبوب راستہ جو اس کی مخلوق سے ہو کر گزرتا ہے۔ یہی وہ راستہ ہے جس پر، اُس کے پیارے، محبوب محمد ﷺ کے نقش پا ہیں، جس پر اس کی پیروکار چلتے آئیں ہیں اور چلتے رہیں گے۔ اسی راستے پر آنکھیں بند کر کے چلا جا۔ تیری نیا پار لگ جائے گی۔“ ملنگ کی بات سن کر آدم نے آنکھیں بند کر لیں۔

”میں دنیا کا طالب ہوں اور تم مجھے ترک دنیا کا سبق دے رہے ہو۔ میں محبت مانگتا ہوں اور تم مجھے روحانیت سکھا رہے ہو۔“ آدم کا لہجہ تلخ تھا۔ ملنگ ہنس پڑا۔

”یہی تو تم عقل کے دعوے داروں کی سب سے بڑی بھول ہے۔ اس ذات کو تمہارے سجدوں، عبادتوں، پرہیز گاری سے کچھ نہیں لینا دینا۔ اس ذات نے انسان کو زمین پر اپنا خلیفہ بنا کر بھیجا، ایک مقرر وقت کے لیے۔ یہ سب کچھ اُس نے اپنے محبوب ﷺ کے صدقے دیا ہے، اس لیے کہ اُس کے محبوب ﷺ کو اپنی امت سے محبت ہے اور اُسے، اپنے محبوب کی محبت سے محبت ہے۔ سارا کھیل ہی اس چاہ اور محبت کا ہے۔ ایک محبت دوسری محبت کے لیے دروازہ کھولتی ہے، محبت خیر ہے،

خیر بانٹتی ہے، خیر بنتی ہے، جیسے خدا بخش کی تجھ سے محبت، اس کے بال بچوں کے لیے، خیر کا باعث بنی۔ ویسے شاید تم کبھی بھی اس کی بیوی اور بچوں کے لیے کچھ نہ کرتے، مگر خدا بخش کی ان سے محبت اور رشتے نے تمہیں بھی ان سے باندھ کر رکھ دیا ہے۔ دنیا کی ہر محبت، دوسری محبت سے ایک ڈور کی طرح بندھی ہوتی ہے، کڑی در کڑی جڑی ہوتی ہے، اسی سے ملتے ملتے، جڑتے جڑتے اس نے اپنے مقام تک آنا ہوتا ہے جیسے ایک گہرے کنویں میں سے پانی نکالنے کے لیے رسی بھی اتنی ہی دراز چاہیے ہوتی ہے، تب جا کر ٹھنڈا، میٹھا پانی نصیب ہوتا ہے، تجھے بھی صرف وہ رسی، وہ ڈور بنانی ہے، جو تیری محبت کو تجھ تک لائے گی۔ ہاں یہ تیری قسمت کہ تجھے اس میں بہت زیادہ صبر اور برداشت سے کام لینا پڑے گا کہ آپ حیات آسانی سے نہیں ملتا۔“

اسی وقت ڈھول کی ہلکی ہلکی آواز فضا میں گونجنے لگی، کسی خوشی میں بستی کے لوگ جھومنے لگے تھے۔ ملنگوں کے پانوں میں بندھے گھنگھرو کی جھنکار اور ڈھول کی تھاپ بہت انوکھا ساز پیدا کر رہی تھی۔ آدم کے ساتھ بیٹھے ملنگ کی آنکھوں میں چمک ابھری اور وہ آدم کی طرف دیکھتے ہوئے مسکرایا، پھر اپنی جگہ سے اٹھا اور آہستہ آہستہ پانوں زمیں پر مارتا، آدم کے طرف دیکھ کر سر میں گنگنایا۔

”بڑا عشق، عشق توں کرنا اے
کدی عشق دا گنج کھول تے سعی
تینوں مٹی وچ نہ رول دیوے
دو پیار دے بول، بول تے سعی
ٹکھ گھٹ تے، درد ہزار ملن
کدی عشق نوں تکرڑی، تول تے سعی
تیری ہمدی اکھ وی پچھ جاوے
کدی اندروں سانوں، پھرول تو سعی
(میاں وارث شاہ)

ملنگ کے تیز ہوتے قدم مٹی اڑانے لگے۔ اڑتی دھول میں وہ عکس بنتا گیا اور جب
دھول بیٹھی تو، جہاں آدم بیٹھا ہوا تھا، وہ جگہ خالی تھی۔

☆...☆...☆

”آپ کی وصیت کے مطابق، آپ کی ساری پراپرٹی، سیونگ، بینک بیلنس، سب
کچھ، مختلف، ٹرسٹ اور اداروں میں تقسیم کر دیا گیا ہے۔ بس یہ فلیٹ رہ گیا ہے

، جو آپ کی ہدایت کے مطابق، آپ کے یہاں سے جاتے ہی، ایک ٹرسٹ کو
دے دیا جائے گا۔

اس نے سر ہلا کر سب سنا اور اسے وہاں سے جانے کا اشارہ کیا۔ کچھ دن پہلے وہ
اپنے سارے اسٹاف کو فارغ کر چکا تھا۔ آج اس کا سیکرٹری بھی اپنا آخری کام ختم
کر کے جا رہا تھا۔ پاکستان آنے کے بعد وہ مسلسل ایک سوچ کا شکار رہا تھا۔ چھ
مہینے لگے اسے یہ فیصلہ کرتے ہوئے۔ پھر اس نے تیزی سے عمل شروع کر دیا۔ وہ
جتنی بھی کوشش کرتا، جتنی بھی ہمت دکھاتا، گھوم پھر کر پہلے نقطے پر ہی پہنچ جاتا
تھا۔ دنیا کی ہر نعمت، ہر چیز اس کی اختیار میں تھی مگر یہ سب وہ تھا جو اس نے
ایک بہروپ دھار کر حاصل کیا تھا۔ آج کوئی بھی اس سچ کو جان لے، تو اسے حقیر
سمجھ کر، نفرت کی نگاہ ہی سے دیکھے یہی تو اصل مسئلہ ہے۔ آپ دنیا سے جھوٹ
بول سکتے ہیں، دنیا کو دھوکا دے سکتے ہیں، مگر نہ ہی خود سے جھوٹ بول سکتے ہیں
اور نہ خود کو دھوکا دے سکتے ہیں۔ وہ ہار تو بہت پہلے ہی چکا تھا، مگر اپنی ہار تسلیم
نہیں کر رہا تھا۔ اس نے ہمیشہ دنیا میں جسموں کا بازار لگتے اور بکتے دیکھا تھا، اس
لیے تو ان سب میں وہ کھوٹے سکے یا کوڑی کی طرح تھا۔ اسے اصل سودے کی

تلاش تھی۔ اصل رنگ کی۔ جو اسے بغیر کسی تضحیک اور نفرت کے ، خود میں ایسے سمیٹ لے جیسے وہ اسی کا حصہ ہو۔ اس نے اپنا بہت سا وقت ، مختلف ، اسکالرز کی محفلوں اور مساجد میں بیٹھ کر گزارا۔ سب کی باتیں سنتا ، سوال پر سوال کرتا ، اپنی تلاش کا سفر کرتا رہا۔ جب اس نے سنا کہ ”پیارے نبی ﷺ کے ایک صحابی بھی خواجہ سرا تھے مگر ان کا مقام اور عزت کسی بھی طرح دوسرے صحابہ سے کم نہیں تھی۔“ اس دن اسے لگا یہ ہی وہ اصل رنگ ہے جس کی تلاش میں وہ مدتوں بھٹکتا رہا تھا۔ اس نے جائز اور ناجائز ہر راستہ اپنایا تھا ، مگر اس کا حاصل پھر بھی کچھ نہیں تھا۔ اس نے سیرۃ النبی ﷺ کا مطالعہ شروع کیا۔ بہت سے اسلامی اسکالرز سے رابطہ کرنے کے ساتھ ساتھ ، نیٹ ، پر ان کے بیان سنتا رہتا۔ وہ عقل و دانش رکھتا تھا ، استدلال اور منطق سے کام لیتا تھا ، وہ جانچ رہا تھا ، تجربہ کر رہا تھا ، اپنے شعور کی لیباٹری میں ، سب پر کھا ، سب دیکھا ، سب سنا۔ پھر وہ ایک نتیجے پر پہنچا۔

”کوئی کتنا بھی اعلیٰ ہو ، کتنا بھی طاقتور ، ذہین ہو ، خوب صورت یا حسن کا شاہ کار ہو۔ سب کی ابتدا مٹی ہے اور سب کا اختتام بھی مٹی ہے۔ مٹی جو خام ہے اور مٹی ، مٹی میں ہی مل جاتی ہے جسم فنا ہو جاتے ہیں ، اگر کسی چیز کو دوام حاصل ہے تو وہ روح کو ہے۔ روح جو خالص ہے ، جو جسم میں ایک مقرر وقت کے لیے پھونکی گئی

ہے اور روح کو خالص رکھنا ہی اصل مقصدِ حیات ہے۔ جسم مرد ، عورت ، خواجہ سرا ہو سکتا ہے۔ وہ جسم کو بخشا ہوا ، اس رب کا دیا ہوا لباس یا فیصلہ ہے ، مگر روح کو اس لیبل کی ضرورت نہیں ہے اور اس کائنات کا سب سے بڑا سچ ، جو وہ جان گیا تھا کہ

”اللہ جسموں سے نہیں روح سے محبت کرتا ہے۔“

یعنی کوئی انسان جو اپنے عمل ، نیت اور سوچ میں جتنا بھی خالص ہو گا ، وہ اس کے اتنا ہی قریب ہو گا اور جسم سے لیا جانے والا ہر اچھا ، برا عمل ہی روح کو خالص یا آلودہ بناتا ہے۔ جسم کے بازار میں تو وہ بے مول ٹھہرا تھا۔ اسی لیے دنیا میں اپنی محبت سے محروم رہا ، مگر عالمِ ارواح میں وہ اپنے عمل اور نیت سے اپنی روح کو خالص اور پاک بنا سکتا تھا۔ ہو سکتا ہے کہ زمین پر نہ ہونے والا ملن ، اس جہاں میں روحوں کے خالص پن پر انحصار کرتا ہو اور اگر اپنی کوتاہی سے وہ اس میں بھی پیچھے رہ گیا تو...

آدم نے اپنے اندر کے اصل رنگ کو پہچان لیا اور پھر اسے فیصلہ کرنے میں دیر نہیں لگی۔ اس نے جائز اور ناجائز طریقے سے کمائی ، سب دولت بانٹ دی۔ وہاں

سے وائٹڈ اپ کرنے میں اسے تقریباً دس ماہ کا عرصہ لگا، پھر وہ بیمار ہو گیا اور کچھ عرصہ زیر علاج رہا۔ جب وہ ایک سال بعد پاکستان آیا، تو سیدھا اسی ملنگ کے ڈیرے پر گیا۔

”مجھے یقین تھا۔ تم ضرور آؤ گے۔“ ملنگ نے اسے دیکھتے ہی پہچان لیا۔
 ”ہاں! اس لیے کہ میں نے اپنے اندر کا رنگ پہچان لیا ہے۔“ آدم نے مطمئن انداز میں کہا۔

”اچھا کون سا رنگ ہے تیرا۔“ ملنگ نے دلچسپی سے پوچھا۔
 ”لال رنگ! محبت سے بنا ہوا، عشق کا لال رنگ۔“ آدم نے کہا، تو ملنگ اسے دیکھتا رہ گیا۔

”بہت مشکل رنگ ہے یہ تو فنا کر دے گا۔ اپنے رنگ میں ایسے ہی نہیں رنگتا یہ رنگ۔ کوئی اور دیکھ لے۔ ابھی تو ابتدا ہے۔“ ملنگ نے ہمدردی سے کہا۔
 ”آپ نے ایک بار کہا تھا کہ بھلا رنگ بھی کوئی خود سے چنتا ہے۔ یہ تو عطا کی بات ہے۔“ آدم نے نرمی سے کہا، تو ملنگ مسکرا دیا۔

”لہجے میں یہ تبدیلی کیسی؟ میں ”تُو“ سے ”آپ“ کیسے ہو گیا؟“ ملنگ کا انداز چلبلا سا تھا۔

”مرشد مان لیا ہے آپ کو۔ آپ نے کہا تھا، اُس ذات سے سودا کر لو۔ میں نے کر لیا۔“ آدم نے اطمینان سے جواب دیا۔
 ”میرا مرید بننا ہے، تو دھمال ڈالنی پڑے گی اور تجھے یہ کام نہیں آتا۔“ ملنگ نے اسے ٹالنا چاہا۔

”کوئی بات نہیں۔ آپ سیکھا دیں۔ میں سیکھ لوں گا۔ نکما ہی سہی مگر کام دل لگا کر کرتا ہوں۔“ آدم نے مودبانہ انداز میں کہا۔

”گھنگھرو بھی باندھنے پڑیں گے۔ بول منظور ہے۔“ ملنگ اسے آزما رہا تھا۔
 ”جو حکم!“ آدم نے سر جھکا کر کہا، تو ملنگ نے اپنے ساتھی کو اشارہ کیا۔ اس نے گھنگھرو کی ایک جوڑی اس کی طرف بڑھائی۔ جسے آدم نے فوراً ہی تھام کر پہن لیا۔
 ”چل آ میں سکھائوں تجھے، دھمال کیسے ڈالتے ہیں۔“ ملنگ اپنی جگہ سے اٹھا۔ آدم غور سے اسے دیکھنے لگا۔

”دلبر! رقص کر۔۔۔

رقص کر مرے دل کی سر زمین پہ

نگاہوں پہ اپنا بدن عکس کر

رقص کر۔۔۔

رقص کر مرے دل کی سر زمین پہ
نگاہوں پہ اپنا بدن عکس کر
رقص کر...

آدم اپنی جگہ سے اٹھا، جیسے وہ کسی ٹرانس کی حالت میں ہو اور اس کے قدم بھی
خود ہی آہستہ آہستہ اٹھنے لگے۔

”میرے سارے ارادوں کو گھٹکھرو بنا
میری ساری انانوں کو پازیب کر

فرشِ دل، جس کو

ہم جانتے تھے کبھی عرشِ دل!

اپنے پنجنوں سے روند

ایڑیوں سے دبا

دھول اتنی اڑا

مجھے تیرے سوا

کچھ دکھائی نہ دے، کچھ بھائی نہ دے

مجھے مصلوب کر، مجھے مجذوب کر

میری ”میں“ مار دے
مجھے بے نقص کر
دلبر! رقص کر...

عشق کے قدموں نے دھول اڑائی، تو اس سے ایک ہی چہرہ بنا، اس نے عشق کا
جام لبوں سے لگا کر دنیا کی طرف سے آنکھیں بند کر لیں تھیں مگر بند آنکھوں
میں بھی صرف ”تُو ہی تُو کا عالم“ رہا۔ یہی تو اس کے عشق کی معراج تھی۔ آدم نے
کچھ مہینے ملنگ کی مریدی میں گزارے۔ پھر اسے وہاں سے کوچ کرنے کا حکم مل گیا

-

”زندگی، پیری، مریدی، جوگ، سوگ میں گزارنے کے لیے نہیں بنی ہے۔ یہ
وہ سلسلہ ہے جسے آگے سے آگے چلنا ہوتا ہے، ورنہ اسے بھی کائی لگتے دیر نہیں
لگتی۔ اپنے وجود، اپنے جسم، کی زکوٰۃ دو، اسے انسانیت کے لیے خیر بنا کر اپنی روح
کی اگلی منزل آسان بناؤ کہ یہ صرف پڑاؤ کی جگہ ہے۔ اصل سفر تو مرنے کے بعد
شروع ہونا ہے۔“

ملنگ نے اسے سمجھایا۔ آدم نے رختِ سفر باندھا اور ان جانی منزلوں کا مسافر بن
گیا۔ وہ جہاں بھی جاتا، اسے مختلف حالات و واقعات کا سامنا کرنا پڑتا۔ کہیں اسے

مہربان لوگ ملتے، کہیں اسے لوگوں کے برے رویے دیکھنے پڑتے، کہیں وہ مشکوک ٹھہرتا۔ اس دوران وہ بہت سی جگہوں پر کچھ عرصہ رہتا، جو بھی کام ملتا، خوشی سے کرتا، مگر کسی سے مانگ کر نہیں کھاتا تھا یا وہ خیرات وغیرہ نہیں لیتا تھا۔ وہ غیرت مند تھا خود کما کر کھاتا، چاہے ایک وقت کی روٹی ملتی، اس نے رزقِ حلال کا مزہ اب چکھا تھا۔ وہ انسانیت کی مدد اور خدمت کرنے کے لیے ہمہ وقت تیار رہتا۔ جب وہ دیکھتا کہ اب وہاں اس کی ضرورت نہیں رہی تو خاموشی سے آگے بڑھ جاتا۔ وہ دنیا کی محبت سے، اس رب کے عشق کی طرف بڑھا تھا جو اپنی خوبیوں اور صفات میں یکتا تھا۔ اس کی فقیرانہ روش اور ولیوں والی صفات نے اسے ”سائیں“ کے نام سے مشہور کر دیا تھا۔ لوگ اسے دیکھتے اور وہ اپنے دل میں ”اسے“ دیکھتا تھا جس کا نشہ، جس کا عالم، اس میں آباد رہتا تھا۔

کبھی دیکھا ہے تُو نے، عشق میں وجدان کا عالم
بس تُو ہی تُو، تُو ہی تُو اور تُو ہی تُو کا عالم!

اس دور دراز علاقے میں بھی وہ ایک مسافر کی طرح ہی آیا تھا، مگر کچھ عرصے میں وہ لوگوں میں مشہور ہونے لگا۔ اس کا ارادہ بہت جلد یہاں سے آگے بڑھ جانے کا تھا، مگر رضیہ کے ساتھ ہونے والے حادثے نے اسے ایک نئی سوچ اور ذمہ داری

عطا کی۔ اس نے بے سہارا عورتوں اور بچوں کے لیے پرانے مزار کے ٹوٹے اور ویران حصے میں رہائش کا بندوبست کیا تھا۔ پہلے پہل اس نے یہ وقتی طور پر سوچا مگر کچھ ہی دنوں میں وہاں آنے والی خواتین کی تعداد میں اضافہ ہو گیا۔ وہ سب اس کی طرف مدد طلب نظروں سے دیکھتی تھیں۔ دنیا میں عزت کی چادر تلے رہنا چاہتی تھیں۔ انہیں سائیں پر اندھا اعتماد تھا کہ اس کے زیر سایہ وہ محفوظ ہیں۔ ان کی عزتیں معاشرے کے بھیڑیوں سے بچی ہوئی ہیں۔ سائیں اس یقین پر بہت پریشان ہوا، مگر وہ اس طرح انہیں چھوڑ کر نہیں جانا چاہتا تھا۔ ثریا بی بی کے مسئلے کی ذمہ داری بھی اس پر تھی۔ وہ ایک عورت کو دوبارہ سے، بے یار و مددگار نہیں چھوڑ سکتا تھا۔ انہی باتوں نے اس کے پیروں میں بیڑیاں ڈال دیں۔

وہ ابھی علی یار اور کچھ لوگوں کی مدد سے، ان مسئلوں سے نمٹ رہا تھا، جب بھیس بدل کر فارینہ اس مزار پر چلی آئی اور اس نے عورتوں والے حصے میں رہائش اختیار کر لی۔ اس نے سب کو اپنا نام موہنی بتایا۔ پہلے پہل سائیں کو پتا نہیں چلا مگر گھونٹ میں ہونے کے باوجود وہ اسے پہلی بار دیکھتے ہی پہچان گیا تھا اور سخت آگ بگولا ہوا، مگر وہ چکنا گھڑ ابن کر سنتی رہی اور اس نے اسے دھمکی دی کہ اگر وہ یہاں سے چلا جائے گا تو وہ بھی اس کے پیچھے پیچھے آتی رہے گی۔ چاہے

اس کے ساتھ کچھ بھی ہو۔ آدم جانتا تھا کہ وہ کتنی ضدی ہے مگر وہ یہ بھی جانتا تھا کہ اس کے لیے یہ جگہ بھی محفوظ نہیں ہے۔ اس نے فارینہ کو مسلسل نظر انداز کرنا شروع کر دیا، مگر اس نے علی یار کو، اس کے بارے میں بتا کر درخواست کی تھی کہ اس کی غیر موجودگی میں، اس کا خیال ضرور رکھے۔ علی یار سے اس نے وعدہ لیا تھا، مگر یہ بات دونوں کے درمیان راز تھی۔ علی یار کی توجہ اور فکر کا پیو نے غلط مطلب نکالا تھا۔ علی یار نے فارینہ کو ہمیشہ یہی کہا کہ وہ سب عورتوں کی نگرانی اسی طرح کرتا ہے مگر یہ بھی سچ تھا کہ وہ فارینہ کے لیے ہر وقت چوکس رہتا تھا۔ اس لیے کہ وہ سائیں کو اپنا مرشد مانتا اور سمجھتا تھا۔

اس کی بات وہ نہیں ٹال سکتا تھا۔ سائیں کے لیے دوسری بیڑی وہ بنی جب اسے حادثاتی طور پر پتا چلا کہ اس کے والدین کون ہیں؟ خدا بخش نے اسے ساری تفصیل تو بتائی ہوئی تھی مگر اسے یہ اندازہ نہیں تھا کہ وہ خود اس کے پاس، دعا کی درخواست لیے پہنچ جائیں گے، مگر جب اس نے خان زادہ شمشیر کے منہ سے ساری تفصیل سنی تو وہ ان سے ملنے خود کو روک نہیں پایا۔ نوربانو کے جذبات بھی اس سے الگ نہیں تھے۔ ان کا دل بھی خود بہ خود اس کی طرف کھینچتا تھا۔ پھر جب نوربانو نے اس سے وعدہ لیا، تو خود کو چاہتے ہوئے بھی روک نہیں پایا۔ وہ ایک

بار اس حویلی میں جانا چاہتا تھا، اس جگہ کو دیکھنا چاہتا تھا جہاں اس نے کچھ لمحوں کے لیے ہی سہی مگر سانسیں تولی تھیں، مگر فارینہ کا فکر اور خیال اسے بار بار روک رہا تھا۔ وہ بے وقوف لڑکی، ایک گھونگٹ کی آڑ میں دنیا سے اپنا حسن چھپا رہی تھی۔ جب کہ وہ جانتا تھا کہ یہ زیادہ عرصے تک ممکن نہیں رہے گا۔ فارینہ نے اپنے اندر کے پچھتاوے کی وجہ سے جو گن بننے کا فیصلہ کیا تھا، مگر اُسے اندازہ تھا کہ وہ بہت جلد اس راہ میں تھک جائے گی۔ ابھی اس کی ضد، اسے سہارا دے رہی تھی مگر آخر کب تک۔ اس سے پہلے کہ وہ ٹوٹ جائے، غلط سمت میں نکل جائے، وہ اسے واپس بھیجنا چاہتا تھا۔ علی یار کو اس کا خیال رکھنے کا کہہ کر وہ اپنے سفر پر گامزن ہوا تھا۔ جب پیو اسے چالاکی سے اپنے ساتھ لے گئی، تو ان دونوں کو جاتے ہوئے رضیہ نے دیکھ لیا تھا اور اس نے فوراً علی یار کو مطلع کیا جو اپنے کچھ ساتھیوں کے ساتھ ان کے پیچھے گیا تھا۔ جب فارینہ گاڑی سے نکل کر بھاگی، تو علی یار بھی وہاں پہنچ چکا تھا اور اسے دیکھتے ہی غنڈوں نے فائرنگ کر دی جس سے وہ شدید زخمی ہوا۔ اس دوران کچھ اور لوگ بھی وہاں پہنچ گئے اور انہوں نے دلاور اور اس کے ساتھیوں کو پکڑ کر بہت مارا اور پولیس کے حوالے کر دیا۔ پیو کو بھی حراست میں لے لیا گیا۔ علی یار ہسپتال میں داخل رہا، مگر وہ مطمئن تھا کہ سائیں کی غیر

موجودگی میں، اس نے اپنے وعدہ پورا کیا ہے اور مونیپر آج نہیں آنے دی، مگر وہ دوسرے لوگوں کی وہاں موجودگی پر بہت حیران ہوا تھا۔ تب اسے پتا چلا کہ وہ فارینہ کے سکیورٹی پر مامور وہ لوگ تھے، جو سادہ لباس میں مزار کے آس پاس گھومتے رہتے تھے اور تو اور جو شخص ہر مہینے مخصوص تاریخ پر راشن اور پیسے بھجواتا تھا، وہ بھی فارینہ کا باپ مرتضیٰ ہاشم تھا جس نے بہت جلد یہاں اسکول اور ایک فلاحی ادارے کے قیام کا وعدہ کیا تھا۔ فارینہ کے ساتھ ہونے والے حادثے کے بارے میں سن کر مرتضیٰ ہاشم بھاگے آئے۔ فارینہ کو بہت منایا، سمجھایا کہ اب اس کا یہ جنوں، اس کی یہ ضد ختم ہو جانی چاہیے۔ اس سے اسے کچھ نہیں ملنا مگر فارینہ ٹس سے مس نہیں ہوئی تو وہ بہت دکھی دل کے ساتھ جاتے جاتے اسے کہہ کر گئے۔

”تمہاری یہ ضد ایک دن میری جان لے لے گی فارینہ۔ اس دن تم خوش ہو جانا۔ باپ ہوں، اس لیے تم سے غافل نہیں رہ سکتا، مگر جس دن میں نہ رہا، تمہیں سمجھ آجائے گی کہ دنیا کیا چیز ہے اور اکیلی، جوان، خوبصورت عورت کا بغیر سائبان کے رہنا کتنا مشکل۔“

فارینہ باپ کی بات سن کر پہلی بار پشیمانی کا شکار ہوئی تھی۔ اسے افسوس ہوا تھا کہ اس نے اپنے باپ کا دل دکھایا ہے۔ وہ اسی کیفیت کا شکار رہی، اسی رات بخار میں جلتا، نڈھال، سا آدم لوٹ آیا تھا۔ وہ یہ سب سن کر خفا ہونے کے بجائے چپ ہو گیا۔ فارینہ اس کے غصے سے ڈر رہی تھی مگر وہ کچھ نہیں بولا۔ اگلے دن فارینہ سے ملنے کوئی آیا۔ شہرام کو وہ وہاں دیکھ کر حیران رہ گئی۔ شہرام نے اس سے سوال جواب کرنے کے بجائے، اسے یہ کہا کہ میں آج بھی تمہارا منتظر ہوں اور میں تمہیں یہاں سے لیے بغیر ہر گز نہیں جائوں گا۔ فارینہ اس کی بات پر تپ گئی، مگر شہرام مستقل مزاجی سے آتا رہا۔ شہرام، سائیں سے ملا تھا یا نہیں یہ وہ نہیں جانتی تھی۔ سائیں ان دنوں اپنے تنگ و تاریک، چھوٹے سے کمرے میں بند رہتا اور لوگوں سے بہت کم ملتا تھا۔ صرف علی یار تھا جو اس کے پاس جاتا اور اسے کھانا وغیرہ دے آتا۔ فارینہ ان دنوں بہت بے چین اور اُداس تھی۔ پھر اسے پتا چلا کہ سائیں کی طبیعت بہت خراب ہے۔ فارینہ کے ساتھ ساتھ سب کو تشویش لاحق ہو گئی۔ اگلے دن اتنے دنوں بعد، فارینہ نے سائیں کو اپنی مخصوص جگہ پر بیٹھے دیکھا تھا۔ سردی بڑھ رہی تھی۔ علی یار نے فارینہ سے کہا کہ سائیں کے لیے حقہ بنا دے۔

آج انہوں نے خود کافی عرصے بعد فرمائش کی ہے اور وہ بھی تمہارے ہاتھ کے حقے کی۔

فارینہ خوشی سے کھل اٹھی۔ اسے لگا کہ سائیں نے اس کی ضد کے آگے ہتھیار ڈال دیے ہیں۔

☆...☆...☆

”سائیں“ کبرزدہ شام میں سردی سے کانپتے، سائیں نے مزار کی پہلی روشنی میں اس کی طرف دیکھا۔ کالے لباس میں ملبوس وہ، سچ سچ کے قدم اٹھا کر اس کی طرف آتی، وہ رات کا پہلا پڑاؤ لگ رہی تھی۔ آج اس نے گھونگٹ نہیں لیا ہوا تھا۔ اس کے ہاتھ میں پکڑے حقے سے ہلکا ہلکا دھواں اٹھ رہا تھا۔ بخار سے جلتی آنکھیں گہری لال ہو کر دیکھ رہی تھیں۔ سائیں نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔

”سائیں...! تُو اپنی چلم سے

تھوڑی سی آگ دے، دے،

میں تیری اگر بتی ہوں...!

اور تیری درگاہ پر مجھے

ایک گھڑی جلنا ہے!

یہ تیری محبت تھی
جو اس پیکر میں ڈھلی
اب پیکر سلگے گا
تو ایک دھواں سا اٹھے گا
دھوئیں کا لرزاں بدن
آہستہ سے کہے گا
جو بھی ہوا بہتی ہے
درگاہ سے گزرتی ہے
تیری سانسوں کو چھوتی ہے
سائیں...! آج مجھے
اس ہوا میں ملنا ہے...!
سائیں...! تُو اپنی چلم سے
تھوڑی سی آگ دے، دے،
میں تیری اگر بتی ہوں
اور تیری درگاہ پر مجھے

ایک گھڑی جلنا ہے!
جب بتی سلگ جائے گی
ہلکی سی مہک آئے گی
اور پھر میری ہستی، راکھ ہو کر
تیرے قدم چھو جائے گی
اسے تیری درگاہ کی
مٹی میں ملنا ہے!...
سائیں! تو اپنی چلم سے
تھوڑی سے آگ دے، دے
میں تیری اگر بتی ہوں
اور تیری درگاہ پر مجھے
ایک گھڑی جلنا ہے... (امرتا پریتم)

سائیں کے پاس آکر اس نے بڑی ادا سے سراٹھایا اور اسی طرف دیکھا، تو ایک دھچکا
سا اسے لگا اور اس کے ہاتھ سے حقہ گر کر بکھر گیا۔ وہ یک ٹک اسے دیکھ رہی تھی
، جو دنوں میں ڈھانچہ بن گیا تھا۔ اتنی کمزوری اور پیلاہٹ تھی اس کے چہرے پر...

”ایک کام کہا تھا، وہ بھی ٹھیک سے نہیں کر سکی تم۔“ سائیں نے آنکھیں کھول
کر اسے دیکھا۔ کتنے عرصے بعد، فارینہ کو لگا جیسے ساری کائنات تھم گئی تھی۔ اس
نے پچھلے دو سالوں میں اس کی ایک نظر کے لیے کتنے جتن کیے تھے، مگر وہ نظر
آج اس کی طرف اٹھی تو وہ اسے دیکھ ہی نہیں سکی، اس کا سامنا کرتے ہوئے
اس کی ٹانگیں کانپنے لگیں تھیں۔ ”یہ وہ آدم نہیں ہے، میں جس سے واقف تھی۔“
”ایک عجیب سا احساس اس کے دل میں جاگا تھا، مگر خود کو سنبھالتی وہ آگے بڑھی۔
”اپنی حالت دیکھی ہے۔ کسی ڈاکٹر کو کیوں نہیں دکھاتے ت...م آپ۔“ تم کہتے
کہتے اس کی زبان لڑکھڑا گئی تھی۔ آدم کے لبوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ جب کہ
فارینہ اس کی خود پر جمی نظروں سے خائف ہو رہی تھی۔
”تم نے کبھی میری بات مانی ہے، جو میں تمہاری بات سنوں۔“ اس کا لہجہ روٹھے
دوست جیسا تھا۔ فارینہ اس کے انداز پر حیران ہو گئی۔
”مگر آپ کی حالت ٹھیک نہیں لگ رہی۔ مجھے فکر ہو رہی ہے۔“ فارینہ کی آنکھوں
میں اس کے لیے فکر اور محبت کے سب رنگ تھے۔

”واہ میرے مولا! وہ نظر بھی عطا کی اور وہ محبت بھی، سچ ہے تیرا وعدہ سچا ہے۔“
آدم نے آسمان کی طرف دیکھ کر دھیمی آواز میں خود کلامی کی جسے فارینہ نہیں سن سکی تھی۔

”کس سے بات کر رہے ہیں۔“ فارینہ نے حیرت سے پوچھا۔

”وہ جو، خاموشی کی زبان بھی سنتا ہے! سمجھتا ہے، جواب دیتا ہے۔“ آدم نے دوبارہ اس پر نظریں مرکوز کر دیں تھیں۔ فارینہ کو ایسا لگا جیسے ایک ٹھنڈی، میٹھی سی آگ اس کے جسم کو نہیں، روح کو اپنی لپیٹ میں لے رہی تھی۔ اس آگ کا رنگ، اس کی روح کے رنگ سے ہم آہنگ ہو گیا تھا۔ پچھلے دو سالوں میں آگہی کا جو لمحہ اسے نہیں ملا تھا، وہ آج کی اس بولتی شام میں اس کا مقدر بنا تھا اور یہ فیض بھی اس کی نظر کا تھا وہ ساکت رہ گئی۔ ”یہ کیا اسرار ہے؟“ اس کے اندر کھوج جاگی تھی۔

”جو تم اس وقت دیکھ اور محسوس کر رہی ہو، اسے پانا چاہتی ہو تو... تمہیں پلٹنا ہو گا!“ آدم نے نرمی سے کہا تو فارینہ حیرت سے اسے دیکھنے لگی۔ اس کی سوالیہ نگاہیں پوچھ رہی تھیں ”اندر کی بات، تم نے کیسے جانی۔“ آدم سمجھ کر مسکرائے لگا۔

”ریاضت! ہر چیز، ہر جذبہ ریاضت مانگتا ہے فارینہ، مگر درست سمت میں۔ اگر تم یہ سمجھتی ہو کہ اپنا گھر، اپنے پیاروں کو چھوڑ کر تم اپنے دل کی مراد پا لو گی تو ایسا نہیں ہوتا۔ جوگی یا جوگن بننے سے، مرتبے نہیں ملا کرتے، اس کے لیے ریاضت کرنی پڑتی ہے۔ اپنے فرائض ادا کرنے پڑتے ہیں، لوگوں کے حقوق ادا کرنے پڑتے ہیں۔ تب ہی محبت کے بلند مقام کو چھونا ممکن ہوتا ہے۔“ آدم نے کہا، تو فارینہ ایک دم سے نیچے بیٹھ گئی اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

”میں ایسا کیا کروں کہ سب مجھ سے راضی ہو جائیں۔ میں نے اپنے باپ کا دل بھی دکھایا ہے اور شہرام سے بھی جھوٹ بولا۔ میری وجہ سے وہ بھی اپنی زندگی میں آگے نہیں بڑھ سکا اور میں یہ سب کچھ کر کے بھی تمہیں نہیں خوش کر سکی۔ میں کیا کروں؟“

”فارینہ! تم غلط طریقے سے سب کچھ حاصل کر لینا چاہتی ہو۔ جب کہ محبت کے ساتھ غلط تو ہو سکتا ہے مگر محبت کسی کے ساتھ غلط نہیں کرتی۔

اپنی ذمہ داریوں کو پہچانو۔ اپنے فرائض ادا کرو۔ پھر محبت کی سوالی بننا۔ جاؤ فارینہ یہاں سے چلی جاؤ۔ تم جاؤ گی، تو میں بھی آگے بڑھ سکوں گا۔ تم نے مجھے روک

دیا ہے۔ ”آدم نے کھوئے ہوئے لہجے میں کہا، تو فارینہ نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

”مجھے پتا ہے، میرے یہاں سے جاتے ہی آپ ٹھکانہ بدل لیں گے۔ پھر میں آپ کو کیسے ڈھونڈوں گی؟“ اس کا انداز بچوں جیسا تھا۔

”اب کی بار میں تمہیں، تمہارے اندر کہیں ملوں گا فارینہ۔ مجھے ظاہر مت دیکھو، مجھے اپنے اندر کہیں رہنے دو۔ کسی ایک کونے میں، کسی ایک حصے میں۔ پھر تمہیں کہیں بھی جانے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ جن سے محبت کی جائے، انہیں بند آنکھوں سے دیکھتے ہیں۔ وہ آنکھ کی بینائی سے نہیں، دل کی بینائی سے نظر آتے ہیں۔ اس لیے تو میں تمہیں کھلی آنکھوں سے نہیں دیکھتا تھا، میری بند آنکھوں میں بھی تمہارا ہی عکس لہراتا تھا۔ میں نے اپنی محبت کو وقت اور لمحوں کی قید سے آزاد کر دیا ہے۔ میں تمہیں یہاں اسے سوئپ رہا ہوں، وہ مجھے تمہیں وہاں بخش دے گا۔ یہ اس کا وعدہ ہے۔ بس تھوڑا انتظار...“

آدم کی آنکھوں سے آنسو بہ رہے تھے۔ فارینہ اس کی محبت کے انداز پر گم صم بیٹھی کی بیٹھی رہ گئی۔ اسے آج اپنی خوش نصیبی پر رشک آرہا تھا کہ اسے چاہنا والا کتنا خالص اور ایمان دار ہے۔

”مگر سنا ہے کہ روزِ محشر کسی کو کسی کی خبر نہیں ہوگی، وہاں تو صرف حساب ہو گا نا۔“ فارینہ کے لہجے میں مایوسی تھی۔

”ٹھیک سنا ہے تم نے، مگر حساب کے بعد اگر کسی کو کسی کی خبر ہوئی تو میرے لیے تو، وہ تم ہوگی فارینہ۔“ آدم نے جذب کے عالم میں کہا، تو فارینہ گم صم سی ہو گئی۔

”جاؤ فارینہ! اس مزار کی سیڑھیوں کے پاس، ڈھلتی شام کے گہرے سایوں میں کوئی تمہارا منتظر کھڑا ہے۔ اس کی محبت کی ایسے ہی قدر کرنا، جیسے اپنی محبت کی قدر چاہتی ہو۔ محبت میں سب مجبور ہیں، بے بس ہیں، مگر خوش نصیب ہیں وہ لوگ جنہیں دنیا میں محبت ملتی ہے اور انمول ہیں وہ لوگ، جنہیں ان کی دنیائی محبت، اس رب کے عشق سے روشناس کرواتی ہے۔ میرے لیے وہ خوش نصیب محبت تم ہو جس نے مجھے رب سے جوڑا بھی اور عشق کا جام بھی عطا کیا۔ جاؤ یہاں سے۔ اپنی دنیا میں لوٹ جاؤ۔“

فارینہ اپنی جگہ سے اٹھی اور جاتے ہوئے بار بار پلٹ کر اسے دیکھتی رہی۔ وہ اس کی بات اب نہیں ٹال سکتی تھی کہ اب اسے، اس کے عشق کی خوشبو اپنے ارد گرد محسوس ہو رہی تھی۔ وہ اس حصار کو کسی قیمت پر نہیں توڑنا چاہتی تھی۔

سیڑھیاں اتر کر اس نے منتظر کھڑے شہرام کی طرف دیکھا اور بغیر کچھ کہے اس کی کار کی طرف قدم بڑھا دیے اور دروازہ کھول کر سیٹ پہ بیٹھتے ہوئے، اس نے پشت سے ٹیک لگا کر آنکھیں موند لیں۔ شہرام نے خوشی سے اسے دیکھا اور بھاگتا ہوا سیڑھیاں چڑھ کر آدم کے پاس پہنچا جو فارینہ کے نقش پا پر نظریں جمائے بیٹھا تھا۔

”وہ سچ میں واپس آگئی ہے آدم۔ تم نے ٹھیک کہا تھا۔ وہ ضدی اور جذباتی ہے۔“ شہرام نے اس کے پاس آکر محبت سے اس کا ہاتھ تھاما تھا۔ وہ جب سے یہاں آیا تھا، روز آدم سے مزار کے اس تنگ و تاریک کمرے میں مل رہا تھا۔ آدم نے اپنے وعدے کے مطابق اسے سب بتا دیا تھا جسے سن کر وہ شاکڈ رہ گیا تھا۔ فارینہ کی واپسی کا یقین بھی اسی نے دلایا تھا۔

”شہرام!“ آدم نے اسے غور سے دیکھتے ہوئے پکارا تھا۔

”اس مادی دنیا میں، اگر مجھے کوئی سب سے زیادہ عزیز ہے، تو وہ فارینہ ہے۔ میں وہ گمنام ذرہ تھا، جسے اس کی محبت نے روشنی دی۔ میرے بننے اور بکھرنے کے پیچھے صرف وہ تھی، مگر کچھ وقت کے لیے میرا سفر اور تھا، مجھے وہ اختیار کرنا ہی تھا۔ بس تم سے اتنی گزارش ہے، اس کا خیال رکھنا۔“ آدم کے لہجے میں منت تھی۔

شہرام اسے دیکھتا رہ گیا اور پھر اثبات میں سر ہلاتا، ہونٹ بھیج کر اسے گلے سے لگالیا۔ اس کی آنکھیں بھی نم تھیں۔ آدم نے اس کی پشت کو تھپتھپایا۔ شہرام اس سے الگ ہوا، اُداس، تھکے ہارے قدموں سے واپس جانے لگا۔ آدم نے ظاہر کی آنکھ بند کر لی اور اپنے من کی آنکھ سے ”تُو ہی تُو کا عالم“ دیکھنے لگا۔ اس کے لب گنگنائے تھے۔

”مے پریدم سوئے کوئے

من اگر مے داستم بال و پرے

(میں ہمیشہ اُس کے کوچے میں اُڑتا پھرتا اگر میں بال و پر رکھتا۔)

شہرام نے پلٹ کر اسے دیکھا۔ اس کے لہجے کی محرومی اور دکھ نے اسے رلا دیا۔ وہ محبت کا راہی تھا، محبت کرنے والوں کی تکلیف و اذیت کو بہت اچھی طرح محسوس کر سکتا تھا اور آدم تو...

شام کا اندھیرا بڑھ گیا تھا۔ جب وہ کالے رنگ کی چمچاتی کار مزار کے سامنے سے رک رک کر چلتی، اپنے سفر پر روانہ ہوئی تھی۔

کار کے دونوں نفوس اپنی اپنی جگہ، اپنے اپنے دکھ میں گھرے، ایک ہی دھاگے میں پروئے جارہے تھے اور ان کے لیے وہ دھاگا، وہ آدم کی یاد اور اس کا ذکر

تھا۔ وہاں سے واپس لوٹنے کے بعد فارینہ، نرم، گیلی مٹی کی طرح ہو گئی تھی جسے شہرام نے اپنی محبت کے سانچے میں نرمی سے ڈھال لیا۔ شہرام نے آدم سے کیے آخری وعدے کے مطابق، ڈریم انٹر ٹینمنٹ میں بننے والے اس کے حصے اور آمدنی سے ایک فلاحی ادارہ خواجہ سرائوں کے لیے بنایا۔ جہاں، ایسے بچوں اور لوگوں کو تعلیم دینے کے ساتھ ساتھ، ہنر بھی سکھایا جاتا تھا۔

آدم کے مقصد کو لے کر چلنے والے بہت سے لوگ، جگہ جگہ روشنی کے چراغ بن کر اُجالا پھیلا رہے تھے۔ آدم موجود نہ ہوتے ہوئے بھی، ان کے درمیان ہمیشہ موجود رہا تھا۔ اس نے ایک معمولی سا فرد ہو کر، کئی دلوں کے قلعے فتح کر لیے تھے۔

☆...☆...☆

کئی سال گزر گئے۔ خان زادہ شاذل آٹھ سال کا ہو چکا تھا۔ اپنے دادا خان زادہ شمشیر کی قبر پر پھول ڈالتے ہوئے وہ، اپنی دادی سے ایک سوال ضرور کرتا تھا۔
”دادو جان! دادا ابو کی قبر کے ساتھ یہ کس کی قبر ہے؟“

نور بانو اپنے سفید دوپٹے کے پلو سے سنگ مرمر کی بنی اس قبر کو صاف کرتی اور کہتی۔

”یہ اس کی قبر ہے جس نے وعدہ کیا تھا کہ بہت جلد لمبی نیند سونے کے لیے ہمارے پہلو میں آئے گا اور دیکھو وہ آگیا۔ میرا سائیں، میرا آدم۔“ آخر کے دو لفظ وہ منہ ہی منہ میں بڑبڑا کر رہ جاتی تھیں۔ آدم کے یہاں سے جانے کے ایک ماہ بعد (فارینہ کے جانے کے اگلے دن) ہی اس کے انتقال کی خبر آگئی تھی۔ علی یار نے آدم کی آخری وصیت کے بارے میں بتایا تھا کہ اس کے مرنے کے بعد اسے کی میت ان کے حوالے کر دی جائے۔ خان زادہ شمشیر روتے ہوئے گئے تھے۔ وہاں لوگوں کا ہجوم تھا، جو سائیں کی محبت میں رو رہا تھا۔ انہیں اس پر رشک ہوا۔ تب علی یار نے ہی بتایا کہ سائیں کو بلڈ کینسر تھا جس کا علم انہیں شروع سے تھا۔ (یہ وہ وقت تھا جب آدم سب کچھ چھوڑ کر پاکستان آ رہا تھا اور آنے سے پہلے بیمار ہو کر ہسپتال داخل رہا تھا۔ تبھی اس پر انکشاف ہوا کہ اس کے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔ اسی لیے تو وہ کم وقت میں زیادہ سے زیادہ نیکی کے کام سرانجام دینا چاہتا تھا۔)

خان زادہ شمشیر نے، اسے اپنے خاندانی قبرستان میں دفنایا تھا۔ لوگ اسے سائیں کی حیثیت سے تو جانتے ہی تھے۔ اس لیے انہیں اس بات پر حیرانی نہیں ہوئی۔ خان زادہ شمشیر نے اپنی قبر کے لیے جگہ بھی اس کے پاس چنی تھی اور نور بانو نے بھی

۔ یعنی سائیں کی قبر درمیان میں تھی اور اس کے دونوں طرف ایک ایک خالی قبریں بنائی گئیں تھیں۔ ایک سال بعد ہی خان زادہ شمشیر اس کے غم کو دل سے لگائے دنیا سے رخصت ہو گئے۔ نوربانو اپنی باری کا انتظار کرتے ہوئے بار بار اپنے حصے کی خالی قبر کو دیکھتی تھیں کیوں کہ ان کا ”پہلو“ تو آباد ہو چکا تھا، مگر وہ خود ہی وہاں موجود نہیں تھیں۔ ابھی ان کی ممتا کو اور انتظار کرنا تھا۔ اپنے رب کا حکم آنے تک۔ نوربانو نے محبت سے اس کے کتبے پر ہاتھ پھیرا جس پر سائیں کے وہ آخری لفظ لکھے ہوئے تھے، جو ان سے اس نے آخری بار کہے تھے:

”اور بے شک اللہ جسموں سے نہیں، روح سے محبت کرتا ہے!“

ختم شد

☆...☆...☆